قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

دسمبر 2016، قیمت ₹15

ماہنامہ

اردو دنیا

دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

ہم اپنے رفتگاں کو یاد رکھنا چاہتے ہیں

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچّوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

عجیب وغریب خبریں

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

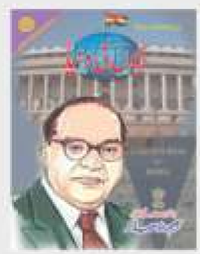

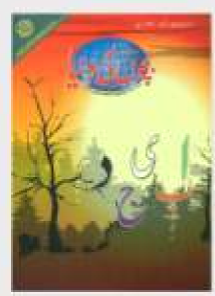

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

پس منظر

ہندو پاک میں اردو وفیات
نگاری کی روایت — شمس بدایونی 7

لمس رفتہ

اردو کا محبوب مدیر: محبوب الرحمٰن فاروقی — محمد شرافت علی 13

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

پروفیسر شکیل الرحمٰن — قدوس جاوید 17

سیدہ جعفر: نقاد، محقق و مدوّن — حبیب نثار 21

صاحب جی سلطان جی
کے عاشق: اسلم فرخی — ارمان نجمی 23

عندلیب گلشن خود آفریدہ: خلیق انجم — مظفر حسین سید 26

ادب آفاق کا روشن ستارہ: پروفیسر آفاق احمد — عارف عزیز 30

محمود حسن الٰہ آبادی — شاہ رشاد عثمانی 33

اردو اور انگریزی ادبیات
کا رمز شناس: اسلوب احمد انصاری — روبینہ رفیق 35

یہ زمیں تو ہوگئی نامہرباں—انور سدید — محمد آدم 37

اردو کا خاموش خدمت گزار: احسن سلیم — شاہنواز فیاض 40

ہمیں سوگئے داستاں...

جوگندر پال: ایسا کہاں سے لاؤں
کہ تجھ سا کہیں جسے — ظہیر انور 43

'یہ کس مقام پہ تنہائی سونپتے ہو مجھے'
کا خالق: اقبال مہدی — نگار عظیم 47

ایک عیسیٰ نفس خاتون
کہانی کار: ساوتری گوسوامی — ف س اعجاز 49

م ناگ: کتاب جو پھٹی رہ گئی — فرحان حنیف وارثی 52

خوشبوؤں میں بسا ذہن: کشمیری لال ذاکر — محمد مستمر 55

خوشبو جیسی شخصیت: شمیم نکہت — اظہر ابرار 58

پیغام آفاقی: تغیری کردار کا شخص اور فکشن نگار — جاوید احمد مغل 60

جن سے روشن تھا جہان شعر و سخن

ملک زادہ منظور احمد: ایک بیباک قلم کار — بی بی سریواستو رند 62

ندا فاضلی کا تخلیقی گاؤں — کوثر مظہری 64

فاطمہ وصیہ جائسی: کچھ یادیں کچھ باتیں — لئیق رضوی 68

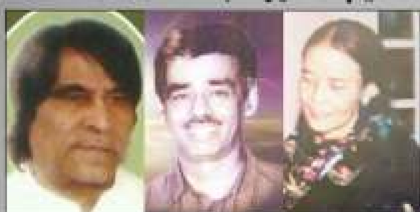

جلتے شبدوں کی آنچ اور
کومل لہجے کا شاعر: منظر شہاب — رضوانہ ارم 71

تمل ناڈو کی ممتاز ادبی شخصیت: سجاد بخاری — حیات افتخار 74

راشد آزر: حیدرآباد دکن کا ایک ممتاز شاعر — وصی اللہ بختیاری 76

ذات کے دریا میں تخیل
کا تاج محل: مقیم اثر بیاولی — حقانی القاسمی 78

مجھے زندگی تو کہاں
لے کے آئی: تاجدار تاج — اشتیاق سعید 80

زبیر رضوی: کچھ یادیں — عبدالحی 83

نگارخانہ شاعری کا ایک
گوہر آبدار: نظمی سکندرآبادی — منور حسن کمال 85

ادب ستاروں کی کہکشاں

کتابوں کا عاشق: اسلم محمود — ٹی آر رینا 87

میدان رپورتاژ نگاری کے
گوہر نایاب: ڈاکٹر ایس ایم گوہر — عبدالقادر شمس 90

عالمی اردو نامہ

اردو نامہ — ادارہ 92

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 94

ماہنامہ اُردو دُنیا
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:18، شمارہ:12، دسمبر 2016

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/15 روپے سالانہ-/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ،
نئی دہلی-110025

فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 7-22-110 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون: 040-24415194

ہماری بات

2016 علمی اور ادبی دنیا کے لیے قیامت خیز ثابت ہوا کہ اس سال بہت سی آفتاب و ماہتاب ہستیاں روپوش ہوگئیں۔ ان میں کچھ نابغہ ذہن نادرۂ روزگار شخصیات بھی تھیں جن سے ایک عہد، ایک آہنگ، ایک اسلوب، ایک طرز وابستہ تھا۔ یہ وہ گنج ہائے گراں مایہ تھے جن کی نظیریں اب نہیں مل سکتیں۔ کس کس کی بات کیجیے۔ انتظار حسین ہوں، یا ندا فاضلی، اسلوب احمد انصاری ہوں یا اسلم فرخی، عابد سہیل ہوں یا انور سدید، جوگندر پال ہوں یا شکیل الرحمن، سیدہ جعفر ہوں یا خلیق انجم، پیغام آفاقی ہوں یا شمیم نکہت، راشد آذر ہوں یا منظر شہاب — ان کی جبینوں پر عظمتوں کی عبارتیں لکھی ہوئی ہیں۔ ان سے ادب کائنات میں تحرک تھا، تابندگی تھی۔ ان کے افکار کی مشعل سے کائنات میں جو روشنی تھی وہ بجھتی جارہی ہے۔ ناصر کاظمی کا ایک شعر اس موقعے پر یاد آرہا ہے۔

زندگی جن کے تصور سے جلا پاتی تھی
ہائے کیا لوگ تھے جو دامِ اجل میں آئے

ان لوگوں کی موت سے علمی اور ادبی معاشرے کا بہت بڑا خسارہ ہوا ہے۔ یہ زندہ ہوتے تو افکار و تخیل کی کچھ اور رعنائیاں معاشرے کے حصے میں آتیں۔ مگر افسوس یہ ساری روشن قندیلیں بجھ گئیں۔ ان کی تحریریں زندہ رہیں گی اور افکار بھی تابندہ رہیں گے مگر مادیت میں محصور معاشرہ کیا ان بڑے ذہنوں کو یاد رکھ پائے گا؟ فراموش کاری کے اس عہد میں لوگ چند دنوں بعد ہی بڑی بڑی شخصیتوں کو بھول جاتے ہیں۔ یہ ہمارے معاشرے کا ایک اجتماعی المیہ ہے۔ ادیبوں اور فنکاروں کو فراموش کردینا تو ایک معمولی سی بات ہے۔ ایسے میں ان رفتگان کو یاد رکھنے کی ذمے داری معاشرے کے ان باشعور اور بالغ نظر افراد پر آن پڑتی ہے جو صارفی معاشرت میں بھی روحانی اقدار سے اپنا رشتہ جوڑے ہوئے ہیں۔ اسی احساس کے مدنظر 'اردو دنیا' میں رفتگاں کے نام ایک شمارہ مختص کیا گیا ہے تاکہ کم از کم 2016 کے مرحومین کے کچھ احوال و کوائف سے ہمارے قارئین روشناس ہوسکیں۔ کوشش تو یہ تھی کہ ان مرحومین کے شایان شان خراج عقیدت پیش کیا جائے مگر صفحات کی تنگ دامنی ہمیشہ آڑے آجاتی ہے اسی لیے اردو دنیا میں کوشش کی گئی ہے کہ ترجیحی طور پر ان شخصیات پر مضامین شامل کیے جائیں جن پر نہ تو زندگی میں اور نہ ہی موت کے بعد مقتدر رسائل میں مضامین چھپ پاتے ہیں۔ ہماری ادبی دنیا میں ایسی بہت سی شخصیتیں ہیں جن کی موت کی خبر بھی اخبارات کے صفحوں میں جگہ نہیں پاتی۔ 'اردو دنیا' میں ان مرحومین پر مضامین شامل کیے گئے ہیں جن سے ہمارے علم و ادب کا ایک بڑا حلقہ کم واقف ہے۔ کچھ اور شخصیتیں ایسی تھیں جن پر تعزیتی تحریروں کی شمولیت ضروری تھی مگر قلم کاروں کی مصروفیات کی وجہ سے تحریریں ہمیں موصول نہ ہوسکیں۔ کچھ اور شخصیتوں کا حال ہی میں انتقال ہوا جن پر مضامین شامل ہونے تھے مگر وقت کی کمی کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہوسکا۔ اسی لیے 'رفتگاں 2' میں ایسی تمام تعزیتی تحریریں شامل کی جائیں گی۔

المیہ یہ بھی ہے کہ نسبتاً کم معروف شخصیات پر لکھنے والوں کی تعداد اب گھٹتی جارہی ہے اور مشہور شخصیات پر مضامین کی کثرت ہے۔ انتظار حسین، عابد سہیل، ندا فاضلی پر لکھنے والے تو اکثر مل جاتے ہیں اور ہمارے پاس بھی اتنا مواد ہے کہ ان پر الگ سے گوشہ ترتیب دیا جاسکتا ہے۔ مگر وہ شخصیتیں جو کسی قریہ یا گمنام گاؤں سے تعلق رکھتی ہیں ان پر مضامین کی قلت رہتی ہے۔

'یادِ رفتگاں' کا یہ شمارہ مرحومین کو ایک طرح سے خراج عقیدت ہے اور اسے اسی نظر سے دیکھا بھی جانا چاہیے۔

ماضی میں بہت سے رسالوں نے وفیات نگاری کی جو روایت قائم کی تھی یہ اسی کو زندہ رکھنے کی ایک کوشش ہے۔ اردو وفیات نگاری کے حوالے سے شمس بدایونی کا ایک مضمون بھی شامل کیا جارہا ہے تاکہ قارئین یہ اندازہ لگاسکیں کہ وفیات نگاری کی کیا اہمیت اور معنویت ہے اور اردو کے مورخین و محققین کے لیے کتنی مفید ہے۔

اس شمارے میں یقینی طور پر بہت سی خامیاں رہ گئی ہوں گی۔ کچھ مرحومین کے نام بھی چھوٹ گئے ہوں گے، قارئین سے گذارش ہے کہ وہ لغزشوں اور خامیوں کی مکمل طور پر نشاندہی کریں کہ اس سے ہمیں رسالے کو بہتر بنانے میں بہت مدد ملتی ہے!

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

آپ کی بات

خطوط

'اردو دنیا' نومبر ماہ کا شمارہ خوب صورت سرورق سے مزین دستیاب ہوا ہے۔ اس میں مدیر صاحب کا شہرۂ آفاق شاعر، افسانہ نگار وصحافی جناب احمد ندیم قاسمی پر مبنی مضمون اعلیٰ پایے اور تنقیدی و تحقیقی نوعیت کا ہے۔ اس میں قاسمی صاحب کی انسان دوستی، جماعت بندی کی پُر زور مخالفت، افسانوی ادب و شاعری میں حقیقت نگاری اور ان کے ذاتی عقائد کو ظاہر کیا گیا ہے۔

احمد سہیل نے پنڈت میلہ رام وفا کی شاعری کا مختصر جائزہ اپنے مقالے میں بخوبی لیا ہے۔

جناب انیس امروہی نے پدم بھوشن جناب پرتھوی راج کپور کے یوم پیدائش پر بطور خراج عقیدت مضمون تحریر فرمایا ہے۔ یہ ملحوظ خاطر رہے کہ پرتھوی راج کپور نے امپیریل کمپنی میں ملازمت کرتے ہوئے ابھی پانچ خاموش فلمیں ہی بطور اداکار کی تھیں، کہ ہدایت کار اردیشر ایرانی نے اپنی اور ہندوستان کی اول بولتی فلم 'عالم آرا' میں انھیں ایک اہم رول دیا تھا۔ سنہ 1931 کی اس فلم میں اول مکالمہ انھوں نے ہی ادا کیا تھا۔

احترام اسلام صاحب نے خوش کلام شاعر انجام کی قومی یک جہتی واتحاد کے نظریے پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ اس شاعری کی شاعری کا اثر بعد کے شعرا پر بھی پڑتا رہا ہے۔

منشی نول کشور صاحب نے ایک اعلیٰ پایے کے صحافی کے بطور انگریزی حکومت کی سرپرستی کے باوصف جس طرح سے ہندوستانی قوم کی ذہنی بیداری واعلیٰ علمی، ادبی وتہذیبی رہنمائی کی تھی، وہ دنیا بھر کی صحافتی تاریخ میں بے مثال ہے۔

محمد زاہد الحق نے اپنے مقالے میں 'اردو زبان کی اہمیت ومعنویت' کے موضوع کے ساتھ کاملاً انصاف کیا ہے۔

یہ شمارہ کلی طور پر ایک کتاب کی مانند متعدد مشمولات سے مملو ہونے کے موجب ذاتی لائبریری کی زینت بنائے جانے کی خاصیت رکھتا ہے۔

کرشن بھاوک : کوٹھی نمبر A-201، گورو نانک نگر، پٹیالہ، پنجاب

'اردو دنیا' کا اکتوبر 2016 کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ یہ شمارہ حسن طباعت وکتابت کی خوبیوں کے ساتھ قاموسی

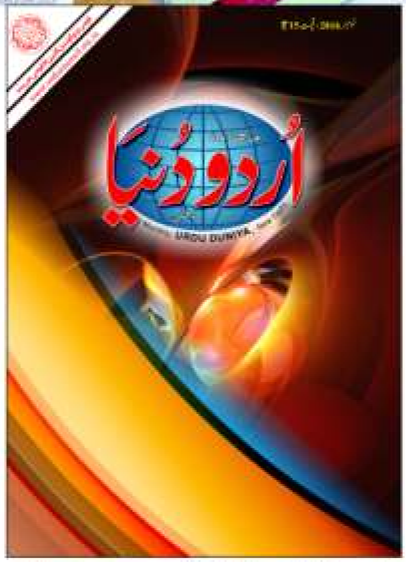

حیثیت کے محققانہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کے مطالعے سے ہمارے محدود علم میں اضافہ ہوا۔ اس شمارے کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں متعدد ایسے موضوعات پر مضامین شائع ہوئے ہیں جن سے پہلی بار متعارف ہوا۔ مندرجہ ذیل مضامین بہت زیادہ پسند آئے: بڑا ہے درد کا رشتہ: خلیل الرحمٰن اعظمی کی یاد میں، خراج عقیدت کے تحت: گاندھی جی کی اردو اور مسلم تہذیب سے ہم آہنگی، ادبی مباحث کے تحت: بچوں کے ادب میں نفسیات کی اہمیت، انشائیہ میں انکشافِ ذات، اردو ہائیکو: فن و تکنیک، اردو غزل اور میڈیکل سائنس، آغا حسن مرزا کی لغت نویسی، لسانیات کے تحت: ماہر لسانیات نوم چومسکی، سائنس کے تحت: تجاذب - ایک پراسرار قوت، تبصرہ و تعارف کے تحت: کلیات ملا رموزی، بیگم سلطان جہاں۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی: سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی

اکتوبر کے شمارے میں پروفیسر ارتضیٰ کریم کا اداریہ 'ہماری بات' سوچوں کو جھنجھوڑتا ہے۔ موصوف نے اپنے اداریے میں اس بات پر اپنی خوشی اور جذبہ تحسین کا اظہار کیا ہے کہ اس دور زوال اور قحط الرجال کے باوجود ہمارے ملک اور بیرونی ممالک سے اردو کے بہت سے رسالے، مجلّات اور اخبارات شائع ہوتے ہیں جسے اردو زبان کی زندگی سے جوڑ کر دیکھا جائے تو بلاشبہ اردو زبان کا ایک وسیع منظرنامہ سامنے آتا ہے جبکہ اردو کے پڑھنے لکھنے والے کم ہوتے جا رہے ہیں لیکن آئے دن ان نت نئے رسالوں، مجلّات اور اخبارات کی کھیپ اردو نسل کو کسی نہ کسی صورت سے متوجہ کیے ہوئے ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو تحریر کی صورت سے مبرا ہندی اور رومن Script میں (Social Media) کے ذریعے مثلاً (T.V.Channels)، (Face Book)، (WhatsApp) اور (You Tube) وغیرہم سے اردو زبان شعر و ادب کی ترسیلات میں سائنس اور طب کے مختلف موجدانہ مضامین لے کر پڑھنے اور سننے کو مل رہے ہیں۔ رہ گیا ادب عالیہ تو آج کے اس عام فہم عوام تک اس کی دسترس نفی کے برابر ہے۔ اس تشویش ناک حقیقت اور منحرف نکتۂ نظر کے باوجود اردو رسائل مختلف صورتوں میں اپنا رول ادا کر رہے ہیں اور بے شک ماہ نامہ 'اردو دنیا' بھی انھیں رسائل میں سے ایک ہے جس نے فروغ اردو زبان کو اپنا منشور بنایا ہے جس میں ادبی مباحث کے علاوہ سائنس، طب اور (Electronic) موضوعات کی شمولیت بھی کارگر ثابت ہو رہی ہے لیکن یہ بھی ایک درپیش مسئلہ ہے کہ ان مطلوبہ موضوعات کے لیے مضامین نہیں مل پاتے۔ میرا تجزیہ کہتا ہے کہ اردو زبان انھیں دگرگوں مسائل سے گزرتے ہوئے اپنا ایک الگ روپ رنگ قائم رکھے ہوئے ہے اور یہ برحق نظریہ ہے کہ اردو زبان کو زندہ رکھنے کے لیے سلیس سے سلیس اور عام فہم روش کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے کیونکہ اس کے ارتقا کا راز اسی میں پوشیدہ ہے۔

ڈرامہ 'انارکلی پر مبنی فلمیں' میں اشفاق احمد عمر نے بے شک اپنی عمر کا ایک زریں حصہ 'انارکلی' کے مواد کی تحقیقات اور تلاش و جستجو میں لگایا ہے۔ موصوف کی کاوشوں کی داد نہ دینا کفر ہے۔ اس مضمون کے مطالعے کے بعد یہ ماننا پڑے گا کہ امتیاز علی تاج کا یہ ڈرامہ ڈراموں کی تاریخ میں ایک شہ کار ڈرامے کی حیثیت رکھتا ہے۔ امتیاز احمد علیمی کا نظیر اکبرآبادی سے متعلق مضمون پڑھ کر نظیر کا ایک شعر یاد آ گیا:

جام ہے شیشہ ہے خم ہے تف کوئی ساقی نہیں
جی میں آتا ہے لگا دوں آگ میخانے کو میں

تغزل سے بھرپور اس شعر کو پڑھ کر گمان ہوتا ہے کہ شاید یہ شعر میر و غالب، سودا یا درد کا ہوگا لیکن حیرت انگیز بات ہے کہ یہ اس شاعر کا شعر ہے جسے نقاد اور مبصرین نے صرف عوامی شاعر تک ہی محدود گردانا۔

کشمیری لال ذاکر پر نند کشور وکرم، خلیل الرحمٰن اعظمی پر ابوالکلام قاسمی اور اردو کی ابتدائی تعلیم پر بدر محمدی کے مضامین بھی 'اردو دنیا' کے سر کو تاجور بنائے ہیں۔

علیم صبا نویدی: فلیٹ نمبر 16، دوسری منزل چنئی

اردو دنیا کا تازہ شمارہ (اکتوبر 2016) مختلف النوع مضامین کے ساتھ قابل مطالعہ ہے۔ اس میں محمد اسد اللہ کا مضمون 'انشائیہ انکشاف ذات اور منفرد نکتۂ نظر' صنف انشائیہ کے متعلق پر مغز مواد فراہم کرتا ہے۔ اردو ادب میں طنز و مزاح اور انشائیہ کو باہم خلط ملط کرنے کی روش عام ہے لیکن گاہے بگاہے اس پر لکھے جانے والے مضامین کے سبب انشائیہ کا تصور واضح ہوتا جارہا ہے۔ اب قارئین بخوبی جان چکے ہیں کہ انشائیہ ایسی تحریر نہیں ہوتی جس میں طنز و مزاح کی طرح کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوتا اور نہ ہی انشائیہ مقصدی صنف ادب ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انشائیہ کو ایسی صنف ادب قرار دیا جاسکتا ہے جس میں انکشاف ذات کے پہلو کو اس قدر نمایاں طور پر پیش کیا جائے جیسے اسد اللہ صاحب نے مشکور حسین یاد، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر سلیم احمد اور پی بی مارٹن کی مثالوں کے ذریعے واضح کیا اور اسے انشائیہ کا ایک اہم وصف قرار دیا۔ کیا یہ واقعی اتنا اہم مسئلہ ہے؟ اگر اس صنف سے قطع نظر کرکے غزل، افسانہ، خاکہ، سفرنامہ، ناول ایسی اصناف ہیں جن میں مصنف انکشاف ذات کے حوالے سے اپنی شخصیت کو پیش کردیتا ہے۔ لیکن اگر اس سلسلے میں کسی نکتے پر اختلاف کیا جاسکتا ہے تو وہ یہ کہ مغربی انشائیہ نگاروں نے اپنی تخلیقات میں اس عنصر کو اس قدر اہمیت کا حامل قرار دیا کہ وہ تحریریں Personal essay کے زمرے میں شامل ہوگئیں۔ اس لیے میری رائے میں انشائیہ نگار کو اس بات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ انکشاف ذات کا عنصر اتنا ہی ہونا چاہیے کہ قارئین کچھ حد تک اپنی ذات کے حوالے سے ان نقوش سے مماثلت پیدا کرسکیں۔

'ہماری بات' میں ارتضیٰ کریم صاحب کی بات پسند آئی کہ "اردو زبان کے فروغ کے لیے رسائل بہترین وسائل ثابت ہورہے ہیں اس لیے اردو رسائل کی خدمات کا اعتراف کیا جانا چاہیے۔"

دیگر مشمولات میں اعجاز عبید کا انٹرویو پڑھ کر دلی مسرت ہوئی جو انھوں نے اردو کو ٹیکنالوجی سے جوڑنے میں گراں خدمات انجام دیں اور اپنی مختلف ویب سائٹس کے ذریعے اس نسل تک اردو زبان کو پہنچایا جس نے کمپیوٹر کی دنیا میں آنکھ کھولی۔ ساتھ ہی ابوالکلام قاسمی کا مضمون بھی پسند آیا جس سے خلیل الرحمٰن صاحب کی یاد تازہ ہوگئی۔ 'یاد رفتگاں' میں نند کشور وکرم اور شعیب رضا فاطمی نے کشمیری لال ذاکر اور پیغام آفاقی کی شخصیت اور ان کی تخلیقات کو یاد کرکے صحیح معنوں میں انھیں حقیقی خراج عقیدت پیش کیا۔ فیروز بخت کے مضمون نے باباے قوم کی اردو دوستی اور مسلم تہذیب و ثقافت سے ایک اٹوٹ رشتے کو ظاہر کیا۔

ڈاکٹر اظہر ابرار: ایس کے پوروال ڈگری کالج، کامٹی (ناگپور)

ماہ اکتوبر 2016 کا 'اردو دنیا' زیر مطالعہ ہے۔ اداریہ میں آپ نے بجا فرمایا کہ اردو اخبارات و رسائل اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ میں آپ کی اس بات سے بھی اتفاق کرتا ہوں کہ نوجوان قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ آگے چل کر یہی قلم کار زبان و ادب کی اور بہتر طریقے سے خدمت کرسکیں۔ اردو دنیا کے تمام مستقل کالم بھی پہلے کی طرح اہم اور معلوماتی ہیں۔ رسالے کے مشمولات میں جو تنوع ہے وہ واقعی قابل تعریف ہے۔

رضوان علی خان: جنرل سکریٹری، بزم اردو سیتاپور، یوپی

اردو دنیا اکتوبر 2016 کے سرورق پر خوب صورتی سے لکھا ہوا ہے 'اکتوبر کے آفتاب' نیز اس سے متعلق مختلف خوب صورت تصاویر کے ساتھ شمارہ نظر نواز ہوا۔ آج اردو کی سب سے بڑی ضرورت سرکاری سرپرستی کی ہے۔ اگر سرکاری اسکولوں میں پرائمری سطح سے باقاعدہ اردو زبان کی تعلیم کا بندوبست ہوجائے تو اردو کی خاطر خواہ ترقی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ جیسا کہ اعجاز عبید نے فرمایا کہ جب تک دوسرے میدانوں میں اردو کا بول بالا نہیں ہوگا اردو ترقی نہیں کرسکے گی درست ہے۔ بدر محمدی کا مضمون 'اردو کی ابتدائی تعلیم' بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ادبی مباحث کے تحت شامل تمام مضامین بہت خوب صورت ہیں۔ ای آر محمد عادل کا مضمون 'اردو غزل اور میڈیکل سائنس' بہت ہی دلچسپ ہے۔ شافع قدوائی صاحب کا مضمون 'نیا ترسیلی بیانیہ اور اردو صحافت' بڑی ہی عرق ریزی سے قلم بند کیا گیا ہے۔

الحاج شفیق احمد: مدرسہ انوارالعلوم رام نگر، بارہ بنکی، یوپی

ادب فی الاصل اپنے میں نقص اور دوسرے کو باکمال سمجھنے کا نام ہے۔ کیونکہ یہ سونے سے اچھا ہے۔ اچھا ادب اور اچھی شاعری دل و دماغ کو تقویت بخشتی ہے۔ آج کے دور میں ادب کو تقویت دینے والے رسالوں کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ اچھا ادب پڑھنے کو دل ترستا ہے۔ آج کے اس پرآشوب دور میں اردو دنیا تمام رسالوں میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ ادبی، سائنسی، سماجی، ثقافتی اور تعلیمی موضوعات پر، صوری اور معنوی اعتبار سے طباعت، کتابت، تزئین، ترتیب اور پیش کش میں بین الاقوامی معیار کا حامل ہے۔ آپ نے اداریہ، خطوط، انٹرویو، شخصیت، خراج عقیدت، ادبی مباحث، ادب، انشا، صحافت، لسانیات، سائنس، فلم کے ساتھ خصوصی تبصرہ— کتابوں کی دنیا، خبرنامے یعنی آپ نے اس کو ادب کا گلدستہ بنا دیا۔ اکتوبر 2016 کا شمارہ ہر حیثیت سے ایک مکمل رسالہ ہے۔

ڈاکٹر م ق سلیم: نائب صدر انجمن ترقی اردو عظیم تر، حیدرآباد

'اردو دنیا' اکتوبر کا ماہنامہ پڑھا۔ اس میں ایک مضمون محترم فیروز بخت احمد کا بعنوان 'گاندھی جی کی اردو اور مسلم تہذیب سے ہم آہنگی' شامل ہے۔ اس کے ابتدائی پیراگراف میں "گاندھی جی کو فارسی، عربی اشعار و کہاوتوں نیز... اردو کلچر یا اسلامی اقدار سے قربت مولانا آزاد سے قربت کا نتیجہ تھی۔" یہ صحیح نہیں ہے بلکہ گاندھی جی کی زبان سنیے: Collected works of Mahatma Gandhi Edition 1985, Vol 19, Page 184

"میں اردو ادب کے مذہبی پہلو سے دلچسپی رکھتا ہوں جیسے ہی مجھے اردو ادب کے مذہبی پہلو کی کتابیں میسر ہوئیں میں نے اپنا دھیان ان پر مرکوز کیا۔ قسمت نے میرا ساتھ دیا۔ مولانا حسرت موہانی نے جناب منصر علی کو Leaves of the lives of the compain ofn the prophet کے ساتھ بھیجا جیسے ہی انھوں نے مجھ کو پڑھائی انھوں نے کئی جلدیں مجھے پڑھنے کو دیں۔ میں نے ان کو محنت سے پڑھا۔ اس کے طرز اور اسلوب میں اتنی کشش تھی جس سے پیغمبر کے ساتھیوں کے کارناموں سے بے حد دلچسپی ہوئی۔"

ڈاکٹر نفیس احمد صدیقی: ایڈوکیٹ سپریم کورٹ، نئی دہلی

ہندوپاک میں اردو وفیات نگاری کی روایت

شمس بدایونی

مسلمانوں نے جن علوم وفنون کے ظہور وشیوع میں لافانی خدمات انجام دی ہیں، ان میں سے ایک 'فنِ اسماء الرجال' بھی ہے، جو علمِ تاریخ وسوانح کا ایک شعبہ ہے اور اسی کی ایک شاخ 'وفیات نگاری' ہے۔

وفیات نگاری پر کتب ورسائل مرتب کرنے کی روایت عربوں نے قائم کی۔ اس سلسلے کی پہلی دستیاب مکمل کتاب ابو القاسم عبد اللہ بن محمد بن عبد العزیز البغوی (213-317ھ/ 828-929) کی 'وفاۃ الشیوخ' ہے، جسے ایک ہندوستانی عالم محمد عزیر شمس (مدینہ منورہ) نے مرتب کیا تھا اور پروفیسر مختار الدین احمد (ف 2010) نے شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے عربی مجلّے 'مجلۃ المجمع العلمی الھندی' میں 1982 میں شائع کیا۔ وفیات پر عربی کی اس پہلی مکمل تالیف کی ترتیب واشاعت کا فخر ہندوستان کو حاصل ہوا۔ وفاۃ الشیوخ کے بعد تاریخ ہائے وفات پر رسائل مرتب کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر یہ روایت ابن خلکان (1282) تک آپہنچی اور اسی نے پہلی بار 'وفیات' کا لفظ بہ طور اصطلاح، عربی میں استعمال

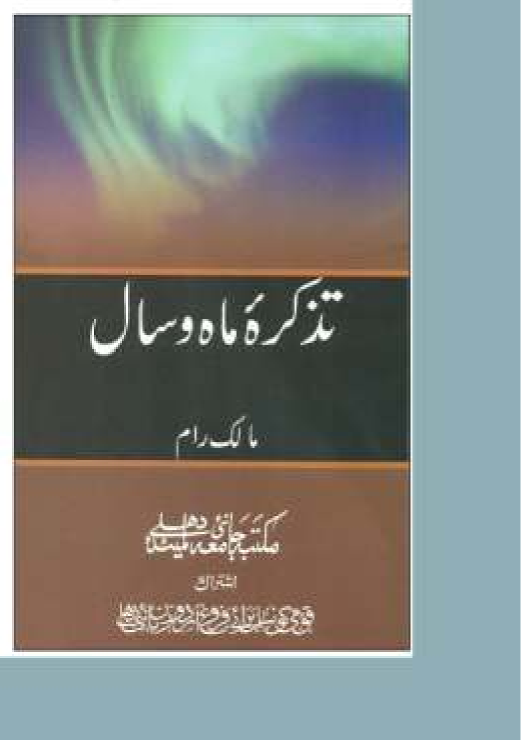

کیا، اور اپنی کتاب کا نام 'وفیات الاعیان' (660ھ/ 1262) رکھا۔ (وفیات کا صحیح تلفظ وَفَیات [وَ فَ ی ا ت] ہے) عام طور پر اس کتاب کا سالِ تالیف 654ھ/ 1256 لکھا جاتا رہا ہے، جو محلِ نظر ہے۔ وفیات نگاری پر عربی کی یہ اہم ترین اور مشہور ترین کتاب بیروت سے آٹھ جلدوں میں شائع ہوچکی ہے۔ وفیات الاعیان کے درجن بھر سے زائد عربی میں ذُیُول (بروزن قیود، یعنی آگے کے زمانے تک کا تکملہ) لکھے گئے اور ترجمے وخلاصے شائع ہوئے۔ [اردو میں عبدالغفور خاں رامپوری کا 'مشاہیرالاسلام' کے نام سے پہلی جلد کا ترجمہ مفید عام اسٹیم پریس آگرہ سے 1327ھ/ 1909 میں چھپ کر شائع ہوچکا ہے] اسی کتاب کی بدولت وفیات نگاری نے بحیثیت ایک فن کے عربی، فارسی اور اردو ادب میں بار پایا۔

اردو میں وفیات نگاری ایک جدید اصطلاح ہے، جس کے تحت ماضی کا وہ تمام سرمایہ (جو مضامین، کتب، دواوین، تاریخی قطعات، ماتمی شذرات اور ذاتی بیاضوں پر مشتمل ہے) محسوب کیا جاتا ہے، جو اکابر ورجال کے سالہائے اموات کو محفوظ کرنے کے خیال سے ترتیب دیا گیا ہو۔ اردو میں بحیثیت ایک موضوع کے اس پر توجہ تاخیر سے دی گئی۔ بیسویں صدی کے ربع آخر میں بعض محققین کا اس جانب التفات نظر آتا ہے اگرچہ اردو میں بھی اس کی تاریخ خاصی پرانی ہے۔ ماضی میں عربی و فارسی کے تتبع میں بعض رسائل وکتب ترتیب دی گئیں، ان کتب کی ترتیب وپیشکش، موضوع ومواد، نوعیت و کیفیت پر ابھی گفتگو کرنا باقی ہے۔ اس سلسلے میں راقم الحروف چند مضامین قلم بند کرچکا ہے، جو حسب ذیل ہیں:

1. اردو میں وفیات نگاری کی روایت، مطبوعہ ماہنامہ آجکل دہلی ستمبر 2005

2. وفیات مشاہیر اردو۔ تعارف وجائزہ، ماہنامہ شاعر بمبئی
ایضاً، ماہنامہ رہنمائے تعلیم دہلی، ستمبر 2006
ایضاً مع ترمیم واضافہ، ششماہی غالب نامہ دہلی۔ جولائی 2013

3. وفیات نگاری کی روایت میں رامپور کا حصہ، رضا لائبریری جرنل، رامپور شمارہ [نمبر، 14,15] 2007

4. مولانا ضیاء الدین اصلاحی کی وفیات نگاری، ماہنامہ اردو دنیا دہلی
ایضاً، ضیاء الدین اصلاحی حیات وخدمات، مرتب محمد طارق اعظم گڑھ 2013

5. تاریخ لطیف، ہماری زبان دہلی 8 تا 14 اپریل 2005
ایضاً مع ترمیم واضافہ، ماہنامہ آجکل دہلی مارچ 2015

مذکورہ بالا مضامین میں ہندوستان میں کیے جانے والے کام تک مطالعے کو محدود رکھا گیا ہے؛ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وفیات نگاری کی جدید اصطلاح کے تحت ہندوستان کے مقابلے پاکستان میں زیادہ وقیع کام ہوا ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ اگرچہ پاکستانی اہل قلم کا دائرۂ کار قیام پاکستان (14 اگست 1947) سے زمانۂ ترتیب تک محدود ہے، لیکن انھوں نے اس سلسلے کو ایک مستقل بالذات موضوع کے طور پر برتنے اور استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ زیر نظر تحریر میں وفیات نگاری پر مشتمل جدید کتب کے تعارف سے پیشتر سالہائے اموات کو محفوظ رکھنے کے اردو میں موجود متعدد نمونوں کا تعارف پیش کیا جارہا ہے، انھیں وفیات نگاری کے اولیں نقوش بھی کہہ سکتے ہیں، جو حسب ذیل ہیں:

1. دیوانِ تواریخ، سید آل محمد مارہروی، مطبع نورالانوار آرہ۔ 1288ھ/ 1871

سید آل محمد مارہروی (1830-1873) نے اپنے تاریخی قطعات کو بہ صورت دیوان بہ اعتبار حروف تہجی ترتیب دیا تھا۔ اب تک کی دریافت کے مطابق تاریخ گوئی پر اردو میں یہ پہلا مطبوعہ مکمل دیوان ہے، اس میں وفیات پر کثرت سے قطعات ہیں۔ مرزا غالب کی وفات پر بھی متعدد قطعات ہیں، ایک قطعے پر یہ عبارت درج ہے: ''قطعہ ایں تاریخ اصلاحی مرزا غالب صاحب است (ص 63) اکبر علی خاں عرشی زادہ نے اپنے مضمون 'تاریخ لطیف' (نگار رامپور، جولائی 1963) میں اس دیوان کو صاحب عالم مارہروی کی طرف منسوب کردیا ہے

جو غلط ہے۔ مصنف کے دوسرے مجموعۂ قطعات، دوایر خُجستہ (آرہ 1872) مکاتبہ متفرقہ (آرہ، 1879) ہیں۔

محمد ولایت علی خاں عزیز صفی پوری کے قطعات تواریخ کے مجموعے، بیان التاریخ (آگرہ 1914) اعجاز التواریخ (آگرہ 1914) ہیں۔ وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ ان میں کتنے قطعات، وفیات سے متعلق ہیں۔

2. دفتر تواریخ (1901)، میزان التاریخ (1931)، جامع التاریخ (1937)، آثار التاریخ (1950) کے ناموں سے حامد حسن قادری (ف 1964) نے اپنے تاریخی قطعات مرتب کیے تھے جو ان کی حیات میں شائع نہیں ہو سکے۔ ان کی وفات کے بعد تین مجموعے: جامع التاریخ (1937) اور سفینۂ تاریخ (1995) لبرٹی آرٹ پریس دہلی سے 2000 میں اور میزان التاریخ (1931) اسی پریس سے 2001 میں چھپ کر شائع ہوئے۔ ان مجموعوں میں ہر قسم کے قطعات ہیں۔ وفیات سے متعلق قطعات کی تعداد بھی خاصی ہے۔

اسی سلسلے کا ایک مجموعہ، عندلیب تواریخ (1963) کے نام سے ادارۂ انیس الہ آباد نے (1964) میں شائع کیا، اس کے مصنف خان بہادر سید مسعود حسن مسعود ہیں۔ مالک رام کے 'تذکرۂ ماہ و سال' میں مسعودؔ کے نام سے اس کے متعدد حوالے ہیں، جنھیں بعد کے لوگ سمجھ نہیں سکے۔

3. تاریخ لطیف، محمد مہدی علی خاں ممتاز رامپوری، بخطِ مولف نسخہ مخزونہ رضا لائبریری رامپور۔ [کال نمبر 1362 کے تحت دیکھا جاسکتا ہے] سال تالیف 1922

ممتاز رامپوری (ف 1925) امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ رضا لائبریری رامپور میں تحویلدار کی خدمت پر مامور تھے۔ انھوں نے فہرست کے مطابق 234 (صحیح 240) شعرا کی وفات پر کم و بیش 459 تاریخی قطعات و مادے مختلف دواوین، تذکروں، اخبارات و رسائل کی مدد سے مرتب کیے جو فارسی و اردو دونوں زبانوں میں ہیں، جن کے اشعار کی مجموعی تعداد تقریباً 2090 ہوگی۔ وفیات پر متفرق شعرا کے تاریخی قطعات مرتب کرنے اور انھیں صرف وفاتِ شعرا و ادبا تک محدود رکھنے کی یہ پہلی روایت ہے۔

4. وفیات الاخیار، مولوی محمد احسن وحشی نگرامی۔ مطبوعہ مطبع شام اودھ لکھنؤ 1901 صفحات 188

یہ کتاب امتِ مسلمہ کے مشاہیر فقرا، صوفیا اور عرفا کے مقامات مزار و تواریخ ہائے وصال پر مشتمل ہے۔ راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزری، اس کا حوالہ عبدالحی صفا بدایونی نے 'تذکرۃ الصلحا' میں دیا ہے۔ راقم الحروف کی طلب پر مولانا فیصل احمد بھٹکلی نے ندوۃ العلما لکھنؤ کی لائبریری میں اس کا نسخہ دیکھ کر حسب ذیل معلومات فراہم کی۔

کتاب تین جدول پر مشتمل ہے۔ پہلی جدول میں عہد صحابہ کرام سے مولف کے عہد تک الف بائی ترتیب میں تین شقوں میں اندراج ہیں۔ نام/ تاریخ وفات/ مدفن۔ کتاب کا اصل حصہ یہی ہے۔ دوسری جدول میں ماہ محرم سے ماہ ذی الحجہ تک وفات پانے والوں کی تاریخ وفات مع نام سلسلے وار دی گئی ہے، جس سے فوری طور پر یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ کیم محرم کو کتنے اور کن کن بزرگوں کا وصال ہوا تھا۔ اسی پر دوسری تاریخوں کو قیاس کر لیجیے۔ تیسری جدول کو جغرافیائی نہج پر الف بائی ترتیب میں مرتب کیا گیا ہے، یعنی کتاب میں شامل بزرگوں کے مزارات جن شہروں، قصبات، قریوں میں واقع ہیں، ان کی فہرست سازی کر دی گئی ہے۔ اس فہرست سے بھی بیک نظر یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ کن مقامات پر کون کون سے بزرگ مدفون ہیں۔ کتاب مذہبی ارادت کے تحت تالیف کی گئی ہے تاکہ بزرگوں سے عقیدت رکھنے والے ان کو ایصال ثواب میں شامل کر سکیں۔

5. تذکرۃ الصلحا، مولوی عبدالحی (صفا) مطبع نظامی بدایوں 1912 صفحات 96

عبدالحی صفاؔ (ف 1914) مولف تذکرۂ 'شمیم سخن' نے ہجری مہینے کی پہلی تاریخ یعنی کیم محرم سے آخری مہینے ذی الحجہ کی 30 تاریخ تک تمام ہندوستان کے اولیائے کبار کی تاریخ و ماہ و سالِ وصال/ نام/ سلسلۂ ارادت/ جائے مدفن کا اندراج کیا ہے۔ اس میں کل 1131، اندراج ہیں۔ ہر ماہ کی سرخی قائم کر کے اندراج جدول میں دیے گئے ہیں۔ قدیم ترین اندراج 11 ربیع الاول 392ھ/ حضرت سید شاہ عبدالرحمٰن المعروف بہ شاہ دولہ رحمٰن خلف سید حسین محمود/ سلسلہ بسطامیہ/ مدفن ایلچ پور برار (ص 19، اندراج 32) اور جدید ترین 16/ ذی الحجہ 1329ھ/ حضرت حافظ احمد حسین خاں/ چشتی/ شاہجہاں پور، روہیل کھنڈ (ص 91 اندراج 52) کا ہے۔ مولف نے اس کتاب کے دیباچے میں تین حصے مرتب کرنے کی اطلاع دی ہے: 'پہلا حصہ پیش نظر ہے، دوسرا حصہ ان بزرگوں کے اسمائے مبارک پر مشتمل ہے جن کا صرف سال وصال معلوم ہو سکا، تیسرا حصہ ان حضرات کے نام نامی سے مزین ہے، جن کا سال وصال معلوم نہیں صرف تاریخ یا ماہ یا عرس کا زمانہ معلوم ہوا۔ ان دونوں حصوں کے مطبوعہ ہونے کا علم نہیں ہو سکا۔

6. دفتر وفیات: تیار کردہ، امتیاز علی خاں عرشی، سالہائے اموات پر رجسٹر مملوکہ رضا لائبریری رامپور

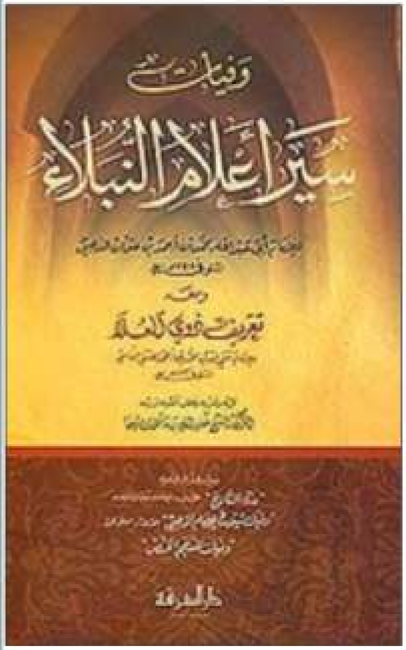

بشارت علی فروغ نے اپنی کتاب 'وفیات مشاہیر اردو' میں لکھا ہے:

عرشی صاحب نے عربی و فارسی میں وفیات کے رجسٹر الگ الگ تیار کرائے تھے جو رضا لائبریری میں موجود ہیں۔ ایک ذاتی رجسٹر وفیات کا ان کے مکان پر تھا، جس میں علما، ادبا، شعرا، نوابین، صوفیا، ارباب سیاست، شہر کی مقتدر ہستیوں، اپنے اہلِ خاندان، ملنے والوں اور رضا لائبریری کے ملازمان کی وفیات درج ہیں۔ یہ رجسٹر 1301ھ (29 ستمبر 1884) سے 1398ھ (22 نومبر 1978) تک کے عرصے کو محیط ہے۔ ہر صفحے پر ایک سال کی وفیات ہیں۔ زیادہ تر وفیات کے آگے 'دبدبۂ سکندری' حوالے کے طور پر لکھا ہے۔ ہفت روزہ دبدبۂ سکندری، رامپور 1866 سے لے کر 1958 تک 92 سال پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ (ص 3-4)

اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ دفتر وفیات کے علاوہ عرشی صاحب کا ایک نجی رجسٹر بھی تھا، جس سے فروغ نے اپنی کتاب کی تالیف میں بھر پور استفادہ کیا۔ اس طرح کے رجسٹر یا ڈائریاں ہر مصنف بناتا ہے اور دوران تحریر ان سے بوقت ضرورت استفادہ کرتا ہے، لیکن ان رجسٹروں کی اہمیت اس لیے ہے کہ یہ اردو تحقیق کے معلم ثانی کے تیار کردہ ہیں۔

7. ہمارے اہل قلم مرتب، زاہد حسین انجم ناشر ملک بک ڈپو، لاہور 1988، صفحات 533

یہ کتاب پاکستان کے زندہ و مرحوم قلم کاروں کا تذکرہ ہے، لیکن اسے اس طور ترتیب دیا گیا ہے، کہ یہ

پاکستان کے مرحوم اہلِ قلم کی تاریخ وفات اوران کا اجمالی تعارف بھی پیش کر دیتا ہے۔ یہ بہ اعتبار حروف تہجی ترتیب دیا گیا ہے اور اس میں (1505+50) 1555، اندراج ہیں۔ کوائف کو، اصل نام/ تاریخ پیدائش مع جائے پیدائش/ تاریخ وفات مع مدفن/ پیشہ/ صنف ادب/ تصانیف/ اعزاز،شقوں کے تحت جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب پر احمد ندیم قاسمی، پروفیسر عارف عبد المتین، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر سہیل آغا، ڈاکٹر تحسین فراقی، میرزا ادیب کی توصیفی تحریریں شامل ہیں۔ باوجود اس کے کہ اس دور میں یہ حوالے کی کتاب تسلیم کی گئی،لیکن معروف نہیں ہوسکی۔ یہ کتاب ڈاکٹر شعائراللہ خاں (رامپور) کے ذاتی ذخیرے میں، میں نے اب سے تقریباً 23 سال پیشتر دیکھی تھی،اس مضمون کی تالیف کے وقت انھوں نے میرے استفسار پر مذکورہ بالا معلومات فون پر فراہم کی۔

8. الواح الصنادید، ج/ ا عطاء الرحمٰن قاسمی، ناشر شاہ ولی اللہ اکیڈمی میر درد روڈ نئی دہلی بار اول 1989 صفحات 400

ایضاً ایضاً ناشر شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، دہلی بار دوم 1992

ایضاً ایضاً ایضاً بار سوم 2007

الواح الصنادید ج/2 ایضاً، ناشر مولانا آزاد اکادمی، نئی دہلی، بار اول 1991، صفحات 256

(ر اس کتاب میں دہلی میں واقع مہندیوں کے قبرستان یعنی حضرت شاہ ولی اللہ اوران کے خانوادے کے مدفون وقت کی الواح قبور نقل کی گئی ہیں،اوراہم مزارات کے فوٹو بھی دیے گئے ہیں۔بعض دوسرے اکابر کے مزارات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے اوران کی تاریخ وصال وتر جمے والے مطلع کیا گیاہے۔اس جلد میں تقریباً 150، اندراج ہیں۔

جلد دوم میں دہلی میں واقع معروف درگاہوں (مثل بارگاہ نظام الدین، درگاہ باقی باللہ وغیرہ) قبرستانوں اور بعض متفرق معروف مزارات کی نشاندہی، تاریخ وصال اور دستیاب کوائف دیے گئے ہیں۔اس طور یہ دونوں جلدیں دہلی کے بڑے اور ممتاز قبرستانوں کا احاطہ کرلیتی ہیں۔ مولف کا منشا اکابرِ اسلام سے متعلق وفیات کو محفوظ کرنا ہے۔

9. بیاضِ قادری: مرتب ڈاکٹر محمد ایوب قادری، کراچی۔ غیر مطبوعہ، ڈاکٹر قادری (1926-1983) بقول ڈاکٹر جمیل جالبی: ''علم الرجال میں بے اندازہ معلومات کے حامل تھے''۔(یادگار ایوب قادری 61) انھوں نے بھی مشاہیرعلم وادب پر مالک رام کی طرح کام کیا۔اس بیاض کا کچھ حصہ پاکستانی رسائل میں بھی شائع ہو چکا ہے۔سحر انصاری لکھتے ہیں:

قادری مرحوم ہر سال کے آخر میں ایک وفات نامہ شائع کرتے تھے جس میں سال کے دوران رخصت ہو جانے والی اہم شخصیتوں کی تاریخ وفات اور مختصر حالات درج ہوتے تھے۔(یادگار ایوب قادری، مولف وناشر ادارۂ دانش وحکمت کراچی 1986، ص 221)

محمد محی الدین لکھتے ہیں:

مشاہیر کی پیدائش و وفات کی تاریخیں وہ بڑے اہتمام سے رکھتے تھے، اور اکثر قطعۂ تاریخ بھی نظم کر دیتے تھے،لیکن وہ 1983 میں'' جدا ہوگئے ہم سے یہ لوگ'' شائع نہ کر سکے؛ کیوں کہ کچھ ہی دن پہلے خود وہ اس گوشوارے کا حصہ بن چکے تھے۔(یادگارایوب قادری74)

مذکورہ بالا بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ'بیاض قادری' ہم عصروں کی وفات پر مشتمل رہی ہوگی؛ لیکن 'تذکرۂ ماہ وسال' میں 1884 میں وفات پانے والے، امداد العلی اکبر آبادی اور 1893 میں وفات پانے والے، مطبع مفید عام آگرہ کے مالک، احمد علی خاں صوفی وغیرہ کے اندراج کا ماخذ 'بیاض قادری' ہے:اس سے یہ بات یقینی ہوجاتی ہے کہ مالک رام کی طرح وفیات جمع کرنے کا دائرۂ کار، قادری کا بھی غیر محدود تھا۔ مالک رام نے بیاض قادری سے کس طور استفادہ کیا،اس کے متعلق کچھ عرض نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر گیان چند نے اپنے مضمون 'تذکرۂ ماہ وسال' میں بیاض قادری سے لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔(شاعر:ص 1027) دوسرے اہل قلم بھی 'مسعود' اور' بیاض قادری' کے حوالوں سے عام طور پر ناواقف ہیں، اسی لیے ان پر قدرے صراحت سے روشنی ڈال دی گئی۔

اردو میں 'وفیات نگاری' کی اصطلاح کا استعمال غالباً پہلی مرتبہ مالک رام کے' تذکرہ' ماہ وسال' کی اشاعت (1991) کے بعد ہوا اور مالک رام کی کتاب کو اردو میں وفیات نگاری کا پہلا کتابی نمونہ بھی قرار دیا گیا۔ ڈاکٹر گیان چند نے لکھا ہے:

یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اردو میں اس قسم کے حوالے کی اور کوئی کتاب نہیں۔ کسی تحقیق کار کو اس سے مفر نہیں۔(شاعر، ہم عصر اردو ادب نمبر مئی تا دسمبر 1997 ص 1042)

خود مالک رام نے لکھا ہے:''اردو میں یہ اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے''(پیش لفظ 9)اردو میں تاریخ وتذکرے کی یہ شق ایک معیاری اور مثالی نمونے کی طالب تھی، مالک رام کے تذکرۂ ماہ وسال نے اس نوع کے کاموں کے لیے ایک فارمیٹ تیار کردیا۔

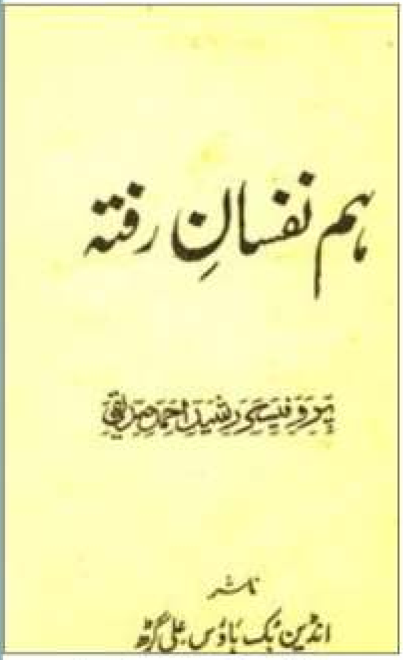

یہ امر تحقیق کا موضوع بننا چاہیے کہ اردو شعروادب سے متعلق شخصیات پر اس انداز کا کام کرنے کا آغاز کس نے کیا؟ بہ ظاہر ذہن ڈاکٹر ایوب قادری کی طرف جاتا ہے، لیکن ان کا کام کتابی صورت اختیار نہیں کر سکا۔ مضامین کی صورت میں بکھرا ہوا ہے، اگر کبھی یہ مضامین یکجا ہوئے تو ممکن ہے اس سلسلے میں واضح طور پر کچھ کہا جا سکے۔ سر دست تو مالک رام کا نام ہی اولیت کا مستحق ہے،لیکن پاکستانی قلم کار،اس انداز کے کام کرنے کا بنیاد گزار، پروفیسر محمد اسلم کو مانتے ہیں،لیکن یہ دو طور پر درست نہیں۔ اول یہ کہ انھوں نے جملہ شعبہ ہائے زندگی کے مشاہیرِ پاکستان کو موضوع بنایا ہے صرف مشاہیر ادب کو نہیں۔ دوسرے یہ کہ مالک رام نے اس کام کا آغاز ان سے بہت پہلے 1964 میں کیا۔ 1971 میں پہلی بار اس کو کتابی صورت میں ترتیب دینے کی اطلاع دی گئی۔ (ارمغانِ مالک رام۔ دہلی 1971 ص 51) لیکن اس کی اشاعت 1991 میں عمل میں آئی۔ اس دوران کراچی میں ڈاکٹر محمد ایوب قادری اور ڈاکٹر قادری کی تحریک پر لاہور میں پروفیسر محمد اسلم (ف 1998) بھی مشاہیر کی وفیات جمع کر رہے تھے۔ پروفیسر محمد اسلم کی کتب' وفیات مشاہیر پاکستان' اور' خفتگانِ کراچی'، مالک رام کی کتاب سے پیشتر چھپ کر منظر عام پر آ گئیں، ڈاکٹر قادری کی بیاض شائع نہیں ہوسکی۔ 'تذکرۂ ماہ وسال' میں بیاض قادری اور محمد اسلم کی مذکورہ دونوں کتب کے حوالے ملتے ہیں؛ لیکن چونکہ بہ قول پروفیسر مختار الدین احمد: ''اس طرح کا کام کرنے کا خیال مالک رام صاحب کو پہلے آیا'' (تعارف

وفیات مشاہیر بہار 6) لہٰذا مالک رام کی اولیت برقرار رہے گی۔ اس طرح کی مثالیں بعض دوسرے کاموں کے سلسلے میں بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً زبان اردو کے منبع ومخرج کو برج بھاشا سے جوڑنے کا خیال پہلی بار مولوی عبدالغنی صفا نے پیش کیا(مقدمہ شمیم سخن سال تالیف 1872) اور یہی خیال مولانا محمد حسین آزاد نے مقدمہ آب حیات میں بعد میں (مطبوعہ لاہور 1880) [1]۔ اسی طرح مولوی مہیش پرشاد کی کتاب 'خطوط غالب' (الہ آباد 1941) ترتیب کے لحاظ سے مولانا عرشی کی کتاب 'مکاتیب غالب' (بمبئی 1937) سے مقدم ہے اور اشاعت کے لحاظ سے موخر۔[2] اس بحث سے قطع نظر سطور ذیل میں ہندو پاک میں شائع ہونے والی کتب کا تاریخی ترتیب میں تعارف پیش کیا جارہا ہے:

ا۔ تذکرۂ ماہ وسال، مالک رام، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی، نومبر 1991 (صحیح جنوری 1992) صفحات 432

یہ بنیادی طور پر شعروادب سے تعلق رکھنے والے مشاہیر ہندوپاک کی تاریخ ہائے ولادت ووفات کا تذکرہ ہے، جس میں ساتویں صدی عیسوی سے بیسویں صدی عیسوی تک کے 3600، افراد کا اندراج ہے جو علم وادب کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ 146، اندراج مکرر ہیں، اس طرح صحیح تعداد اندراج 3452 ہے۔ تذکرہ کا قدیم ترین اندراج محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ف 8 جون 632 (ص 337) اور معاصر اندراج حسینی شاہد، ف 22 دسمبر 1991 کا ہے:(ص 424) گویا ساتویں صدی عیسوی سے بیسویں صدی عیسوی تک چودہ صدیوں کی شخصیات کتاب میں یکجا ہوگئی ہیں۔ کتاب پر تاریخ اشاعت نومبر 1991 درج ہے، لیکن اس میں 22 دسمبر 1991 تک کی تاریخ ہائے وفات شامل ہیں (ص 424 حسینی شاہد) لہٰذا اس کی اشاعت کو جنوری 1992 کا قیاس کرنا چاہیے۔

اس تذکرے میں ہر فرد کا مکمل نام، وطن، علمی وادبی شعبہ اور پہچان، ولادت مع جائے ولادت وتاریخ، وفات مع تاریخ، مدفن و عارضۂ موت، ولادت و وفات کے تاریخی مادے، شاعر ہے تو تلمذ کا ذکر۔ اس کے علاوہ کہیں کہیں اضافی معلومات بھی۔ آخر میں ماخذ کا اندراج بھی کردیا گیا ہے۔ کتاب الف بائی ترتیب میں مرتب کی گئی ہے جو ایک خاص سلیقے اور نفاست کا نمونہ پیش کرتی ہے۔

بہ قول ڈاکٹر گیان چند:

ایک غیر معمولی کتاب ہے۔ اس میں تحقیقی معلومات کا جو خزانہ ہے وہ کم کتابوں میں ہوگا، لیکن اس میں جس قدر اغلاط ہیں وہ بھی کم کتابوں میں ہوں گی۔ مرتب کی کبرسنی، صحت اور بیماری کے سبب انحطاط کو دیکھتے ہوئے کتاب کی فروگزاشتوں کے لیے انھیں معذور رکھنا ہوگا۔
(شاعر بمبئی، ہم عصر اردو ادب نمبر 1023)

اس کتاب کی اہمیت وقدر وقیمت اور اس میں پائی جانے والی فروگزاشتوں واغلاط پر حسب ذیل مضامین قلم بند کیے گئے:

- تذکرۂ ماہ وسال۔ ایک جائزہ، ڈاکٹر حسین احمد، ماہنامہ صریر کراچی، ستمبر 1993
- تذکرۂ ماہ وسال (مالک رام) ایک مطالعہ، پروفیسر محمد اسلم، ماہنامہ سیارہ لاہور، شمارہ نمبر 33 سال نامہ 1993
- مالک رام کا بے حد مفید و بے حد غلط تذکرۂ ماہ وسال، ڈاکٹر گیان چند ماہنامہ شاعر بمبئی، مئی تا دسمبر 1997 معاصر اردو ادب نمبر
- تذکرۂ ماہ وسال، ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ مشمولہ وفیات ناموران پاکستان، لاہور 2006، ص 47 تا 53

پروفیسر مختار الدین نے 'وفیات مشاہیر بہار' کے تعارف میں لکھا ہے:

اب دو کام ہونے چاہئیں: ایک تو یہ کہ اچھی طرح نظر ثانی اور نئی معلومات کے اضافے کے ساتھ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن نکلنا چاہیے...... دوسرا ضروری کام یہ ہے کہ گزشتہ دس سال کے عرصے میں وفات پانے والوں کے کوائف پر ایک علاحدہ کتاب شائع ہونی چاہیے۔ (ص 8)

بدقسمتی سے یہ دونوں کام ابھی تک نہیں کیے جاسکے۔ مکتبہ جامعہ نے 2011 میں اس کا دوسرا ایڈیشن پہلی اشاعت کے مطابق ہی شائع کردیا۔ لہٰذا جو فروگزاشتیں اس میں تلاش کی گئی تھیں وہ بدستور باقی رہیں؛ البتہ پاکستان میں سید معراج جامی نے اس کی نئی ترتیب اور اس کا ذیل تیار کرنے کا ڈول ڈالا تھا، لیکن ان کا کام کہاں تک پہنچا مجھے علم نہیں۔

یہ کتاب اپنی تمام تر غلطیوں کے باوجود کارآمد ہے اور مطالبہ گزار ہے کہ اس انداز پر آگے کام جاری رکھنا چاہیے۔

2. وفیات مشاہیر پاکستان، مرتبہ پروفیسر محمد اسلم، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ستمبر 1990 (صحیح: بعد از فروری 1991) صفحات 321

یہ کتاب 14 اگست 1947 سے 14 اگست 1987 تک چالیس سالوں میں وفات پانے والے [2572 + 43] 2615، افراد کی وفیات پر مشتمل ہے۔ اس میں 50، اندراج مکرر ہیں، اس طور صحیح تعداد اندراج 2565

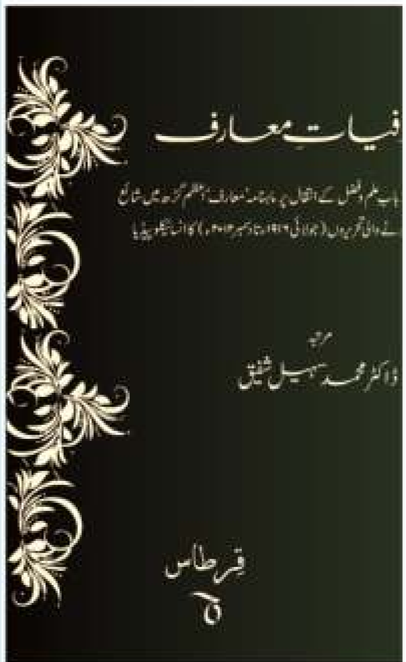

ہوجاتی ہے۔ ان افراد کا تعلق قومی زندگی کے مختلف شعبوں سے ہے، یعنی ان میں علما، صوفیا، ادیب، شاعر، سیاست داں، سماجی کارکن، اہل حرفہ، اہل فن، موسیقار، مصور، اداکار، صحافی اور عہدیداران مملکت وغیرہ بھی شامل ہیں۔

کتاب الف بائی ترتیب میں مرتب کی گئی ہے، ہر اندراج کے تحت اُس فرد کی خاص شہرت کا حوالہ، تاریخ و مقام ولادت، تاریخ وجائے وفات اور اپنے ماخذ کا ذکر کیا ہے۔ مالک رام کے تذکرہ ماہ وسال کی طرح اس میں بھی خاصی غلطیاں در آئی ہیں جن کی طرف ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ نے متوجہ کیا ہے۔

(دیکھیے: ناموران مشاہیر پاکستان: ص 24 تا 34)

کتاب پر مرتب کی کوئی تحریر نہیں ہے، جس سے اس کے کام کے آغاز وانجام پر روشنی پڑسکے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے پیش لفظ لکھا ہے جس میں انھوں نے اس کتاب کو 'اردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف' کہا ہے۔

3. وفیات اعیان پاکستان، پروفیسر محمد اسلم ادارہ ندوۃ المصنفین، لاہور 1991

یہ دراصل وفیات مشاہیر پاکستان کا تکملہ ہے۔ یہ 14 اگست 1978 سے 31 دسمبر 1990 تک وفات پانے والے 602، مشاہیر پاکستان کا تذکرہ ہے۔ یہ پہلے پہل پنجاب یونیورسٹی کے 'مجلہ تاریخ' میں 1991 کے اوائل میں لاہور سے شائع ہوا، بعد میں کچھ مزید فرمے چھپوا کر نئے سرورق کے ساتھ کتابی شکل میں لاہور سے شائع کیا گیا۔ اس پر سال اشاعت درج نہیں۔

4. خفتگان کراچی پروفیسر محمد اسلم ادارۂ تحقیقات

پاکستان پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ نومبر 1991، صفحات 372

اس کتاب میں کراچی کے ۱۷، بڑے قبرستانوں میں مدفون قومی زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے اہم افراد کے سالہاے وفات، قبروں کے محل وقوع" ان پر لگے 450 کتبوں کی نقول اور ان کی حیات پر بنیادی معلومات پیش کر دی گئی ہیں۔ آخر میں 115، ایسے لوگوں کے ناموں کی فہرست دی ہے جن کے مقابر کی نشاندہی نہیں ہو سکی۔

5. خفتگان خاک لاہور، پروفیسر محمد اسلم ادارہ تحقیقات پاکستان دانش گاہ پنجاب لاہور۔ مارچ 1993 صفحات 524

اس کتاب میں لاہور کے اہم قبرستانوں 500 آسودگان خاک کا تذکرہ ہے۔ ان کی الواح قبور کی نقول دی گئی ہیں۔ جاے مدفن کی نشاندہی کے ساتھ ہی کچھ دستیاب کوائف بھی دے دیے گئے ہیں۔ الواح قبور پر مبنی مذکورہ دونوں کتابیں پاکستان میں مزید کام کرنے کی محرک بنیں۔

اس سلسلے کی حسب ذیل کتابیں میری معلومات میں ہیں:

خفتگان خاک گجرات، ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ، گجرات 1992

لاہور میں دفن خزینے، جمیر ہاشمی و دیگر، لاہور 1998

لاہور میں مشاہیر کے مدفون ایم آر شاہد، لاہور 2003

شہر خموشاں کے مکیں، ایم آر شاہد، لاہور 2004

آسودگان خاک اسلام آباد، محمد منیر سلیچ، اسلام آباد، 2011

کراچی میں مدفون شعرا، اظہر عباس ہاشمی کراچی 2014

6. وفیات مشاہیر بہار، سید شاہد اقبال، اصیلہ آفسیٹ نئی دہلی بار اول 2000، صفحات 112

بیسو صدی عیسوی کے نصف آخر یعنی مارچ 1947 سے دسمبر 1999 تک وفات پانے والے 330 مشاہیر بہار کا تذکرہ ہے۔ یہ بہ اعتبار تاریخ وصال مرتب کیا گیا ہے؛ البتہ آخر میں اس میں شامل شخصیات کے ناموں کا اشاریہ الف بائی ترتیب میں دے دیا گیا ہے۔ اس کو نمبر شمار/ اصل نام/ پہچان/ تاریخ و مقام پیدائش/ وفات و جاے وفات/ مدفن/ تاریخی قطعہ یا ماڈہ، شقوں کے تحت مرتب کیا گیا ہے۔ ہر اندراج کے ماخذ سے مطلع نہیں کیا گیا؛ البتہ کتاب کے آخر میں 25 کتب اور 11، رسائل کی فہرست دی گئی ہے جو ماخذ کے طور پر مولف کے پیش نظر رہے۔ کتاب پر، پروفیسر مختار الدین احمد نے تعارف لکھا ہے، جس میں عربی و فارسی میں وفیات نگاری کی روایت کو تاریخی پس منظر میں پیش کرتے ہوئے اس سلسلے میں اردو میں کیے جانے والے کام کی نشاندہی کی ہے۔ اسی میں انھوں نے یہ اطلاع بھی دی تھی کہ بیسویں صدی کے نصف اول 1901 تا 1950 کے مشاہیر بہار کی وفیات پر وہ خود کام کر رہے ہیں (ص 12) اس طور مشاہیر بہار کی ایک صدی کی وفیات کی ممکنہ حد تک تکمیل کی توقع تھی، لیکن ان کی وفات (30 جون 2010) نے اس توقع کو خاک میں ملا دیا۔

7. وفیات مشاہیر اردو بشارت علی فروغ کلکتہ آفسیٹ پریس دہلی مارچ 2000، صفحات 672

مالک رام کے بعد خالص شعر و ادب سے متعلق شخصیات پر یہ دوسری کتاب ہے۔ کتاب کے مرتب بشارت علی فروغ ایک مقامی شاعر کی حیثیت سے متعارف تھے۔ ابر احسنی گنوری (ف 1973) کے شاگرد اور پیشے کے اعتبار سے وکالت کرتے تھے۔ 3 جنوری 1937 کو رامپور میں پیدا ہوئے اور یہیں 13 فروری 2010 کو انتقال کیا۔ اس کتاب کی ترتیب میں انھوں نے بڑی دیدہ ریزی سے کام لیا ہے، لیکن مالک رام کی طرح انھوں نے بھی یہ کام عمر کے آخری دور میں انجام دیا؛ لہذا بعض صورتوں میں وہ جم کر تحقیق نہیں کر سکے ہیں۔

کتاب الف بائی ترتیب میں 2515، اندراجات پر مشتمل ہے۔ ان میں 15، اندراج مکرر ہیں؛ لہذا صحیح تعداد اندراج 2500 ہوئی۔ کتاب کے اندراجات میں حسب ذیل شقوں کا التزام رکھا گیا ہے۔

نمبر شمار، تخلص مع وطنی نسبت یا قلمی نام، اصل نام، ولدیت، شعبۂ علم و ادب جس کے سبب پہچان ہے، تاریخ ولادت مع جاے ولادت، تلمذ، تاریخ وفات مع جاے وفات، تصانیف۔ مالک رام نے عربی و فارسی کی مروج روایت پر تاریخ پیدائش، مدفن اور حوالے کا اضافہ کیا تھا، فروغ نے ہر اندراج پر نمبر شمار، ولدیت، وطنی نسبت، اور تصانیف کا اضافہ کیا ہے۔ وطنی نسبت کا اندراج کرتے ہوئے حتی المقدور ان مقامات کا محل وقوع بھی بتا دیا ہے۔ (مثلاً حسرت موہانی، [موہان ضلع اناؤ۔ یوپی]) جو ایک غیر معمولی کاوش ہے۔ مالک رام نے زندہ شخصیات کو بھی جگہ دی ہے اور ان کی تاریخ پیدائش کا اندراج کیا ہے۔ (اسی لیے انھوں نے اسے وفیات کا نام نہ دے کر تذکرے کا نام دیا)، لیکن فروغ نے صرف مرحوم شخصیات کو تذکرے میں جگہ دی ہے اور علم و ادب سے متعلق شخصیت ہی کا انتخاب کیا ہے۔

کتاب میں شامل ادیبوں میں قدیم ترین اندراج امیر خسرو (ف 9 ستمبر 1325) اور جدید ترین اندراج نازش سکندر پوری (ف 14 اپریل 1999) کا ہے۔ اس طرح یہ چودھویں صدی عیسوی سے بیسویں صدی عیسوی تک تقریباً سات سو سال کے علما، ادبا اور شعرا کی تاریخ ہاے ولادت و وفات اور کوائف پر مشتمل ہے۔

اس کتاب پر ایک مختصر تبصرہ شاہد اقبال کا ماہنامہ شاعر بمبئی اگست 2002 میں شائع ہو چکا ہے۔ طویل تبصرہ راقم الحروف نے کیا ہے جس کا حوالہ گزر چکا۔ عقیل عباس جعفری (پاکستان) بھی اس کا جائزہ لکھ رہے تھے، تکمیل و اشاعت سے لاعلم ہوں۔

8. وفیات ناموران پاکستان ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ اردو سائنس بورڈ، لاہور، بار اول 2006، صفحات 955، سائز [A4]

پاکستان میں وفیات پر آج تک جو بھی کام ہوا، وہ قومی زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں خدمات انجام دینے والے ممتاز اور معروف لوگوں کو شامل کرتے ہوئے کیا گیا ہے، اس کے برخلاف ہندوستان میں جو وفیات پر کتابیں مرتب ہوئیں ان کو صرف علمی و ادبی شخصیات تک محدود رکھا گیا ہے۔ پیش نظر کتاب میں بہ قول ناشر:

....وطن عزیز کی دس ہزار کے قریب اہم اور نامور شخصیات کا مختصر خاکہ دیا گیا ہے، جو اس جہان فانی سے رخصت ہو چکے ہیں۔ ان میں عالم دین، روحانی بزرگ، مبلغ، محقق، مورخ، دانشور، شاعر، ادیب، مترجم، ماہر تعلیم، سیاست داں، سائنسداں، انجینئر، ڈاکٹر، حکیم، تحریک پاکستان کے کارکن، قانون داں، فوجی افسران، سفیر، صنعت کار، تاجر، زرعی ماہر، سماجی شخصیات، ماہرین تعمیرات، خطاط، خاکہ ساز، مجسمہ ساز، فلم ساز، ہدایت کار، ادا کار، صدا کار، موسیقار، کھلاڑی، رقاص، گلوکار، قوال، طبلہ نواز، ہواباز... غرض ہر شعبۂ زندگی میں نمایاں خدمات انجا دینے والے ممتاز اور معروف لوگ شامل ہیں۔

مرتب نے طویل دیباچہ بہ عنوان 'آتش رفتہ کا سراغ' میں کتاب مرتب کرنے کی غرض و غایت، اس راہ کی مشکلات، اپنی تدوینی ترجیحات پر اچھی گفتگو کی ہے۔ 'اسلامی ادب میں وفیات نویسی کی روایت' کے عنوان سے ڈاکٹر عارف نوشاہی نے مقدمہ لکھا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ مقدمہ کے بعد مرتب نے 'اردو میں وفیات نگاری' کے عنوان سے طویل مقالہ لکھا ہے جس میں 2004 تک شائع ہونے والی کتب کی فروگزاشتوں اور اغلاط کا جائزہ لیا ہے۔ یہ جائزہ بڑا قیمتی ہے اور مرتب کی زیرکی اور دیدہ ریزی کا ترجمان۔ اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوگئی ہے جس میں 14 اگست 1947 سے 31 دسمبر 2004 تک وفات پانے والی شخصیات کا تذکرہ ہے۔ کتاب میں کل 9800، اندراج ہیں۔ کتاب تہجی ترتیب پر مرتب کی گئی ہے۔ مرتب نے ہر فرد کی شہرت، تاریخ و جائے پیدائش، تاریخ و جائے وفات اور مدفن، تصانیف اور اعزازات کا تذکرہ کیا ہے۔ ماخذ کا ذکر مخففات میں ہر اندراج کے ساتھ ہے آخر میں کتابیات بھی دے دی گئی ہے۔ ہر شخصیت سے متعلق معلومات کو 4 سے 20 سطروں کے درمیان محدود رکھا گیا ہے۔ تواریخ وفات کی صحت کے التزام کے لحاظ سے یہ کتاب سابقہ ہند و پاک میں شائع ہونے والی جملہ کتب پر فوقیت رکھتی ہے۔

9. وفیات اہلِ قلم ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ ناشر اکیڈمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد اول 2008، صفحات 576

کتاب کے ٹائیٹل پر لکھا ہے: ''رخصت ہو جانے والے پاکستانی اہلِ قلم کے کوائف اور تواریخ وفات'' یہ کتاب بڑے سائز [A 4] کے 576 صفحات پر مشتمل ہے۔ پیش نامہ افتخار عارف نے لکھا ہے: ''اردو میں وفیات نگاری اور وفیات نگاری کی مشکلات'' کے عنوان سے عقیل عباس جعفری نے دیباچہ نویسی کے فرائض انجام دیے ہیں۔ کتاب میں 15 اگست 1947 سے 14 اگست 2007 تک کے اندراجات ہیں۔ اندراجات کی تعداد کا علم نہیں ہوسکا۔ الف بائی ترتیب پر مشتمل اس کتاب میں شخصیت کا نام، اس کی ادبی پہچان، تاریخ ولادت و وفات، جائے ولادت و وفات، مدفن اور تصانیف وغیرہ سے مطلع کیا گیا ہے۔ کتاب میری نظر سے نہیں گزری، فون پر جناب تسلیم غوری نے ان تفصیلات سے آگاہ کیا۔

10. لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے، معروف اہلِ قلم کی تاریخ پیدائش و وفات، ابتدا تا نومبر 2010، مرتب: عزیز جبران، مشمولہ سہ ماہی 'بیلاگ' کراچی۔ تبصرہ نمبر، جولائی تا دسمبر 2010

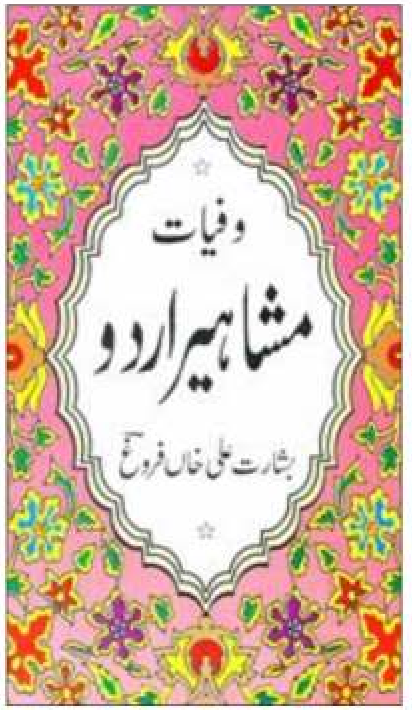

یہ رسالہ ڈائری کی طرز پر مرتب کیا گیا ہے۔ یعنی مرتب نے، 12 مہینوں، جنوری تا دسمبر کو ایک ایک عنوان بنایا ہے۔ ہر ماہ کا ایک عنوان قائم کرکے یکم تا 31 تاریخ کے دوران پیدا ہونے والے افراد کا مع تاریخ اندراج کیا ہے، پھر اسی ماہ کا ذیلی عنوان وفات قائم کرکے یکم تا 31 کے درمیان وفات پانے والے شعرا و ادبا کی تاریخ وفات کا اندراج کیا ہے، اس طور رسالے میں کل 1641، اندراج آگئے ہیں۔ اندراج کی نوعیت یہ ہے:

جنوری پیدائش:

یکم جنوری 1882 = ڈاکٹر عبد المجید میمن سندھی (لکھی شکار پور سندھ)۔ 4 جنوری 1936 = پروفیسر عبد المغنی (اورنگ آباد)... وفات (ماہ جنوری):

یکم جنوری 2010 = بسمل شمس آبادی (فتح گڑھ۔ یوپی)۔ 9 جنوری 1841 = ڈاکٹر جان گل کرسٹ۔ 10 جنوری 1988 = جمیلہ ہاشمی (لاہور تدفین بہاولپور)

مرتب نے اپنے طور پر خاصی محنت کی ہے، لیکن کسی ادیب کی پیدائش یا وفات کو اس رسالے میں تلاش کر پانا کارِ دارد ہے؛ جب تک آپ مکمل رسالے کی ورق گردانی نہ کرلیں مطلوبہ تاریخ کا پتہ لگا پانا ناممکن ہے۔

یہ رسالہ سہ ماہی 'بیلاگ' کے صرف ۳۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحے کے دو کالم کیے گئے ہیں۔ ہر کالم میں تقریباً 28 وفیات دی گئی ہیں۔

اردو محققین کے نزدیک وفیات نگاری اصطلاح کے تحت صرف تاریخ و سالہائے اموات کو محفوظ و مرتب کرنے کا مفہوم ہی درست ہے اور یہی متعارف بھی ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر عارف نوشاہی نے لکھا ہے:

وفیات نگاری کا بنیادی مقصد وفات پانے والے کی صحیح، مکمل اور دقیق تاریخ وفات لکھنا ہے، باقی معلومات اضافی اور ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔۔ اگر تاریخ وفات ہی غلط ہوگی تو کتاب تصنیف کرنے کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ (مقدمہ وفیات ناموران پاکستان 21)

لیکن گزشتہ چند سالوں سے مرحوم شخصیات پر رسائل کے اطلاعی کالم شذرات، تعزیتی مضامین کو بھی اس اصطلاح کے مفہوم میں شامل کیا جانے لگا ہے۔ اب سے پہلے مذکورہ ماتمی مضامین، رسائل کے شذرات، اموات کی خبریں، یاد رفتگاں، کاروان رفتہ، منثور مرثیہ، جانے والوں کی یاد آتی ہے، وغیرہ عنوانات کے تحت تعزیتی مضامین کے زمرے میں آتے تھے؛ اصناف نثر میں انہیں شخصی خاکوں کے تحت بھی شمار کیا گیا ہے۔ مثلاً: چند ہم عصر (عبد الحق) ہم نفسان رفتہ (رشید احمد صدیقی) یاد رفتگاں (سید سلیمان ندوی) عظمتِ رفتہ (ضیاء الدین برنی) یاد رفتگاں (ماہر القادری) وفیات ماجدی (عبد الماجد دریابادی) کاروان رفتہ (ڈاکٹر محمد ایوب قادری) متاع رفتگاں (شاہ معین الدین احمد ندوی) وہ صورتیں الٰہی (مالک رام) تذکرۂ معاصرین (مالک رام) زندہ کتبے (عروج زیدی) پرانے چراغ (مولانا سید ابوالحسن ندوی) وغیرہ۔ موجودہ دور میں تعزیتی مضامین اُس طور پر نہیں لکھے جاتے جس طور ہمارے قدما یا بزرگان دارالمصنفین لکھتے رہے ہیں، لہٰذا وفیات اصطلاح ہی مذکورہ تمام تحریروں کو محیط سمجھ لی گئی ہے۔ کیا یہ درست ہے؟ بعض مضامین میں مرحوم شخصیت کا صرف ماتم کیا جاتا ہے، تاریخ وفات کا اندراج نہیں؛ کیا ایسے مضامین کو بھی وفیات کے ذخیرے کا حصہ سمجھنا صحیح ہوگا؟ وفیات کے جدید ذخیرے کی فراہمی کے بعد بھی کیا ان مضامین کی ضرورت باقی رہتی ہے؟ ان امور پر غور کیا جانا چاہیے۔

حواشی:

1. دیکھیے: راقم الحروف کا مقالہ 'مقدمۂ آب حیات۔ مستفاد یا مستعار' مشمولہ: جدید اردو نثر کے معمار۔ مرتبہ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی 2016

2. دیکھیے: راقم الحروف کا مقالہ 'خطوط غالب، مرتبہ مہیش پرشاد کا جائزہ'۔ مشمولہ تفہیم غالب کے مدارج، مصنف ڈاکٹر شمس بدایونی، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی 2015

Shams Badauni
58, New Azadpuram Colony,
P.O. Izzat Nagar Bareilly - 243122 (UP)

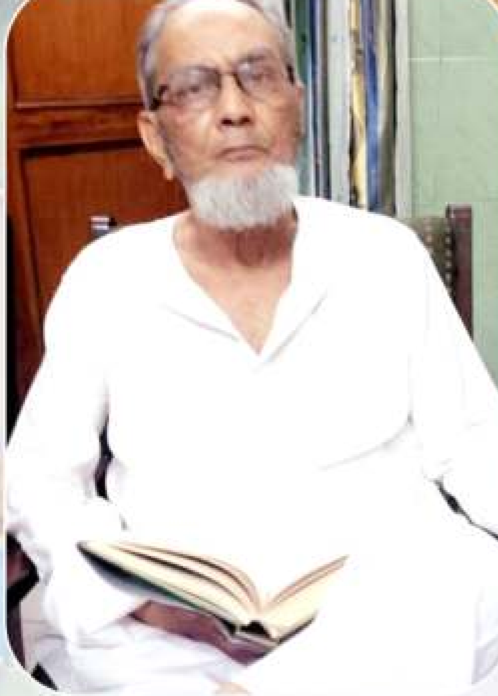

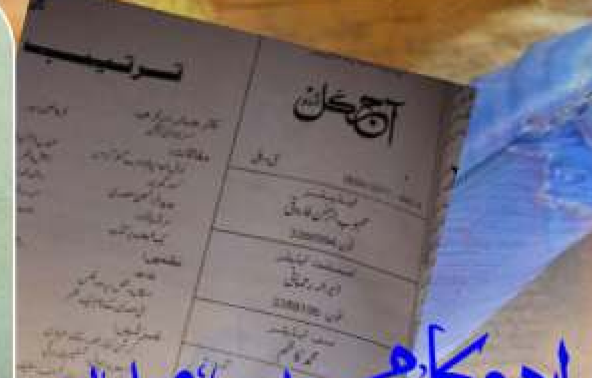

محمد شرافت علی

اردو کا 'محبوب' مدیر

محبوب الرحمٰن فاروقی

ماہنامہ 'آجکل' کے سابق مدیر جناب محبوب الرحمٰن فاروقی گو کہ ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن ان کی پہلودار شخصیت ایسی ہے، جسے اردو دنیا کے لیے فراموش کر پانا ممکن نہیں۔ خصوصاً ماہنامہ آجکل کی ادبی تاریخ اُن کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں کہلا سکتی۔ صرف اس وجہ سے نہیں کہ ایک غیر جانبدار مدیر کی حیثیت سے انھوں نے 'آجکل' کو ادبی دنیا میں غیر معمولی مقبولیت دلائی بلکہ اس بنا پر بھی کہ انھوں نے بہ حیثیت مدیر اپنے بعض اہم اصولی فیصلوں کے ذریعے اردو برادری کو کبھی حیران تو کبھی پریشان بھی کیا۔ جو لوگ محبوب الرحمٰن فاروقی کے زمانۂ ادارت سے واقف ہیں، انھیں اچھی طرح اس حقیقت کا بھی علم ہے کہ ایک باکمال، ذمے دار اور قدر شناس مدیر کی حیثیت سے انھوں نے 'آجکل' کے عہد رفتہ کی بحالی کی کوشش کس نہج پر کی اور نتیجتاً ایک بار پھر یہ رسالہ ادبی دنیا میں معتبر مقام حاصل کر پانے میں کیسے کامیاب ہوا؟ حالانکہ اس سعی مسلسل کے درمیان جناب محبوب الرحمٰن فاروقی کو اس کی بھاری قیمت بھی چکانی پڑی۔ اہل علم اس سچائی سے بھی اچھی طرح واقف ہیں کہ سیاسی بازیگری کے نتیجے میں 'آجکل' اُن دنوں وادیِ سیاست میں بھی موضوعِ بحث بنا۔ یوں سمجھیے کہ ذاتی بغض وعناد رکھنے والی دہلی کی 'نام نہاد ادبی لابی' جو پہلے سے ہی دہلی کے ادبی رسالوں پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے کوشاں تھی، اُسے ایک بہانہ مل گیا اور پھر نہایت افسوسناک انداز میں محبوب الرحمٰن فاروقی کے خلاف محاذ آرائی شروع کر دی گئی۔ ایک ذمے دار ایڈیٹر کی مدیرانہ لیاقت کو سمجھے بغیر اور محاذ آرائی کرنے والے عناصر کے سازشی منصوبوں کو جانے بغیر جب بھی ادبی معاملوں میں سیاسی عمل دخل کی شروعات ہوتی ہے تو ادبی قدروں کی پامالی اور مدیرانہ عظمت کی قربانی ادبی تاریخ کا لازمہ بن جاتی ہے۔ بدقسمتی سے محبوب الرحمٰن فاروقی کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا۔ ایک موقع ایسا بھی آیا جب ماہنامہ 'آجکل' کو شہرت بخشنے والے مدیر کے استحقاق پر بھی بدقسمتی سے سوالات کھڑے کیے گئے۔ ستم ظریفی یہ بھی رہی کہ ایک انتہائی معمولی تنازعہ کو پارلیمان میں بھی گھسیٹا گیا۔ یوں ادبی قدریں ملیامیٹ ہوئیں، مدیرانہ عظمت کو خاک میں ملا دیا گیا اور محبوب الرحمٰن فاروقی کے تبادلے کی شکل میں انھیں قربان بھی کر دیا گیا۔

یہ موقع ایسا نہیں ہے کہ جناب محبوب الرحمٰن فاروقی کے حوالے سے ادبی دنیا میں شروع ہو جانے والی محاذ آرائی کی تفصیل بیان کی جائے، لیکن مرحوم کی رحلت کے بعد انھیں یاد کرتے ہوئے یہ ضروری معلوم ہوا کہ کتاب ماضی کی تھوڑی ورق گردانی کر لی جائے تاکہ یہ سمجھنا آسان ہو جائے کہ بہ حیثیت مدیر جناب محبوب الرحمٰن فاروقی کا دورِ ادارت کیسا رہا اور یہ بھی کہ انھوں نے آجکل کو معیاری لحاظ سے ایک کامیاب ادبی رسالے کے طور پر متعارف کرانے کے لیے کیا کچھ کیا؟

واقعہ یہ بھی ہے کہ ماہنامہ 'آجکل' کی ادارت کی ذمے داری جناب محبوب الرحمٰن فاروقی نے ایسے عہد میں سنبھالی، جبکہ اردو دنیا میں کھوٹے سکوں کو رواج دینے کی متوازی کوشش خوب خوب ہو رہی تھی جبکہ دوسری جانب بہ وجوہ اردو ادب کی محترم شخصیتیں حاشیے پر کھڑی ہو کر ادب کے نام پر روا رکھی جانے والی 'بے ادبیوں' اور 'بے اعتدالیوں' کو بے بسی کے ساتھ دیکھ دیکھ کر کڑھ بھی رہی تھیں۔ اردو کے 'محبوب' مدیر کا کمال کہہ لیجیے یا پھر حوصلہ مندانہ کوششوں کا نمونہ کہ انھوں نے 'ابن الوقتی' اور 'تعلق پسندی' کی طویل روایت کے خاتمے کی بنیاد رکھتے ہوئے پہلی فرصت میں ایسے عناصر کو حاشیے پر پہنچانے کی حکمت عملی شروع کی، جو اب تک اردو کے رسائل وجرائد کی دنیا میں اعلیٰ مقام ومرتبہ حاصل کرنے کی خاطر تعلقات کی سیڑھیاں چڑھنے اور مفادات کے حصول کی خاطر چاپلوسیوں کو شعار بنانے میں لگے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ 'آجکل' میں بہ طور مدیر تقرر کے بعد موصوف نے سب سے پہلے ادبی تطہیر کا سلسلہ شروع کیا جو فی الواقع ان کے لیے 'سامان مصیبت' بھی ثابت ہوا۔ دھن کے پکے اور عزم کے پختہ مدیر کو اس بات کا اندازہ بالکل بھی نہیں تھا کہ 'لابنگ' میں یقین رکھنے والے عناصر اُن کے خلاف کیسی کیسی رکیک حرکتیں انجام دیں گے اور انجام کار اُن کا کیا حشر ہوگا؟

یہ واقعہ بھی کم دلچسپ نہیں کہ ایک بار دہلی کی 'نام نہاد اردو برادری' محبوب الرحمٰن فاروقی کے خلاف شکایات کا پلندہ لے کر باضابطہ وزارت اطلاعات ونشریات پہنچ گئی اور یہ شکوہ کیا گیا کہ ''پبلی کیشن ڈویژن میں 'آجکل' اردو کے مدیر کا چیمبر مسجد میں بدل گیا ہے اور جب دیکھو ایڈیٹر نماز ہی پڑھتا رہتا ہے''۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ وزیر کے دربار میں محبوب کو طلب کیا گیا اور اُن سے متذکرہ شکایت کی بابت وضاحت مانگی گئی۔ مرحوم نے جو جواب دیا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ''مسجد چونکہ دور ہے، اس لیے ڈیوٹی کے اوقات میں مسجد جانے سے دفتری امور میں رُکاوٹ آسکتی ہے، لہٰذا آنے جانے میں وقت برباد نہ ہو، اس لیے نماز کے اوقات میں دفتر کے اندر ہی دوگانہ ادا کرتا ہوں''۔ اس جواب سے شکایت کنندگان کی سازش اُلٹی پڑ گئی کیونکہ دہلی کی ''نام نہاد اردو برادری' کو

وزیر کی ناراضگیوں کا سامنا کرنا پڑ گیا۔

قصہ مختصر یہ کہ ادب کی وادی کو خالص اعلیٰ ادبی اقدار سے متصف کرنے کی سعی کے طور پر جناب محبوب الرحمٰن نے ایک ایسا پیمانہ آجکل کے لیے وضع کیا جو حقیقی فنکاروں کے تئیں طمانیت کا باعث تو بنا لیکن دوسری جانب 'اردو کی مخصوص ادبی لابی' کے لیے یہی صورت حال پریشان کن بھی بن گئی۔ یوں مدیر آجکل کو تختۂ مشق بنانے کی ایک بار نہیں بلکہ کئی بار کوشش کی گئی، تاہم ادب کی دنیا کو مکروفریب سے پاک وصاف کرنے کا ارادہ رکھنے والے اُردو کے 'محبوب' مدیر کے خلاف سازش کا جال بننے

محبوب الرحمن فاروقی 'آجکل' میں اداریہ نویسی کے موجد بھی کہلاسکتے ہیں کیونکہ فاروقی کی آمد سے قبل تک 'آجکل' میں باضابطہ اداریہ کی اشاعت کا رواج نہ تھا۔ یوں سمجھیے کہ فاروقی نے پابندی کے ساتھ اداریہ کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا، بلکہ سچ تو یہ بھی ہے کہ 'آجکل' کے اداریوں کو آگے چل کر غیر معمولی پذیرائی بھی حاصل ہوئی۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی رہی کہ 'آجکل' کے اداریوں کے ذریعے انھوں نے متواتر ایسی تحریریں نذر قارئین کیں، جنھیں صحتمند اداریہ نویسی کے باب میں قابل قدر اضافہ قرار دینا مناسب ہوگا۔

والے مفاد پرست عناصر کو اُس وقت منہ کی کھانی پڑ گئی، جب مفسدین کے تمام تر ہتھکنڈوں کا فاروقی کی 'ادبی صحت' پر کچھ بھی اثر نہ ہوا اور انجام کار محاذ آرائی کرنے والے لوگوں کو پشیمانی بھی جھیلنی پڑ گئی۔

سچ تو یہ بھی ہے کہ 'آجکل' اور 'مدیر آجکل' کے تعلق سے روا رکھے جانے والے ناروا سلوک سے وہ لوگ بہت زیادہ کبیدہ خاطر ہوئے، جو اعلیٰ ادبی اقدار کے تحفظ میں یقین رکھتے تھے۔ یہی وجہ رہی کہ جب 'محبوب' سے 'رقابت' یا ادبی مخاصمت کا سلسلہ دراز ہوا تو دہلی کے معروف رسالہ 'افکار ملی' نے خاموشی توڑی۔ اس ضمن میں جناب ارشد کمال نے اپنے کالم 'یہ دلی ہے' میں 'قصہ مدیر 'آجکل' کے تبادلہ کا' کا عنوان قائم کرتے ہوئے اس افسوس ناک صورت حال کا جائزہ نہایت صاف گوئی کے ساتھ ان الفاظ میں لیا:

''دہلی سے شائع ہونے والا ماہنامہ 'آجکل' (اردو) بنیادی طور پر ادبی رسالہ ہے لیکن برا ہو چند سیاسی بازی گروں کا کہ ان کے طفیل یہ رسالہ ان دنوں ادب سے زیادہ سیاسی حلقے میں موضوع بنا ہوا ہے۔ کسی رسالے کا موضوع بحث بننا کوئی بری بات نہیں بشرطیکہ اس طرح کے مباحث میں ذاتی بغض وعناد کارفرما نہ ہو۔ 'آجکل' کے سلسلے میں ہونے والی موجودہ بحث میں اصول نام کی کسی چیز کو دخل نہیں۔ بلکہ محض ذاتی پرخاش کے سبب اس مسئلے کو دانستہ طور پر اتنا طول دیا گیا کہ انتہائی افسوسناک انداز میں رسالے کے مدیر محبوب الرحمٰن فاروقی کا تبادلہ ہوگیا اور کیوں نہ ہوتا کہ اس بحث کو طول دینے والوں کا اصل منشا بھی یہی تھا۔''

جناب ارشد کمال کے متذکرہ کالم میں جس طرح حقیقی صورت حال کو سمجھنے اور اسے نذر قارئین کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اُسے مثالی بھی کہا جاسکتا ہے کیونکہ ارشد کمال نے نہایت صاف گوئی کے ساتھ جناب محبوب الرحمٰن فاروقی کے خلاف سازش رچنے والے عناصر کو بے نقاب کیا۔ غالباً یہی وجہ رہی کہ آخرکار تبادلے کے کچھ ہی دنوں بعد 'آجکل' کی ادارت دوبارہ محبوب الرحمٰن فاروقی کے سپرد کردی گئی اور یوں جناب فاروقی نے اپنی ادارتی ذمے داری بحسن وخوبی نبھائی۔ آجکل کے مدیر کی حیثیت سے اپنی ملازمت کی بقیہ میعاد کی تکمیل اور انتہائی باعزت انداز میں موصوف کی سبکدوشی اس خیال کو تقویت پہنچانے کے لیے کافی ہے کہ بہ طور مدیر 'آجکل' کو معیاری لحاظ سے تندرستی وتوانائی بخشنے کے لیے موصوف نے روایتی ڈگر سے ہٹ کر جو تجربات کیے، اُنھیں فراموش یا مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ پیش رو مدیروں کی بعض اہم خصوصیات سے روشنی حاصل کرتے ہوئے جناب فاروقی نے اپنے منفرد انداز میں 'آجکل' کی ادبی بزم آراستہ کی، جہاں نوآموز قلمکاروں کے لیے گنجائش پیدا کرنے کے ساتھ ہی ساتھ کہنہ مشق فنکاروں کو مناسب مقام ومرتبہ بخشنے کی بھی سعی کی گئی۔ یعنی تعلقات کی بنیاد پر 'آجکل' کے صفحات کو مخصوص لوگوں کے لیے کشادہ کردینے اور دوسروں کے تئیں غیر فراخدلانہ رویہ اختیار کرنے کی نامناسب روایت کا ایک طرح سے خاتمہ ہوگیا۔ نتیجتاً ماہنامہ 'آجکل' کو دنیائے ادب میں ایک معیاری رسالے کے طور پر شناخت ہی نہیں ملی بلکہ اہل نظر کو ان دنوں اس رسالے کی غیر جانبداری کی قسمیں کھانے میں بھی کسی طرح کی ہچکچاہٹ کا احساس نہیں ہوا۔ گویا ماہنامہ آجکل کو ایک غیر جانبدار رسالے کے طور پر وادیٔ ادب میں شہرت دلانا موصوف کی سب بڑی مدیرانہ خوبی کہلاسکتی ہے کیونکہ سرکاری تعاون سے شائع

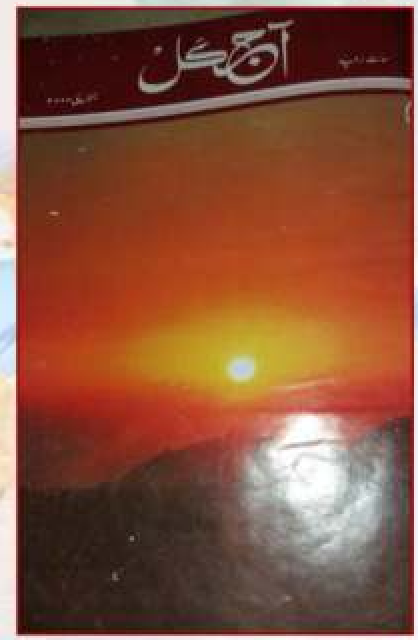

ہونے والے کسی بھی ادبی رسالے کو عموماً غیر جانبدار تصور نہیں کیا جاتا۔ ایسے روایتی پس منظر میں (محبوب الرحمٰن فاروقی کا دورِ ادارت) 'آجکل' کا غیر جانبدارانہ کردار واقعی ستائش کا محتاج ہی نہیں بلکہ قابل قدر اور لائق تقلید بھی قرار پاتا ہے۔ فاروقی سے درجنوں معاملات میں اختلاف رائے کی گنجائش موجود ہے تاہم جس اخلاص کے ساتھ انھوں نے ایک سرکاری رسالے کو بین الاقوامی سطح پر وقار بخشنے کی کوشش کی، اُس کا اعتراف نہ کرنا بڑی بے ایمانی ہوگی۔

محبوب الرحمٰن فاروقی 'آجکل' میں اداریہ نویسی کے موجد بھی کہلا سکتے ہیں کیونکہ فاروقی کی آمد سے قبل تک 'آجکل' میں باضابطہ اداریہ کی اشاعت کا رواج نہ تھا۔ یوں سمجھیے کہ فاروقی نے پابندی کے ساتھ اداریہ کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا، بلکہ سچ تو یہ بھی ہے کہ 'آجکل' کے اداریوں کو آگے چل کر غیر معمولی پذیرائی بھی حاصل ہوئی۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی رہی کہ 'آجکل' کے اداریوں کے ذریعے انھوں نے متواتر ایسی تحریریں نذر قارئین کیں، جنھیں صحتمند اداریہ نویسی کے باب میں قابل قدر اضافہ قرار دینا مناسب ہوگا۔ یہی سبب ہے کہ اہل نظر نے محبوب الرحمٰن فاروقی کے اداریوں کو رسالے کی جان بھی تصور کیا۔ واقعہ یہ بھی ہے کہ معتدل، متوازن اور تعمیری

فکر و خیال کو صفحۂ قرطاس پر لانے کی یہ ادارتی کوشش مثالی بھی کہلا سکتی ہے، کیونکہ بہ شکل اداریہ محبوب الرحمٰن فاروقی کی جو تحریریں منصہ شہود پر آئیں، اُن میں زبان و بیان کی بلاغت کے علاوہ موضوعاتی تنوع بھی موجود ہے۔ مدیرانہ لیاقت اور ادیبانہ شعور کا عکس بھی نمایاں ہے۔ یہی نہیں بلکہ انکساری و خاکساری کی رمق کی موجودگی کے ساتھ ہی ساتھ بزرگ ادبا و شعرا کے تئیں اظہار عقیدت کا نظریہ بھی کارفرما ہے۔ بطور مثال ذیل میں جناب محبوب الرحمٰن کے ایک اداریہ کا طویل اقتباس پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا، جو انھوں نے جناب کالی داس گپتا رضا کی رحلت کے بعد تحریر کیا تھا۔ جون 2001 کے آجکل کے اداریے میں موصوف رقمطراز ہیں:

''ان سے میری ایک زمانے کے بعد تجدید ملاقات تین سال پہلے ہوئی۔ وہ خود ہی دفتر میں آکر تپاک سے ملے۔ انھیں دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی اور شرم سے پانی پانی ہوگیا۔ ایک صاحب علم، علم سے بے بہرہ کے سامنے بیٹھا تھا۔ پانی پانی ہونے کے علاوہ کیا چارہ تھا۔ انکساری سے انھوں نے پوچھا کہ اگر میں کوئی مضمون دوں تو آپ شائع کریں گے۔ انھیں کیا خبر کہ جس انکسار سے وہ بات کررہے ہیں وہ مجھ جیسے سیکڑوں رسالے کے مدیروں کے لیے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ہوگی۔ یہ تو ان کا مجھ پر ذاتی کرم اور رسالے پر احسان ہوگا۔ احسان کے بوجھ سے دبتے ہوئے میں نے کہا کہ آپ کو مجھ سے یہ پوچھ کر مجھے شرمندہ نہیں کرنا چاہیے۔ انھوں نے کہا میں محقق ہوں۔ آپ کے قارئین خالص تحقیقی مضامین شاید پسند نہیں کرتے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا کوئی مضمون یہاں سے واپس ہوگیا تھا اور پھر انھوں نے پانچ چھ سال سے 'آجکل' کو کچھ نہیں بھیجا لیکن وہ اس کے ہر شمارے کا مطالعہ لازماً کرتے تھے۔ پھر اس کے بعد ان کی محبتوں، نوازشوں کا جو سلسلہ شروع ہوا اسے سمیٹنے کے لیے میرا دامن تنگ پڑ گیا۔ جب کبھی وہ دلی آتے مجھ پر کرم فرمائی ضرور کرتے۔ دفتر کے ہر شخص سے فرداً فرداً ملتے، سب کی خیریت پوچھتے۔...... ان ملاقاتوں میں مجھے جناب کالی داس گپتا رضا صاحب کو بہ حیثیت شاعر، بہ حیثیت ناقد، بہ حیثیت عالم، بحیثیت قدردان اور بہ حیثیت انسان جو تمام انسانی خوبیوں سے متصف ہو، دیکھنے اور سمجھنے کا بارہا موقع ملا اور میں نے پہلی بار دیکھا کہ علم کیسے انسان کے اندر انکسار پیدا کرتا ہے۔ میں ان کے علم کے دریا کے سامنے ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔ ان کے پاؤں کی دھول بھی نہیں تھا۔ تاہم میری حقیر رائے کو بھی وہ مقدم جانتے، اس کا لحاظ کرتے۔ میری مجبوریوں کا بھی انھیں علم تھا، وہ اس کا بھی پاس کرتے۔ ازراہ مذاق یہ بھی کہتے کہ ہمارا آپ کا صرف اس دنیا میں ساتھ ہے آپ کے عقیدے کے مطابق عقبیٰ میں ہماری جدائی ہوجائے گی۔ میں انھیں کیا جواب دیتا سوائے اس کے کہ حشر کی باتیں مالک حشر ہی جانے۔ اسی مالک حشر نے آج ایک مخلص ترین شخصیت سے محروم کردیا۔ جس کے محرومی کے تصور سے میرا دل کل سے ہی دھڑک رہا تھا۔...... جناب رضا صاحب گوناگوں شخصیت کے حامل تھے۔ اردو شاعروں کے مزاج کے خلاف وہ بہت بڑے تاجر بلکہ بینکر بھی تھے۔ کھاتہ بہی دیکھتے وقت فی البدیہہ شعر کہنا ان کی فطرت میں شامل تھا۔ وہ بلند پایہ محقق تھے، ماہر غالبیات میں ان کا شمار ہوتا تھا بلکہ موجودہ دور میں غالب کے بارے میں ان کی ہر بات قول صادق ہوتی۔ ساٹھ سے زیادہ کتابوں کے مصنف تھے۔ جن میں سے اکیلے غالب کے سلسلے میں ان کی تقریباً 20 کتابیں ہیں۔ غالب کے علاوہ چکبست اور داغ بھی ان کی تحقیق کی جولانگاہ تھے۔ وہ ایسے نثار

اور ان کی کفالت بھی یہ کرتے رہے۔ پچھلی بار جب ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے باتوں باتوں میں مسکراتے ہوئے بتایا کہ تجارت میں ان کا کروڑوں کا نقصان ہوگیا ہے۔ ایسا کہتے وقت ان کی پیشانی پر کوئی بل نہیں آیا۔ بس اتنا ہی کہا مالک نے بہت کچھ دیا ہے تجارت میں نفع نقصان لگا ہی رہتا ہے۔ اردو کے وہ مجاہد تھے۔ پچھلے سال جب بمبئی کے ادیبوں شاعروں نے جلوس نکالا تو سردار جعفری کے ساتھ وہ بھی اس کی قیادت کررہے تھے۔ اردو کا کوئی کاز ہو وہ اس کے لیے ہروقت تیار رہتے۔ نام ونمود اور شہرت کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ انھیں بہت سے انعامات ملے جو رضا صاحب کی شخصیت اور خدمت کے شایان شان نہیں سمجھی جاسکتیں۔ انھیں ملنے والے انعامات کی مجموعی رقم اس رقم کی چوتھائی کے برابر بھی نہیں جو انھوں نے کتابوں کو اکٹھا کرنے اور خریدنے میں خرچ کی ہیں۔ ان کے ذاتی کتب خانے میں 47000 سے زائد کتابیں ہیں جن میں تقریباً چارسو سے زائد صرف دیوان غالب کے مختلف ایڈیشن ہیں۔ اپنی کتابیں انھوں نے خود

بہ شکل اداریہ محبوب الرحمن فاروقی کی جو تحریریں منصہ شہود پر آئیں، اُن میں زبان و بیان کی بلاغت کے علاوہ موضوعاتی تنوع بھی موجود ہے۔ مدیرانہ لیاقت اور ادیبانہ شعور کا عکس بھی نمایاں ہے۔ یہی نہیں بلکہ انکساری و خاکساری کی رمق کی موجودگی کے ساتھ ہی ساتھ بزرگ ادبا و شعرا کے تئیں اظہار عقیدت کا نظریہ بھی کارفرما ہے۔

تھے جن کی نثر معیار سمجھی جاتی۔ وہ چلتے پھرتے انسائیکلوپیڈیا تھے۔ کسی حرف کسی لفظ کے بارے میں پوری پوری تفصیل اشعار کے حوالے سے بتاتے۔ وہ شطرنج کے ماہر کھلاڑی بھی تھے اور کلاسیکی میوزک میں بھرپور دسترس رکھتے تھے۔ 9 شعری مجموعے اردو میں اور دو انگریزی میں انھوں نے چھوڑے ہیں۔ شعر کی ہر صنف پر انھیں دسترس حاصل تھی۔ غزلیں، نظمیں، گیت، بھجن، مراثی، رباعیات سبھی کچھ ان کے مجموعوں میں شامل ہیں۔ دو شعری مجموعے صرف نعت، حمد اور دیگر اسلامی موضوعات پر مشتمل ہیں۔ ان کی رواداری اس کی متحمل نہیں تھی کہ وہ انسان انسان میں فرق کریں۔ بلا تفریق مذہب و ملت وقت ضرورت یتیموں، بے یار و مددگار، طالب علموں، بے سہارا بیواؤں اور کنواری لڑکیوں کے والی اور سرپرست بن کر ان کی شادی کے اخراجات خود اٹھانا ان کی فطرت میں شامل تھا۔ جس کی انھوں نے کبھی کوئی پبلسٹی نہیں کی۔ اردو کے بہت سے ادیب اور شاعر ان کے دامن سے وابستہ رہے

شائع کیں، کسی سے کوئی مدد نہیں لی۔ ظاہری بات ہے کہ اپنی کتاب چھاپ کر تقسیم کرنا یہ کارزیاں اگر نہیں تو اور کیا ہے؟ لیکن اس زبان، جس میں ان کی اپنی کتابیں نہیں بکتی تھیں، کی خدمت میں رات دن لگے رہنا اسے جنون نہیں تو اور کیا کہیں گے۔ وہ دل کے عارضے میں مبتلا تھے۔ اور اسی دل کے عارضے نے ان کا کام دلی کے ایک ہوٹل میں تمام کردیا۔ ان کے ایک ایک شعر نے ان ہی کی آرزوؤں کی تعبیر پوری کردی:

کوئی شریان کٹے کوئی کلیجہ پھٹ جائے
یہ لہو کب سے مرا درد لیے گھومے ہے

وہ لہو اب سرد پڑ گیا، درد ختم ہوگیا اور وہ کاروبار زیست سے نجات پاگئے۔ وہ کہہ سکتے ہیں:

شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

وہ 1925 میں جالندھر کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی اور وہیں سے شعر گوئی کا آغاز بھی کیا اور داغ دہلوی کے شاگرد ابوالفصاحت جوش ملسیانی

کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ بغرض تجارت جنوبی افریقہ چلے گئے۔ 17 سال وہاں گزارنے کے بعد ہندوستان لوٹ آئے اور بمبئی میں سکونت اختیار کرلی۔ اس دوران وہ دنیا کے مختلف ممالک میں سفر بھی کرتے رہے۔ وہ 22 مارچ کو پدم شری ایوارڈ حاصل کرنے دلّی آئے ہوئے تھے اور یہیں دل کے سخت دورے کے سبب اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی''۔

متذکرہ بالا اداریہ کے طویل اقتباس کو پڑھتے ہوئے بہ خوبی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جناب کالی داس گپتا رضا جیسی غیر معمولی شخصیت کو بھی مفاد پرست عناصر کی سازشوں کا شکار بننا پڑا تھا اور یوں اُن کی تحریروں کو بھی ناقابل اشاعت قرار دے کر ادارہ آجکل کے ذریعے واپس کردیا گیا تھا، تاہم جب محبوب الرحمٰن فاروقی نے آجکل کے مدیر کے طور پر ذمے داری سنبھالی تو رضا صاحب کا ایک بار پھر 'آجکل' سے قلمی رشتہ استوار ہوگیا۔ کالی داس گپتا رضا کی رحلت کے حوالے سے جناب محبوب الرحمٰن فاروقی کا متذکرہ بالا اداریہ اس لحاظ سے خاصا معلوماتی بھی ہے کہ موصوف نے نہ صرف یہ کہ اُن کی عالمانہ شخصیت کا نقشہ کھینچا ہے بلکہ ساتھ ہی ساتھ گپتا کی انسان دوستی اور دیگر خصلتوں کو بھی نمایاں کیا ہے۔

محبوب الرحمٰن فاروقی نہ صرف یہ کہ اعلیٰ ادبی اقدار کے تحفظ کے لیے ہمیشہ ہی کوشاں رہے بلکہ سچی بات تو یہ بھی ہے کہ موصوف ادب کے ساتھ ساتھ زبان کے تحفظ کے تئیں بھی فکر مند رہے، جس کا کھلا اظہار اُن کی تحریروں میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اُردو زبان کی بقاء اور تحفظ کا مسئلہ جب جب سامنے آیا، موصوف نے خاموش رہنا گوارا نہیں کیا۔ معاملہ خواہ اردو کی تعلیم کو رواج دینے سے متعلق ہو یا پھر اردو کی درسی و غیر تدریسی کتابوں کی عام قارئین تک رسائی کا ایشو ہو، فاروقی اپنی تحریروں کے ذریعے اکثر اوقات اردو کے وکیل کے طور پر جلوہ گر دکھائی دیتے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کی اردو نوازی کی ایک جھلک یہاں پیش کردی جائے۔ فاروقی اپریل 1999 کے آجکل کے اداریہ میں کچھ یوں رقمطراز ہیں:

''یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جو کسی مخصوص علاقے میں محدود نہیں۔ اس کے بولنے والے اور پڑھنے والے ہندوستان کے ہر گوشے میں کم وبیش زیادہ یا کم تعداد میں موجود ہیں اور شہروں سے زیادہ قصبوں اور دیہی علاقوں میں ان کی اکثریت پائی جاتی ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تقریباً سبھی بڑے قصبوں اور دیہاتوں میں ایسے مدارس بھی موجود ہیں جہاں اردو کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن یہ سبھی مدرسے اور علاقے شہروں سے دور مضافات میں پائے جاتے ہیں اور آج اردو بولنے والوں کی بڑی اکثریت بڑے شہروں سے نکلنے والے رسائل یا شائع ہونے والی کتابوں کے نام سے بھی واقف نہیں ہو پاتی۔ آج ہندوستان کی سبھی بڑی اور علاقائی زبانوں میں ناشرین اور مصنّفین کے اندر یہ احساس جاں گزیں ہوگیا ہے کہ کتابوں اور رسائل کی اشاعت کو بڑھانے کے لیے یہ لازمی ہوگیا ہے کہ ہم ان علاقوں تک اپنے رسائل اور کتابیں پہنچائیں۔ جہاں ان کے پڑھنے والے موجود ہوں۔ ویسے بھی یہ دور صارفین کا دور ہے اور صارفین کی ضرورتوں کا خیال رکھ کر اب بڑے بڑے تجارتی ادارے بھی اپنے سامانوں کو نمائندوں کے ذریعے گھر گھر میں پہنچانے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کررہے ہیں۔ وہ نہ صرف بازار کے مقابلے سستے داموں پر اپنا سامان دیتے رہے ہیں بلکہ اس کے لیے کچھ مزید رعایتیں اور انعامات بھی رکھتے ہیں۔ میں بارہا ان کالموں میں لکھ چکا ہوں کہ وقت آگیا ہے کہ ہمارے ناشرین اور مصنّفین بڑے شہروں سے نکل کر قصبوں اور دیہی علاقوں پر توجہ دیں تاکہ نہ صرف فروخت میں اضافہ ہو بلکہ لوگوں کی واقفیت میں اضافہ ہو۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کتابوں کی دکانیں عام دکانوں کی طرح نہیں ہوتیں جہاں سے لوگ تماشہ دیکھ کر دامن جھٹک کر آگے بڑھ جاتے ہیں، بلکہ کتابیں اپنے خریداروں کو خود متوجہ کرتی ہیں، بلاتی ہیں اور خریدنے پر اکساتی ہیں۔''

جناب محبوب الرحمٰن فاروقی کی متذکرہ بالا تحریر کو پڑھنے کے بعد ہر کوئی بہ خوبی یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ اُردو زبان کی نشر و اشاعت کے حوالے سے اُن کا موقف کیا تھا؟ واقعہ یہ بھی ہے کہ اردو زبان کی بقا و تحفظ کے حوالے سے اُن کی مخلصانہ کوششوں کو مسترد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ مرحوم کی ادارت میں منظرِ عام پر آنے والے 'آجکل' کے درجنوں شماروں میں اُن کی فکر انگیز تحریریں بہ شکل اداریہ موجود دکھائی دیتی ہیں، جن سے اُن کے خلوص کا پتہ چلتا ہے۔

مجموعی لحاظ سے یہ رائے قائم کرنے میں ہم حق بہ جانب ہیں کہ جناب محبوب الرحمٰن فاروقی کا دورِ ادارت 'آجکل' کے معیار کی بلندی کا ہی ضامن نہیں رہا بلکہ ایک معیاری ادبی رسالے کے مدیر کی حیثیت سے جب بھی ضرورت درپیش ہوئی، انھوں نے اردو کے وسیع تر مفادات کے لیے آواز بلند کرنا واجب سمجھا۔ فاروقی کا یہ طرزِ عمل اردو کے مدیروں کے لیے سبق آموز بھی ہے کیونکہ انھوں نے کسی سے مرعوب ہوئے بغیر اُردو نوازی کا ثبوت پیش کیا۔ اُردو زبان و ادب کی ہمہ گیر ترقی واستحکام کو اپنی زندگی کا نصب العین تصور کرنے والے جلیل القدر فنکار کو خراج عقیدت پیش کرنے کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا کہ ہم بھی اُردو دوستی کا اُسی طرح ثبوت دیں، جس طرح کی اُردو نوازی کی عملی شکل مرحوم نے پیش کی۔

■

محبوب الرحمٰن فاروقی نہ صرف یہ کہ اعلیٰ ادبی اقدار کے تحفظ کے لیے ہمیشہ ہی کوشاں رہے بلکہ سچی بات تو یہ بھی ہے کہ موصوف ادب کے ساتھ ساتھ زبان کے تحفظ کے تئیں بھی فکر مند رہے، جس کا کھلا اظہار اُن کی تحریروں میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اُردو زبان کی بقاء اور تحفظ کا مسئلہ جب جب سامنے آیا، موصوف نے خاموش رہنا گوارا نہیں کیا۔

جناب محبوب الرحمٰن فاروقی کا دورِ ادارت 'آجکل' کے معیار کی بلندی کا ہی ضامن نہیں رہا بلکہ ایک معیاری ادبی رسالے کے مدیر کی حیثیت سے جب بھی ضرورت درپیش ہوئی، انھوں نے اردو کے وسیع تر مفادات کے لیے آواز بلند کرنا واجب سمجھا۔ فاروقی کا یہ طرزِ عمل اردو کے مدیروں کے لیے سبق آموز بھی ہے کیونکہ انھوں نے کسی سے مرعوب ہوئے بغیر اُردو نوازی کا ثبوت پیش کیا۔

Md.Sharafat Ali
Hindustan Express Urdu Daily
G79,Kalindi Kunj
Abul Fazal Encalve Part-II
Jamia Nagar, New Delhi-110025

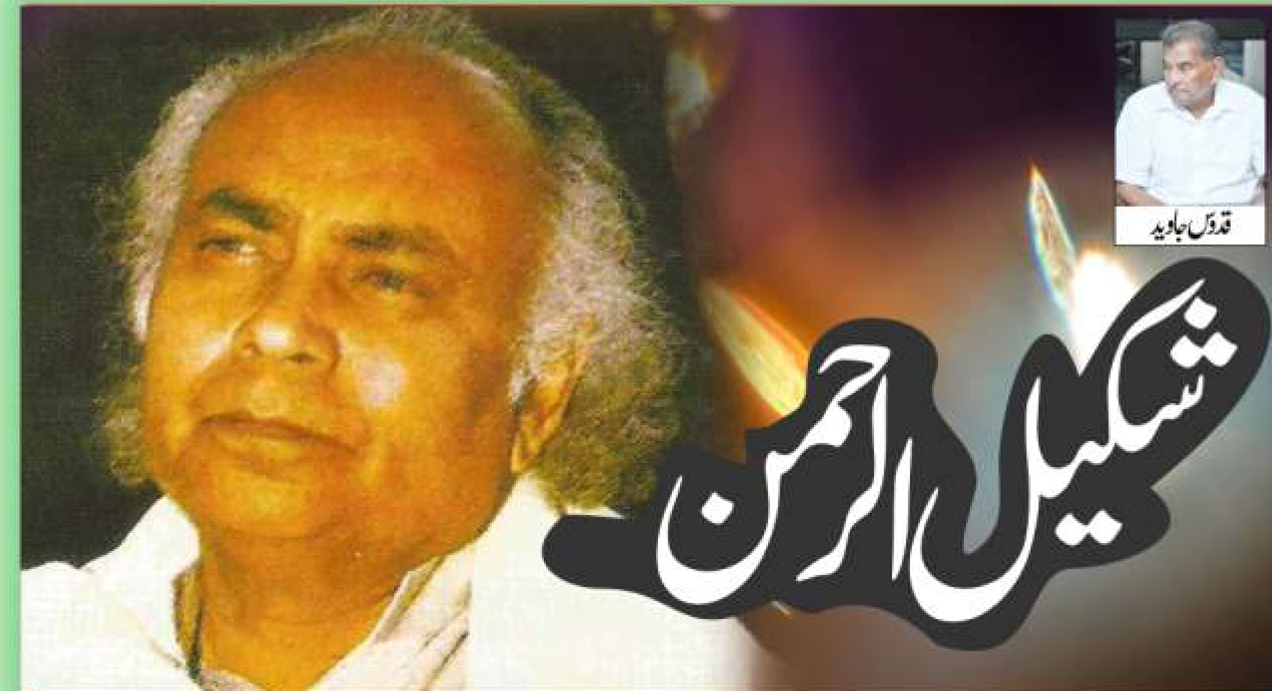

قدوس جاوید

شکیل الرحمن

شکیل الرحمن : اگر 'شکیل الرحمن' کے سانچے میں ڈھلے، اور اردو تنقید میں شکیل و جمیل زاویوں کا اضافہ کیا تو اس کا سبب ان کی فطری، سیکولر اور جمال پسند نفسیات کے علاوہ، کشمیر میں ان کا طویل المدتی قیام بھی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک سچ ہے کہ اگر شکیل الرحمن کا ورود اس وادی میں نہ ہوا ہوتا تو شاید 'نیا کشمیر' میں اردو زبان و ادب کا فروغ اس رفتار اور معیار سے نہ ہوا ہوتا، جس رفتار اور معیار سے کشمیر میں اردو زبان و ادب کی نشر و اشاعت، ڈاکٹر شکیل الرحمن کی آمد کے بعد ہوئی۔ آج اگر ریاست جموں و کشمیر کو بھی اردو زبان و ادب کا ایک اہم مرکز تسلیم کیا جاتا ہے تو اس کے پس پشت شکیل صاحب کی برسوں کی محنت ہے۔ ریاست جموں و کشمیر میں اردو کی عوامی مقبولیت کی شہادتیں آج کشمیر کے گاؤں گاؤں میں ملتی ہیں۔ شکیل الرحمن کے شاگردوں اور ان شاگردوں کی ذریات اس ریاست کے تینوں خطوں جموں، کشمیر، اور لداخ میں آج بھی اردو زبان و ادب کی آبیاری میں مصروف ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ شکیل الرحمن نے 'پٹنہ یونیورسٹی' سے اعلیٰ تعلیمی سندیں حاصل کی تھیں۔

پروفیسر شکیل الرحمن کو ان کی ادبی خدمات کے لیے ہند و پاک کے کئی اداروں کی جانب سے ایوارڈ دیے گئے ہیں۔ موصوف کئی یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر بھی رہے۔ شکیل الرحمن نے کم و بیش پچاس کتابیں تصنیف کیں، خود شکیل الرحمن کی شخصیت اور ادبی خدمات پر ایک درجن کے قریب کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ریاست جموں و کشمیر کی پانچ ہزار سالہ تاریخ، ہندو مسلم اساطیر اور 'آرکی ٹائپس' خدا مرکز فکر و فلسفہ، تصوف اور بھکتی، انسان دوستی، مذہبی رواداری اور علم و آگہی کی روایات کے جذب و انجذاب سے عبارت ہے۔ اس اعتبار سے، گوتم بدھ اور حضرت شیخ شرف الدین یحیٰ منیری کی سرزمین بہار کی خاک سے اٹھنے والے شکیل الرحمن کی شخصیت اور فن کی زمین کو آسمان کرنے میں کشمیر کا بھی اہم کردار رہا ہے۔ شکیل الرحمن کے خمیر میں رومانیت، روحانیت تو ابتدا سے ہی تھی لیکن کشمیر میں، از کاہ تا کوہ، اور قطرہ سے لے کر دریاؤں، چشموں اور جھیلوں تک حسن فطرت کی جلوہ آرائیوں نے ان کے وجود میں حسن و جمال کی شمعیں روشن کر دیں۔ ساتھ ہی سنسکرت، فارسی اور کشمیری علما و فضلا اور صوفیا و اولیائے کرام کے کارناموں نے شکیل الرحمن کے دیدۂ بینا میں وہ نگاہ شوق بھی پیدا کر دیا جس کے فیض سے انھیں مشرقی، خصوصاً ہندوستانی تہذیب، تاریخ، نفسیات اور فنون لطیفہ کی دنیاؤں کے اسرار و رموز اور امکانات و امتیازات کی تہوں اور طرفوں کو کھولنے میں انھیں ہمیشہ رہنمائی ہی حاصل ہوتی رہی۔ اگر شکیل الرحمن کی شخصیت ادب اور زندگی کو ان کے 'کُل' (Totality) میں سمجھنا ہو تو، وجود آدم، تخلیق کائنات، ادب و ثقافت، مذہب اور نفسیات، بندہ اور خدا اور جسم اور روح کی عام، رسمی اور مروجہ توضیحات کے وسیلے سے نہیں سمجھا جا سکتا۔

شکیل الرحمن کا وجود، کسی 'اودھت' غیر معمولی صوفی سائیں یا جوگی کی طرح 'بھیدوں' بھرا وجود تھا۔ شکیل الرحمن (غالباً) جسم اور روح کے اتصال کے قائل تھے۔ جسم کے اندر روح کو بیدار اور متحرک کرنے کے امکان پر ان کا یقین تھا پورے وجود کے ساتھ محبت، بندگی یا عبادت کا مطلب ہی جسم اور روح کا اتصال Possession ہے۔ شکیل الرحمن خود کو ہی نہیں دوسروں کو بھی اپنا تابع بنانے، اپنے وجود میں شامل کرنے کی قوت رکھتے تھے۔ سمجھنے کے لیے اسے Messmerism بھی کہہ سکتے ہیں۔ Mystical Experience سے لے کر Sexual Experience تک جسم ہی روح میں تحلیل ہوتا ہے اگر روح بیدار ہو۔ ''عام معمولی خواہشوں سے 'تجربہ' حاصل نہیں ہوتا، خواہشوں کو وجود کی آنچ پر تپانا ہوتا ہے پھر ایسی آرزوئیں جنم لیتی ہیں جو 'تجربے' بخشتی ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ شکیل الرحمن کے بارے میں کشمیر میں مشہور تھا کہ 'وہ روحوں سے باتیں کرتے اور کرواتے ہیں۔ ان کی مبینہ روحانی قوتوں کی وجہ سے ہی لوگ انھیں 'بابا سائیں' بھی کہا کرتے تھے۔ شکیل صاحب اپنے بعض ذاتی خطوط میں اپنے نام کی جگہ 'بابا سائیں' ہی لکھا کرتے تھے، واللہ اعلم بالصواب۔

شکیل الرحمن سنہ 1953 میں بہار سے کشمیر آئے اور گویا کشمیر کے ہی ہو کر رہ گئے۔ کم و بیش چالیس سالہ قیام کے دوران شکیل الرحمن نے کشمیر کو بڑی گہرائی سے دیکھا، سوچا اور برتا ہے۔ شعوری یا لاشعوری طور پر، اردو ادب کے جمالیاتی مطالعے کا 'محرک خاص' (Dominat) کشمیر بھی رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کشمیر اپنے حسن و جمال کے لیے ایک عالم میں جتنا مشہور ہے اس سے کہیں زیادہ

علم وعرفان کے بے مثل مرکز کی حیثیت سے بھی یہ سر زمین اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ سنسکرت زبان و ادب کے حوالے سے گراں قدر تصنیفات کشمیر قدیم میں ہی لکھی گئیں۔

(یوں تو سنسکرت زبان میں تصنیف و تالیف کے اصول وقواعد کے حوالے سے 'پاننی' (چار سو سال قبل مسیح) کی شہرہ آفاق تصنیف 'اشٹ ادھیائے' آج بھی علم اللسان کے تعلق سے ایک معجزہ تسلیم کی جاتی ہے، کہا جاتا ہے کہ ''سورج مغرب سے طلوع ہوسکتا ہے لیکن پاننی کا لکھا ہوا غلط نہیں ہوسکتا۔'' لیکن سنسکرت شعریات و جمالیات پر سب سے زیادہ کام کشمیر کی وادی میں ہی ہوا۔ اس ضمن میں ابھینو گپت، آنند وردھن، ممٹ وغیرہ برہمن مفکرین کے کارنامے لازوال ہیں ان کے ساتھ ہی بودھ اور جین دانشوروں ون ناگ، ناگ ارجن، بھامہ، اور دنڈن وغیرہ نے لفظ و معنی کے رشتے اور شاعری میں الفاظ کے برتاو کے سبب، صوت و آہنگ، تاثر اور کیفیت کے حضور اور غیاب سے متعلق جو ہمہ جہت عالمانہ بحثیں کی ہیں، شکیل الرحمٰن کی تحریروں میں ان کے سائے جگہ جگہ رقص کناں نظر آتے ہیں۔ اسی طرح سنسکرت اور کشمیری کے بعد انیسویں صدی کے اخیر تک اس ریاست کی سرکاری، درباری اور علمی و ادبی زبان کی حیثیت سے فارسی کا بول بالا رہا۔ شکیل الرحمٰن نے سنسکرت فارسی اور عربی کی ایسی ساری ادبی وعلمی روایات کو اپنے اندر جذب کیا تھا۔)

آزادی کے کچھ عرصہ بعد ہی سنہ، 1953 میں شکیل صاحب ڈگری کالج بھدرک (اڑیسہ) میں لکچرر ہو گئے تھے لیکن اسی بیچ دہلی میں مولانا ابوالکلام آزاد کے سکریٹری جناب اجمل خاں صاحب نے بتایا کہ ''مولانا چاہتے ہیں کہ آپ کشمیر چلے جائیں، سو، شکیل صاحب کشمیر چلے آئے اور سرینگر کے مشہور ایس. پی. کالج میں شعبہ اردو کے سربراہ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ کشمیر یونیورسٹی کا قیام 1951 میں عمل میں آچکا تھا۔ 1958 میں ڈوگرہ راج کے جانشین ڈاکٹر کرن سنگھ، سابق صدر ریاست جموں وکشمیر نے اپنی ملکیت میں سے 'نسیم باغ' سے متصل 'حضرت بل مسجد' کے بالمقابل، سیب اور ناشپاتی کے باغات یونیورسٹی کو عطیے کے طور پر دے دیے، جہاں بعد میں یونیورسٹی کی کئی خوب صورت عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ ابتدا میں آرٹس کے چند ہی ڈیپارٹمنٹس حضرت بل کے 'نسیم باغ' میں ملکہ نور جہاں کے قائم کردہ 'ہفت چنار' کی ایک عمارت میں پڑھائے جاتے تھے۔ جب 'جموں وکشمیر یونیورسٹی' میں شعبۂ اردو قائم ہوا تو اس کی پہلی اینٹ شکیل صاحب نے ہی رکھی۔ شکیل الرحمٰن شعبہ اردو، جموں وکشمیر یونیورسٹی کے بانی اوراولین سربراہ تھے۔ ان دنوں حامدی کاشمیری ایس پی کالج میں انگریزی کے لکچرر تھے۔ شکیل صاحب نوجوان تھے اور تنہا شعبے اردو کی ساری ذمہ داریاں بحسن و خوبی انجام دے رہے تھے، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ شکیل صاحب کی صدارت بحال رکھی جاتی لیکن شیخ محمد عبداللہ نے حیدرآباد سے پروفیسر محی الدین قادری زور کو بلا کر شعبہ اردو کی صدارت سونپ دی، بعد میں شکیل صاحب اور زور صاحب کی کوششوں سے حامدی صاحب کی تقرری بھی شعبہ اردو میں ہوگئی۔ ان دنوں فیضی صاحب، جموں وکشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے کچھ عرصے بعد تلسی باغ سری نگر میں واقع سرکاری کوٹھی میں، ایک دن اچانک ہی، زور صاحب دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ شکیل صاحب پر پھر شعبہ اردو کی صدارت کی ذمے داریاں آگئیں لیکن ایک بار پھر شکیل صاحب کے ساتھ بے انصافی کی گئی اور حیدرآباد یونیورسٹی کے ہی شعبہ اردو کے سابق سربراہ پروفیسر عبدالقادر سروری کو کشمیر بلا کر شعبہ اردو کی صدارت سونپ دی گئی۔ شکیل صاحب نے صبر کیا۔ سروری صاحب برسوں اپنے منصب پر فائز رہے اور اس عرصے میں انھوں نے 'کشمیر میں اردو' جیسی معرکتہ الآرا کتاب تین جلدوں میں تصنیف کی۔

سروری صاحب نے بھی 1970 میں کشمیر میں ہی داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ان کی تدفین سرینگر کے جواہر نگر کے قبرستان میں ہوئی۔ سروری صاحب کے بعد شعبہ اردو کی صدارت ایک بار پھر شکیل صاحب کو ہی سنبھالنی پڑی۔ لیکن جب پروفیسر شپ کے لیے انٹرویو ہوا تو، مخالفین کی سازش کی وجہ سے ایک بار پھر شکیل صاحب کی حق تلفی کی گئی، ڈاکٹر محمد حسن صاحب کو پروفیسر اردو منتخب کرلیا گیا اور شعبے کی صدارت بھی سونپ دی گئی۔ شکیل صاحب سخت بددل ہوئے۔ شکیل صاحب اپنی محبتوں اور خدمات کی وجہ سے طلبا میں بے حد مقبول تھے۔ شکیل صاحب کے ساتھ ہونے والی اس زیادتی کے خلاف طلبا نے زبردست احتجاج کیا۔ شعبہ اردو کا ماحول پراگندہ ہو چکا تھا، محمد حسن بھی بددل ہو چکے تھے اور آخر کار وہ نہرو فیلو شپ پر جواہر لال یونیورسٹی چلے گئے۔ لیکن اس بار مخالفین کی ایک نہیں چلی اور شکیل الرحمٰن صاحب نے باضابطہ طور پر پروفیسر اور صدر شعبہ اردو کی ذمے داریاں سنبھالیں۔ شعبہ اردو یوں بھی شکیل صاحب کے دم سے ہی چل رہا تھا اب اس کی منصوبہ بند ترقی کی رفتار میں تیزی آئی، اور درس وتدریس اور تحقیق کا معیار بھی مزید بلند ہونے لگا۔

1983 میں شکیل صاحب کو بہار یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنا دیا گیا جب وہاں کی وائس چانسلر شپ کی مدت ختم ہوئی تو انھیں 1988 میں للت نرائن متھلا یونیورسٹی دربھنگہ کی وائس چانسلر شپ کی ذمے داریاں سونپ دی گئیں۔ دربھنگہ میں شکیل صاحب طلبا میں ہی نہیں سول سوسائٹی اور افسران میں بھی بے حد مقبول تھے اس کی وجہ ان کی بیش بہا خدمات تھیں۔ شکیل صاحب طلبا اور تعلیم کے مفاد میں، یونیورسٹی کو ہر طرح کی بدعنوانی، بدنظمی اور سیاسی دخل اندازی سے پاک کرنا چاہتے تھے۔ لیکن مقامی لیڈر اور اس وقت کے وزیر تعلیم کو یہ پسند نہ تھا۔ شکیل صاحب کسی بھی طرح کی سفارش یا دباؤ برداشت کرنے کو تیار نہ تھے شکیل صاحب اور وزیر تعلیم کا ٹکراؤ اتنا بڑھا کہ شکیل صاحب پر استعفیٰ دینے کا دباؤ ڈالا جانے لگا لیکن شکیل صاحب استعفیٰ دینے کی وجہ بتائے جانے پر اصرار کرتے رہے طلبا اور ملازمین اور عام لوگ چاہتے تھے کہ شکیل صاحب کسی بھی قیمت پر استعفیٰ نہ دیں۔ لیکن سیاست کب شکست ماننے والی تھی، گورنر گووند نرائن گور نے شکیل صاحب کو وائس چانسلر شپ سے ہٹا دیا۔ لیکن ابھی کچھ ہی وقت گذرا تھا کہ پارلیمانی انتخاب کا وقت آگیا دربھنگہ کے طلبا اور عوام وخواص نے انھیں اصرار کر کے 'جنتا دل' کا امیدوار بنایا۔ مقابلہ، ان کے کٹر مخالف ناگیندر جھا سے ہی تھا شکیل صاحب کے پاس نہ تو پیسہ تھا اور نہ سیاست کا کوئی تجربہ، دربھنگہ کے لوگوں نے خود ہی پیسے اکٹھے کیے اور سارا انتظام بھی کیا شکیل صاحب کو دربھنگہ میں لوگ 'سیکولر رحمٰن' کہتے تھے۔ الیکشن میں شکیل صاحب نے ناگیندر جھا کو اتنی بھاری اکثریت سے ہرایا کہ لوگ انگشت بدنداں رہ گئے، جب مرکز میں چندر شیکھر جی کی حکومت بنی تو پروفیسر شکیل الرحمٰن کو مرکزی کابینہ میں 'صحت عامہ اور خاندانی بہبود' Health&Family Welfare کا وزیر بنا دیا گیا۔ چندر شیکھر حکومت کے زوال کے بعد شکیل الرحمٰن نے 'گڑ گاؤں' میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

اس پیش بندی کے بعد اب شکیل الرحمٰن کی ذاتی زندگی اور گھر آنگن میں بھی جھانکنا ہوگا اور اس کے لیے راقم کو اس قصے میں 'انٹری' لینی ہوگی۔ میں 15 ستمبر سنہ 1977 کو سری نگر وارد ہوا۔ لال چوک کے ایک ہوٹل میں ٹھکانہ کیا۔ ان دنوں پروفیسر رئیس احمد کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور پروفیسر سیف الدین سوز (سابق مرکزی وزیر) رجسٹرار ہوا کرتے تھے۔ میں، 16 ستمبر 1977 کو شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی میں شکیل رحمٰن صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، انھوں نے Joining کروائی۔ اس وقت شکیل

صاحب کے چیمبر میں حامدی کاشمیری، اسد اللہ کامل اور برج پریمی ایما بھی موجود تھے کشمیر کی روایتی مہمان نوازی اور اخلاقیات کے مطابق سب نے بڑی گرم جوشی سے گلے لگا کر استقبال کیا۔ (خیر، خیریت، سفر، چائے اور دیگر دفتری رسومات کی ادائگی کے بعد شکیل الرحمٰن صاحب اٹھے اور مجھے ساتھ آنے کو کہا، مجھے لے کر وہ کلاس روم میں آئے، طلبا سے میرا تعارف کروایا اور مجھ سے کہا کہ ان دنوں میں غالب پڑھا رہا ہوں، آج آپ پڑھائیں گے۔ میں ذرا دیر کے لیے پریشان ہوا کہ آتے ہی اولے پڑے لیکن صدر شعبہ شکیل صاحب کا حکم تھا، انکار کی نہ جرات تھی نہ گنجائش اور پھر یہ بھی کہ غالب میرا بھی محبوب شاعر ہے اس لیے میں نے طلبا سے کچھ رسمی گفتگو کے بعد غالب کی انفرادیت پر ایک تفصیلی لکچر دیا (اور خاص طور پر بتایا کہ میر، غالب اور اقبال تینوں عظیم شاعر ہیں لیکن کون کیوں عظیم ہے یہ سمجھنا ضروری ہے۔ اور میں نے یہ سمجھانے کی کوشش کی۔) میں جب کلاس روم سے واپس آیا تو شکیل صاحب نے کہا " آپ فی الحال ڈاکٹر برج پریمی ایما صاحب کے ساتھ بیٹھیں گے" اتنا کہہ کر شکیل صاحب خود کلاس لینے چلے گئے۔ اور میں شعبے کے دوسرے اساتذہ سے باتیں کرنے لگا خاص طور پر حامدی صاحب اور ایما صاحب سے ایسی بے تکلفی ہوگئی جیسے ہم برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ کلاس لے کر شکیل صاحب اپنے کمرے میں آئے اور مجھے بلایا، انھیں طلبا نے میرے لیکچر اور رسمی بات چیت کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا شکیل صاحب خوش اور مطمئن تھے۔ مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا "کیا ضرورت تھی یہ کہنے کی کہ تم شادی شدہ ہو؟ کچھ دن خاموش رہتے، تماشہ دیکھتے۔ پھر کہا)

شام کو میں شکیل صاحب کے ساتھ ہی شعبے سے نکلا۔ ان دنوں شکیل صاحب لال چوک کے عقب میں واقع پوش کالونی جواہر نگر میں اپنی مختصر فیملی (اہلیہ اور تین بچوں، انجم، رومی اور ہولی) کے ساتھ رہتے تھے۔ گھر پہنچے تو شکیل صاحب نے تعارف کروایا سب لوگ اتنی محبت سے ملے کہ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ خوب باتیں ہوئیں شکیل صاحب کے چائے اور رات کا کھانا کھانے کے بعد میں آٹو سے لال چوک اپنے ہوٹل آ گیا۔ دوسرے دن شکیل صاحب کے حکم پر میں ہوٹل سے ان کے گھر منتقل ہوگیا۔ بھابھی نے کہا جب تک یونیورسٹی میں رہائش کا انتظام نہیں ہوتا یہیں ہمارے ساتھ رہو گے۔ اور میں مہینوں ان کے ساتھ رہا۔ شکیل بھائی کو بہت قریب، بہت گہرائی سے جاننے کی شروعات یہیں سے ہوتی ہے۔

'موتیہاری' شکیل الرحمٰن کے آبائی شہر کا نام ہے ریاست بہار کے شمال میں ضلع چمپارن میں۔ چمپارن، نیپال کی سرحد ہے۔ کہا جاتا ہے، گوتم بدھ جب 'کپل وستو' سے چلے تو اس مقام پر بھی رکے، کسی نے انھیں 'چمپا' کا زرد پھول پیش کیا اور پھر سارا علاقہ چمپا کے مہکتے ہوئے زرد پھولوں سے لد گیا۔ اسی سے اس کا نام 'چمپا... رن' ہوا، یعنی چمپا پھولوں کی خوشبوؤں سے بھرا جنگل۔ اسی مٹی پر ان کا جنم ہوا، 18 تاریخ تھی، فروری کا مہینہ تھا اور سال تھا 1931 کا، وقت صبح پانچ بجے" (آشرم ص 21)۔ شکیل الرحمٰن کے والد، خان بہادر مولوی جان محمد کا شمار بہار کے

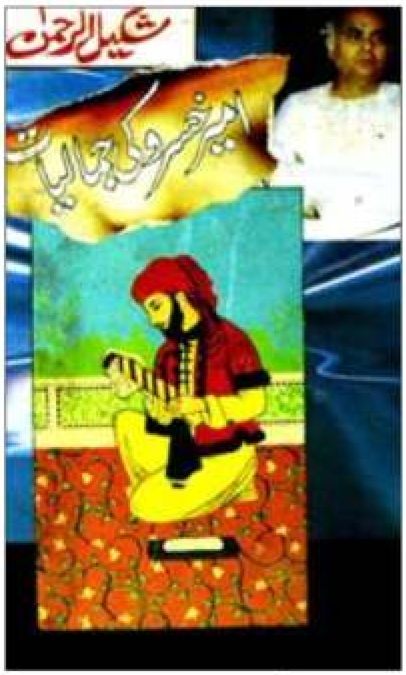

معروف ترین وکیلوں میں ہوتا تھا اور وہ چھپرہ سے موتیہاری، آ بسے تھے شکیل صاحب کے جد امجد لالہ روپ دون پرشاد سہائے' کائستھ ہندو تھے۔ ان کے ایک پوتے اور شکیل صاحب کے دادا، شری لیلا پرشاد نے اسلام قبول کر لیا تھا (مسلم نام عبد الرحمٰن) لیکن تایا دادا سری کانت پرشاد اور ان کا خاندان ہندو ہی رہا خاندان کے بہت سے افراد ہندو ہی رہ گئے تھے پھر بھی رشتے ناطے اسی طرح قائم تھے (ہندوستان کے پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد بھی ان کے ہندو رشتہ داروں میں سے تھے) اس طرح شکیل الرحمٰن دو مختلف مذاہب اور دو مختلف نظریہ حیات کے ایک بڑے خاندان میں پرورش پاتے رہے اور ایک انوکھے طرز زندگی سے آشنا ہوتے رہے۔ سب اس طرح رہتے تھے جیسے ایک ہی خاندان کے ہوں، اور تھے بھی ایک ہی خاندان کے۔ "سب ایک دوسرے کے تہواروں اور خوشیوں میں شریک ہوتے ایک فرد کا غم دوسرے کا غم بن جاتا" ہولی دیوالی دسہرہ، عید اور بقر عید کے تہواروں میں سب شریک ہوتے۔ دو بڑے مذاہب کی تہذیبی اور تمدنی آمیزش نے شکیل الرحمٰن کی نفسیات، اور تخلیقیت کو اور علمی وادبی، تنقیدی و تجزیاتی شعور کو ایک ایسے مثالی سیکولر سانچے میں ڈھال دیا جس کی کوئی دوسری نظیر اردو میں مشکل سے ہی ملے گی۔ وقت کے ساتھ شکیل الرحمٰن کے وجود کے اندر کا 'سیکولر رحمٰن'، زمین پر ہی نہیں کا نغد پر بھی، گوتم بدھ، شیخ العالم نُند رشی، اور لل عارفہ کی طرح انسانیت پرستی (Humanism) برتتا رہا۔ ابتدا سے لے کر انتہا تک ان کی تمام تحریروں میں 'سیکولرزم کی جمالیات' کی خوشبو رچی بسی نظر آتی ہے۔ ان کے والد کی مادری زبان بھوج پوری تھی لیکن گھر میں بھوج پوری اور اردو دونوں زبانوں کا چلن تھا۔ گھر کے سبھی لوگ تعلیم یافتہ تھے اس لیے ضرورت کے مطابق سبھی لوگ انگریزی کا استعمال کرنے پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ ریڈیو کشمیر اور دوردرشن کشمیر کے بعض افسران سے جو بھوج پور سے تعلق رکھتے تھے، ان کے ساتھ شکیل صاحب بھوج پوری میں بھی بات چیت کر لیا کرتے تھے۔ بچپن سے ہی شکیل الرحمٰن کا فطرت سے ایک گہرا رشتہ قائم ہو گیا تھا" پہاڑوں، ندیوں، جھیلوں، تتلیوں پرندوں، درختوں، پودوں اور دنیا کے مختلف رنگوں نے انھیں اپنی مکمل گرفت میں لے لیا تھا" پہاڑوں اور خصوصاً ہمالہ کی برف پوش چوٹیوں سے شکیل صاحب کا جو حسی اور جذباتی تعلق پیدا ہوا ان ہی سے ممکن ہے اساطیر اور قدیم مذاہب کے مطالعے کا شوق بیدار ہوا ہو...

کشمیر میں شکیل صاحب کے گھر (155. جواہر نگر) سے یونی ورسٹی تقریباً دس بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے، ہم گھر سے نکل کر ٹہلتے ہوئے کچھ ہی فاصلے پر کلچرل اکادمی کے سامنے واقع 'ناوگھاٹ' پہنچتے۔ یہاں ایک ایک روپیہ لے کر لوگوں کو ناؤ سے جہلم ندی کے اُس پار" ٹنڈل بسکو اسکول کے پیچھے گھاٹ پر اُتارا جاتا تھا۔ گھاٹ سے چند گھروں کے فاصلے پر ہی لال چوک ہے جہاں سے درگاہ، حضرت بل/ یونیورسٹی کے لیے بسیں ملتی تھیں زیادہ تر بسیں رعناواری، خانیار، حسن آباد ہوتے ہوئے درگاہ/ یونیورسٹی جاتی تھیں۔ لیکن بعض بسیں ڈل لیک، شنکر آچاریہ، نہرو پارک، گرانڈ ہوٹل، گورنر ہاؤس، اور شالیمار باغ ہوتے ہوئے بھی درگاہ/ یونیورسٹی تک جاتی تھیں ڈل لیک کا علاقہ سرینگر آنے والے سیاحوں کے لیے کئی اعتبار سے مرکزی حیثیت رکھتا ہے اس کے ایک طرف سستے اور مہنگے ہر طرح کے ہوٹلوں کا جال بچھا ہوا ہے سڑک کی

دوسری جانب ڈل جھیل پر میلوں تک چھوٹے سے لے کر بڑے فائیو اسٹار 'شکاروں' کا ایک طویل سلسلہ ہمہ وقت موجود نظر آتا ہے۔ شام ڈھلے جب ان شکاروں پر چراغاں ہوتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے پانی میں چراغوں کے پھول کھلے ہوں۔ (اب ڈل جھیل پر جگہ جگہ خوبصورت ترتیب کے ساتھ رنگ برنگے فوارے بھی لگادیے گئے ہیں)۔ یونیورسٹی جانے کا یہ راستہ ذرا لمبا ضرور ہے لیکن بے حد خوبصورت ہے۔ اگر ہم (شکیل صاحب اور میں) گھر سے ذرا پہلے نکلتے تو ڈل لیک کی طرف سے جانے والی بس ہی لیتے۔ پورے راستے شکیل صاحب کشمیر کی تاریخ، عروج و زوال، ادب و ثقافت، صوفیائے کرام، ہندو دھرم، اسلام، بودھ مت اور رشی ازم وغیرہ کے بارے میں بتاتے رہتے۔ شمیری دور، مغل دور، سکھ دور اور ڈوگرہ دور حکومت قبائلی حملہ، پنڈت نہرو، مسٹر محمد علی جناح اور شیخ محمد عبداللہ وغیرہ کے حوالے سے بعض وہ باتیں بتاتے جن کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں عام طور پر نہیں ملتا۔ پھر دوسری جنگ عظیم، قحط بنگال، بہار کا زلزلہ، مذہب، تصوف، تقسیم ملک، فسادات وغیرہ موضوعات پر شکیل صاحب کی ہر گفتگو ذات پات، سماج کی طبقاتی تقسیم سے ماورا ہوتی تھی۔ شعبہ اردو کا ماحول بڑا دلچسپ تھا پروفیسر اسداللہ کامل بس یونیورسٹی کے ایسے ملازم تھے جو گھر سے 'ٹفن' لے کر آتے اور آتے ہی کھانے بیٹھ جاتے، کلاس روم میں جاتے اور اللہ رسول کی بڑی ایمان افروز باتیں کرتے، ایک بار غلطی سے کہہ بیٹھے ''غالب عظیم شاعر تھا لیکن شراب پیتا تھا''، ایک ذہین طالب علم نے شرارتاً سوال کرڈالا ''غالب عظیم شاعر تھے اس کی دلیل کیا ہے؟ کامل صاحب ادھر ادھر کی کچھ ہانکتے رہے لیکن وہ طالب علم اپنے سوال پر قائم رہا تو کامل صاحب نے یہ کہہ کر بات ختم کردی کہ ''خدا رسول کی قسم غالب عظیم شاعر تھا''۔

حامدی صاحب جتنے اچھے انسان ہیں اتنے ہی اچھے استاد بھی تھے، لیکن عموماً بھاگم بھاگ آتے، کلاس لیتے، اساتذہ کے ساتھ بیٹھتے، محبتیں بانٹتے اور چلے جاتے۔ برج پریمی شعبہ اردو کی ناک تھے شعبے کے ٹائم ٹیبل، خط و کتابت سے لے کر درس و تدریس تک ہر کام ذمے داری سے نبھاتے 'منٹو کی شخصیت اور فن' پر ان کے کام سے دنیا واقف ہے۔ شکیل صاحب انھیں بے حد عزیز رکھتے تھے برج پریمی مجھ سے ایک آدھ سال پہلے شعبے میں آئے تھے۔

جب شکیل صاحب، میں اور برج پریمی تینوں ہی کیمپس میں رہنے لگے تو پھر ہم اکثر شام کو اور سرد موسم میں دن کو شکیل صاحب کے لان میں بیٹھتے شکیل صاحب کا کوارٹر گرلز ہوسٹل کے سامنے تھا۔ شکیل صاحب گھر پر گرمیوں میں کرتا پاجامہ اور کبھی کبھار لنگی بنیان میں اور سردیوں میں گرم کپڑے اور گاؤن پہن کر بیٹھتے بھابھی (عصمت شکیل) ایک مثالی بیوی اور ماں ہیں شکیل صاحب کی ہر چھوٹی بڑی ضرورت، پسند اور ناپسند کا خیال رکھتی تھیں۔ طرح طرح کے پکوان بنانے میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں اور پوچھ پوچھ کر کھلاتیں بھابھی کا تعلق بنگالی سماج اور تہذیب سے تھا، یونیورسٹی کیمپس کے سامنے ہی ڈل جھیل تھی ڈل کی مچھلیاں اپنی لذت کے لیے پورے جموں و کشمیر میں مشہور ہیں۔ کشمیر میں مچھلی کئی طرح سے پکائی جاتی ہے لیکن ہر تہوار میں ہندو مسلمان سب کے گھروں میں 'مچھلی اور ندرو' (کمل ککڑی) کی 'ڈش' لازمی طور پر پکائی جاتی ہے شکیل صاحب کو چکن اور مٹن سے زیادہ 'مچھلی ندرو' پسند تھا۔ شعبے کے پیون غلام قادر شکیل صاحب کے لیے مچھلیاں خرید کرلاتے تھے۔ شکیل صاحب کم خوراک تھے۔ دن کا کھانا نہیں کھاتے، سگریٹ کی عادت نہیں تھی، شعبے میں چائے پیتے اور چائے کے بعد پان کھاتے۔ لال چوک میں 'شکتی سویٹس' کے پاس ہی 'میر صاحب' کی پان کی دوکان تھی شکیل صاحب وہیں سے پان منگواتے۔ کشمیر میں پان کھانے کا رواج ان دنوں بھی نہیں تھا اور آج بھی نہیں ہے۔ لال چوک میں اکا دکا ہی پان کی دوکانیں تھیں جو سیاحوں کے پان کے شوق کو پوری کرتیں۔ کشمیر یونیورسٹی میں سال میں دو بار 'پکنک' پر جانے کا رواج ہے ایک بار مارچ اپریل میں یونیورسٹی کھلنے کے بعد اور دوسری بار اکتوبر نومبر میں، سرما کی چھٹیوں سے پہلے۔ ہمارا شعبہ بھی جاتا، گلمرگ، پہلگام، سونہ مرگ اور ویری ناگ وغیرہ سیاحتی مقامات میں سے کہیں بھی جاتے طلبا و طالبات کے ساتھ اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور کلرک، پیون وغیرہ بھی ہوتے اکثر شکیل صاحب بھی بھابھی اور بچوں کے ساتھ پکنک میں شریک ہوتے۔ جب میری اہلیہ بھی کشمیر آگئیں تو وہ بھی پکنک میں شریک ہونے لگیں برج پریمی بھی اپنی بیگم کے ساتھ آتے۔ ڈاکٹر مجید مضمر اور ڈاکٹر سجان کور بالی بھی ہمارے ساتھ ہوتیں۔ سجان کور نے شکیل صاحب کی نگرانی میں ہی 'اردو تنقید میں غالب شناسی' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کیا تھا اور کشمیر یونیورسٹی میں پہلی 'سکھ' پروفیسر تھیں۔

شکیل صاحب شعبہ اردو کو 'ایڈوانس سینٹر' بنانا چاہتے تھے اس کے لیے انھوں نے 'یونیورسٹی گرانٹس کمیشن' سے بات بھی کرلی تھی۔ ہم لوگوں نے اس کے لیے ضروری کاغذات، یوجی سی کو بھیج دیے۔ پہلے مرحلے میں شعبہ اردو کو Department of Special AssisTance کا درجہ دیا گیا۔ D.S.A کی عمارت کی تعمیر، لائبریری وغیرہ کے لیے کروڑوں روپے خرچ ہوئے متعلقہ پروفیسروں نے پانچ سال تک عیش کیے لیکن پانچ برسوں میں، پانچ سطریں بھی نہیں لکھ سکے۔ U.G.C کی ایک ٹیم انسپکشن کے لیے آئی اور D.S.A کے پروفیسروں کے Zero Contribution کی بنیاد پر D.S.A کو ایک سخت مذمتی نوٹ کے ساتھ بند کردیا گیا۔ یہ سب کچھ شکیل صاحب کی غیر حاضری میں ہوا کیونکہ 1983 میں شکیل صاحب 'بہار یونیورسٹی' کے وائس چانسلر ہوکر مظفر پور چلے گئے تھے۔ وہاں کی وائس چانسلر شپ کی مدت ختم ہونے کے بعد وہ دوبارہ کشمیر یونیورسٹی چلے آئے۔ لیکن پھر 1988 میں بہار کی ہی للت نرائن متھلا یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوکر دربھنگہ چلے گئے۔

کشمیر چھوڑنے کے بعد شکیل صاحب پھر کبھی لوٹ کر کشمیر نہیں آئے، لیکن ان کے خط اور ٹیلیفون برابر آتے رہے، میرے پاس اور برج پریمی ایما کے پاس اور ہم سے زیادہ مجید مضمر اور ڈاکٹر سجان کور کے پاس۔

مجید مضمر (مرحوم) ریسرچ اسکار تھے تب بھی اور لکچرر ہوگئے تب بھی ہمارے ساتھ ہی ہوتے۔ شکیل صاحب، مجید مضمر کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ شکیل صاحب جب کشمیر چھوڑ کر گئے تو اپنی لائبریری اور کئی نادر و نایاب مسودات، خطوط وغیرہ مجید صاحب کے حوالے کیے تھے ان میں مہاتما گاندھی کا اردو میں لکھا ہوا ایک رُقعہ اور شریمتی اندرا گاندھی کا اردو میں دستخط کیا ہوا ایک خط بھی تھا اس کے علاوہ شکیل صاحب کی ایک آدھ کتاب کا ہاتھ سے لکھا ہوا مسودہ بھی تھا۔ مجید مضمر کے ناوقت انتقال کے بعد پتہ نہیں یہ چیزیں کیا ہوئیں۔ شکیل صاحب نے کشمیر کے بعد بقیہ زندگی دلی کے پاس گڑ گاؤں میں ہی گذاری۔ فرصت تھی، جمالیات کے حوالے سے درجنوں کتابیں لکھیں، اور تادم آخر لکھتے ہی رہے۔ گڑگاؤں میں ہی ایک طویل بیماری کے بعد تاریخ..... 2016 کو ان کا انتقال ہوگیا، اِنا لِلّٰہ و اِنا الیہ راجعون۔ اردو ادب کا بابا سائیں اب ہم میں نہیں لیکن ریاست جموں و کشمیر میں اردو زبان و ادب کی بات جب بھی کہیں چلتی ہے شکیل الرحمٰن کی خدمات کو ضرور یاد کیا جاتا ہے

■

Prof. A.Q. Jawaid
Baitul-Zehra, 27, Green Hills Colony
Near Govt. Higher
Secondary School, Bhatindi
Jammu - 181152 (J&K)

حبیب نثار

سیدہ جعفر
نقاد، محقق و مدون

انیسویں صدی کے پہلے دہے میں اردو تحقیق کا حیدرآباد سے آغاز ہوتا ہے۔ گیان چند جین نے حبیب الرحمن شیروانی کے مرتبہ تذکرہ 'گلشن ہند' پر مولوی عبدالحق کے لکھے مقدمہ کے وسیلے سے اردو تحقیق کے آغاز کا شمار کیا ہے۔ عبدالجبار خاں نے 'محبوب الزمن تذکرہ شعراء دکن' 1911 میں شائع کرتے ہوئے اردو تحقیق کی راہ کو ہموار کیا اور شمس اللہ قادری نے 'اردو قدیم' (1911) کے ذریعے دکنی تحقیق کو ایک سمت و رفتار عطا کی۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام (1917) کے بعد اردو محققین کی جو پہلی نسل ابھری ان میں مولوی عبدالحق، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، ڈاکٹر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر سید محمد، ڈاکٹر شیخ چاند، ڈاکٹر سید سجاد اور ڈاکٹر حفیظ قتیل کے نام ملتے ہیں۔ نصیرالدین ہاشمی، حکیم شمس اللہ قادری اور احمد اللہ قادری اپنے ذوق کی تسکین کے لیے میدان تحقیق میں شہ سواری کررہے تھے۔ سیدہ جعفر نے ان ہی محققین کی روایت کو آگے بڑھایا۔

سیدہ جعفر نے 1934 میں ایک علمی گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ آپ کے جد اعلیٰ سید رضی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خطبات عالیہ کو 'نہج البلاغہ' کے نام سے مرتب کیا تھا۔ آپ ہی کی اولاد سے سید محمد بن سید محمد باقر موسوی خراسانی ہوئے ہیں جو دکنی کے معروف شاعر ہیں اور جن کی تقریباً ایک درجن تصانیف کے نام تذکروں اور ادب کی تواریخ میں ملتے ہیں۔ آپ کا تخلص والہ تھا، جس میں فارسی دیوان کے علاوہ مثنوی طالب و موہنی اور رازق باری بھی شامل ہیں۔ سید محمد والہ، اپنے والد کے انتقال کے بعد قم سے لاہور پہنچے اور وہاں سے دہلی۔ بہادر شاہ نے انھیں شاہی منصب داروں میں شامل کیا۔ نظام الملک آصف جاہ صوبہ دار دکن سید محمد والہ کے علم و فضل سے بے حد متاثر ہوئے اور انھیں اپنے ہمراہ دکن لے آئے۔ یہیں حیدرآباد میں سید محمد والہ کی شادی عبداللہ قطب شاہ کے داماد سید نظام الدین سید احمد نیبری سے انجام پائی۔ کچھ عرصہ حیدرآباد میں رہنے کے بعد سید محمد والہ نواب انورالدین خاں کے ساتھ آرکاٹ چلے گئے وہاں سے ترچناپلی گئے اور وہیں 1184 ہجری میں وفات پائی۔

سیدہ جعفر کا ننہالی رشتہ سید محمد والہ سے ملتا ہے اور دادیہال دکنی 'روضۃ الشہدا' کے خالق ولی ویلوری سے تعلق رکھتا ہے۔ سیدہ جعفر کے دادا جناب سید سجاد علی، آصف جاہ نواب عثمان علی خاں کے وزیر تعلیم اور علامہ اقبال کے مربی نواب مہدی نواز جنگ (سابق گورنر گجرات) کے بڑے بھائی تھے۔ آپ کے والد بزرگوار سید جعفر مملکت آصفیہ کے محکمہ آبکاری میں ایک ممتاز عہدے پر فائز تھے اور کریم نگر سے فرائض انجام دے رہے تھے کہ 1934 میں انھیں لڑکی سے اللہ نے نوازا جسے سیدہ کے نام سے موسوم کیا گیا بعدازاں والد کے نام کے جزو کو لاحقہ بنا کر انھیں سیدہ جعفر سے متصف کیا گیا۔

سیدہ جعفر کی تعلیم کا آغاز دکنی شاعرہ ماہ لقابائی چندہ کی حویلی میں قایم کیے گئے نامپلی اسکول برائے اناث، سے ہوا، اسی اسکول سے انھوں نے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا اور پھر ویمنس کالج سے انٹرمیڈیٹ کی تعلیم حاصل کی اور گریجویشن کے لیے جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا۔ جامعہ اپنے شباب پر تھی۔ انقلاب زمانہ ابھی اس کے شب و روز پر اثر انداز نہیں ہوا تھا۔ تعلیم کا نظام باقاعدگی سے رواں دواں تھا۔ گریجویشن کی تعلیم کے بعد سیدہ جعفر نے اردو زبان و ادب میں ماسٹرس کی ڈگری 1955 میں حاصل کی اور بدلتے سیاسی، سماجی اور تعلیمی ماحول کی پروانہ کرتے ہوئے انھوں نے ڈاکٹریٹ کرنے کا فیصلہ کیا اور پروفیسر عبدالقادر سروری کی نگرانی میں 'اردو مضمون کا ارتقا' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھا اور 1958 میں داخل دفتر کیا جس پر ایک برس بعد انھیں ڈاکٹریٹ کا مستحق قرار دیا گیا۔ ڈاکٹریٹ کے مقالے کی تکمیل کے ساتھ ہی سیدہ جعفر کا تقرر بہ حیثیت لکچرار حیدرآباد کی معروف درس گاہ 'نظام کالج' میں عمل میں آیا۔

اسی دوران سیدہ جعفر کی شادی جناب احمد مہدی سے انجام پائی جو بہ اعتبار پیشہ ایڈوکیٹ تھے اور ایک علمی خانوادہ کے چشم و چراغ تھے کہ نوازش علی ہمعہ آپ کے جداعلیٰ تھے۔ اللہ نے انھیں دو لڑکوں سے نوازا۔

سیدہ جعفر 1958 میں جامعہ عثمانیہ سے بہ حیثیت لکچرر منسلک ہوئیں۔ 1965 میں انھیں ریڈر کے عہدے پر ترقی دی گئی اور انھیں نظام کالج کے علاوہ ویمنس کالج میں بھی تدریسی خدمات تفویض کی گئیں۔ 1984 میں انھیں استاد محترم مغنی تبسم کے ہمراہ پروفیسر کے عہدے پر ترقی دی گئی اور ان کی خدمات شعبہ اردو، آرٹس کالج سے منسلک کردی گئیں۔ 1979 میں پارلیمنٹ ایکٹ کے ذریعے حیدرآباد میں پہلی سنٹرل یونی ورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ شعبہ اردو بھی قائم کیا گیا اور اردو کے ممتاز محقق پروفیسر گیان چند کو اس کی صدارت کے لیے منتخب کیا گیا پروفیسر صاحب نے صدارت سے معذرت کرلی لیکن پروفیسر آل احمد سرور اور جناب عابد علی خاں مدیر روزنامہ سیاست حیدرآباد کی خصوصی درخواست سے مجبور ہوکر پروفیسر گیان چند نے صدارت سنبھالی وہ الہ آباد سے حیدرآباد آتے ہوئے اپنے ہمراہ ڈاکٹر سید مجاور حسین رضوی کو لیتے آئے جن کا بہ حیثیت لکچرار صدر شعبہ کی خواہش پر بغیر انٹرویو تقرر عمل میں آیا۔ سلیکشن کمیٹی نے ڈاکٹر ثمینہ شوکت کا بہ حیثیت ریڈر تقرر کیا تھا۔ پروفیسر گیان چند نے شعبے کی صدارت سنبھالتے ہی پہلے پہل ایم فل اور پی ایچ ڈی میں داخلے کیے۔ ایم اے کی تعلیم کا آغاز ایک سمسٹر بعد ہوا۔ ایسے میں اساتذہ کی کمی انھیں

محسوس ہوئی اور اسے پورا کرنے کے لیے انھوں نے ڈاکٹر مغنی تبسم اور ڈاکٹر سیدہ جعفر کا مہمان اساتذہ کے طور پر تقرر کیا اور ایم فل کی تدریس کی ذمے داری ان اساتذہ کو تفویض کی۔ پروفیسر سیدہ جعفر نے 1986 تک شعبہ اردو حیدرآباد یونی ورسٹی میں خدمات بہ حسن وخوبی انجام دیں اور پانچ ایم فل اسکالرز نے آپ کی نگرانی میں مقالات کامیابی سے سپردِ قلم کیے۔

1984 میں پروفیسر سیدہ جعفر کو شعبہ اردو، جامعہ عثمانیہ کی صدارت کی ذمے داری دی گئی۔ اسی زمانے میں انھیں مرکزی حکومت کے ادارہ ترقی اردو بیورو (موجودہ NCPUL) نے پروفیسر گیان چند جین کی رفاقت میں ابتدا سے 1700 کے عرصے پر محیط اردو ادب کی تاریخ لکھنے کے لیے منتخب کیا۔ پانچ جلدوں پر مشتمل یہ پروجکٹ اگست 1988 کو داخل دفتر کیا گیا۔ اپنے دورِ صدارت میں سیدہ جعفر نے دوروزہ سیمنار' حیدرآباد میں بیرونی شعرا (1985) منعقد کیا۔ اس موقعے پر موضوع سے متعلق ایک سوونیر شائع کیا گیا جس میں بیرونی شعرا پر تعارفی مضامین کے علاوہ حیدرآباد میں اردو کی صورت حال پر مشتمل مضامین کے ساتھ ساتھ حیدرآباد کے اردو اساتذہ کی فہرست شامل کی گئی۔ بعدازاں سیدہ جعفر نے سیمنار میں پیش کیے مقالات مرتب وشائع کیے۔ 1990 میں پروفیسر سیدہ جعفر کا تقرر حیدرآباد سنٹرل یونی ورسٹی میں عمل میں آیا۔ اور شعبہ کی صدارت بھی انھی کے سپرد کی گئی۔ یہاں سے وہ 1994 میں سبکدوش ہوئیں۔ اس عرصے میں آپ نے درس وتدریس کے علاوہ سیمنار بھی کروائے، ورک شاپ بھی منعقد کیا اور چار ایم فل اور چار ڈاکٹریٹ کے اسکالرز کی رہنمائی کے فرائض بھی بخوبی انجام دیے۔

سیدہ جعفر کو علم حاصل کرنے ہی کا شوق نہیں تھا وہ اپنے اجداد کی طرح تصنیف وتالیف اور تدوین کا ذوق بھی رکھتی تھیں۔ چنانچہ تاحال آپ نے سیکڑوں تحقیقی وتنقیدی مضامین ومقالات برصغیر کے مختلف رسائل میں شائع کیے اور تقریباً تین درجن کتابیں شائع کیں۔ ان کی پہلی تصنیف 'ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقاء میں ان کا حصہ' ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، حیدرآباد سے 1960 میں شائع ہوئی اور آخری تصنیف 'احتساب تنقید اور تجزیہ' مضامین کا مجموعہ 2015 میں شائع ہوا۔ گویا پچپن برس زندگی کے انھوں نے اسی میں صرف کیے۔ ان کتابوں کو حسب ذیل زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(1) تاریخ ادب (2) ترتیب وتدوین (3) مجموعہ ہائے مضامین (4) مونوگراف (5) اردو کے ہندی تراجم

1. تاریخ ادب اردو:

(1) ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقا میں ان کا حصہ (1960)، (2) دکنی رباعیاں (196)، (3) یادگار مہدی (1970)، (4) اردو مضمون کا ارتقا (1972)، (5) دکنی نثر کا انتخاب (1984)، (6) دکنی ادب کا مطالعہ (معاون ڈاکٹر افضل الدین) (1990)، (7) اردو ادب کی تاریخ (ابتدا سے 1700 تک۔ پانچ جلد۔ بہ اشتراک پروفیسر گیان چند) (1998)، (8) اردو ادب کی تاریخ (میر کے عہد سے ترقی پسند تحریک تک) چار جلد 2000

ترتیب و تدوین:

تاریخ ادب اردو کے بعد سیدہ جعفر کا سب سے اہم اور قابل قدر کارنامہ مخطوطات کی دریافت اور ان کی ترتیب وتدوین ہے۔ انھوں نے احمد گجراتی کی مثنوی یوسف زلیخا، احمد جنیدی کی مثنوی ماہ پیکر اور ملک خوشنود کی مثنوی جنت سنگھار کو مکمل طور پر پہلی مرتبہ متعارف کرایا ہے۔ ترتیب وتدوین کی حسب ذیل خدمات ہیں:

(1) من سمجھاون 1964، (2) سکھ انجن 1968، (3) یوسف زلیخا 1983، (4) کلیات محمد قلی قطب شاہ 1985، (5) مثنوی ماہ پیکر 1985، (6) مثنوی جنت سنگھار 1997، (7) مثنوی گلدستہ 2001، (8) مثنوی نوسرہار 2013، (9) دیوان عبداللہ قطب شاہ زیر طبع

3. مجموعہ ہائے مضامین:

سیدہ جعفر نے جن مضامین ومقالات کو برصغیر کے مختلف رسائل میں شائع کیا انھیں یکجا کرتے ہوئے مضامین کے مجموعوں کی شکل میں شائع کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا پہلا مجموعہ مضامین 19655 میں فن کی جانچ شائع ہوا اور آخری مجموعہ تنقید، احتساب اور تجزیہ 2015 میں شائع ہوا ہے۔ تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے:

(1) فن کی جانچ 1965، (2) تنقید اور انداز نظر 1969، (3) مہک اور محک 1995، (4) تنقید، احتساب اور تجزیہ 2015

مونوگراف:

سیدہ جعفر نے ترقی اردو بیورو (موجودہ NCPUL) اور ساہتیہ اکادمی کی فرمائش پر اردو ادیب اور شعرا کے مونوگراف اور کلام کا انتخاب کیا ہے جو حسب ذیل ہیں:

(1) ڈاکٹر زور 1984، (2) انتخاب کلام محمد قلی (3) فراق گورکھپوری (4) غواصی 2015

ہندی تراجم:

سیدہ جعفر نے بعض دکنی تصانیف کے ہندی تراجم کیے اور انھیں شائع کیا ہے جو حسب ذیل ہیں۔

(1) چندر بدن ومہیار 1984، (2) ویلا تھال (3) من سمجھاون 1986

سیدہ جعفر کی ادبی قدروقیمت کا لحاظ کرتے ہوئے ملک کے کئی ادبی وتہذیبی اداروں نے اپنا رکن بنایا جن میں اہم ساہتیہ اکادمی دہلی اور NCPUL دہلی بھی شامل ہیں۔

ان کی علمی وادبی خدمات پر انھیں قاضی عبدالودود ایوارڈ برائے تحقیق (بہار) مخدوم ادبی ایوارڈ (حیدرآباد) ڈاکٹر زور ایوارڈ (عالمی کانفرنس دہلی) نوائے میر ایوارڈ (اترپردیش اردو اکادمی، لکھنو) کے علاوہ بنگال اردو اکادمی اور انجمن اردو قطر سے بھی انھیں ایوارڈ دیا گیا۔

سیدہ جعفر کی ادبی وعلمی خدمات کا اعتراف اردو کے ہر بڑے محقق ودانشور نے کیا ہے یہاں صرف تین اقتباس پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

سیدہ جعفر کی ہم عصر محقق نقاد اور شاعرہ پروفیسر اشرف رفیع رقم طراز ہیں:

''پروفیسر سیدہ جعفر کی تحقیقی کاوشیں، تاریخی، تہذیبی، اور ادبی شعور کی ترجمان ہیں انھوں نے دکنی ادب پاروں کی بازیابی اور اشاعت سے دکنی ادب کے سرمایہ میں نہ صرف گراں قدر اضافہ کیا ہے بلکہ گولکنڈہ اور بیجاپور کی تہذیب اور ثقافت کو از سرنو زندہ کردیا ہے۔

(مجلہ عثمانیہ بابت 2004، ص70)

سیدہ جعفر کی پہلی تدوین، من سمجھاون تھی جو 1964 میں شائع ہوئی۔ اس وقت شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کے صدر، پروفیسر مسعود حسین خاں تھے، انھوں نے اس کتاب پر مقدمہ لکھتے ہوئے یہ کہا ہے:

''شعبہ اردو کی جانب سے اہل نظر کی خدمت میں ایک قیمتی تحفہ اور علمی چیلنج پیش کرتا ہوں''

(مقدمہ: من سمجھاون)

پروفیسر سید مجاور حسین رضوی لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر سیدہ جعفر محقق کی حیثیت سے برصغیر میں مستند عالموں میں شمار ہوتی ہیں۔ تدوین کی حد تک، من سمجھاون، دکنی رعبایاں، سکھ انجن اور کلیات قلی قطب شاہ ادبی اہمیت اور وقار کی حامل ہیں۔ دیدہ ریزی، تحقیقی بصیرت اور سچی لگن ان کی وہ خصوصیات ہیں جس نے انھیں انفرادیت عطا کی ہے۔ (جہان افکار ص 244)

سیدہ جعفر نے زندگی بھر دکنی ادب سے من لگائے رکھا۔ موجودہ عہد میں وہ دکنی ادب کی سب سے عظیم محقق تھیں۔

■

Dr. Habib Nisar
Dept. of Urdu,
University of Hyderabad
Gachibowli,Hyderabad-500046 (Tlangana)

یاد رفتگاں

پ:23 اکتوبر 1923 ، وفات 15 جون 2016

صاحب جی سلطان جی کے عاشق اسلم فرخی

ارمان نجمی

اردو کے صاحب طرز ادیب، شاعر، براڈ کاسٹر، علمی صلاحیت سے مالا مال، مدیر مدیر، استاذ اور انشاپرداز کراچی گلشن اقبال کے اپنے مکان میں انتقال کر گئے۔ اناللہ و انا الیہ راجعون۔ میں کبھی کبھی انھیں یاد کر کے سوچتا تھا کہ شاید وہ اردو کے واحد ادیب کی حیثیت سے جانے جائیں گے جنھیں مشہور و معروف بنگالی نژاد ادیب و مفکر نراد چندر چودھری کی مانند سو برس سے زیادہ زندہ رہنے کی سعادت ملی۔ لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ میں ان دنوں مصطفیٰ کریم کے سانحہ رحلت سے ذہنی طور پر ماؤف ہو رہا تھا اس لیے عاصم بٹ کے ای میل پر دھیان ہی نہیں دے سکا اور ان کے لکھے ہوئے کو نہ سمجھ سکا اور آصف فرخی کو لکھ بیٹھا کہ کیا یہ سچ ہے۔ پھر میں خود ہی تمام اخبارات میں ان کے بارے میں تعزیتی تحریرات دیکھ کر خود کو سانحے کی تاب لانے کی تلقین کرنے لگا۔

ان سے دو ایک ملاقاتیں اور ان کی شفقتیں اور ہمت افزائیاں یاد آنے لگیں۔ اگست 1990 کی بات ہے جب میں اپنے کراچی سفر کے دوران وہاں کے کئی سربر آوردہ ادیبوں سے مل کر اپنی آنکھیں روشن اور دل کو شاد کر رہا تھا، کہ فہیم اعظمی صاحب مدیر ماہنامہ صریر نے ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا جس کی صدارت ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب صدر شعبہ اردو جامعہ کراچی نے کی تھی اور جس میں ممتاز احمد خان کراچی کے علاوہ افتخار اجمل شاہین، اور یاور امان نے شرکت کی تھی۔ مجھے مہمان خصوصی ہونے کے ناتے یہ کہا گیا تھا کہ جو بھی جس قدر بھی چاہوں سناؤں۔ میں نے دوہے، رباعیات نظمیں اور غزلیں سنا کر موقع کا فائدہ اٹھایا تھا۔ میں نے یہ دیکھا کہ صدر نشیں ہونے کے باوجود اسلم فرخی صاحب نے مجھے مکمل کر داد دی بلکہ محفل کے اختتام پر طعام کے دوران مجھ سے کہا کہ لکھتے رہیے۔ پرانے اساتذہ مشق سخن کو بہت ضروری سمجھتے تھے۔ میں ان کا اشارہ سمجھ گیا اور اپنی تحریروں پر زیادہ انہماک سے نظر ثانی کرنے لگا۔ ایک دن جامعہ کراچی کے اردو شعبے میں ان سے ملاقات ہوگئی تو اپنے شعبے کے کئی اساتذہ سے انھوں نے میرا تعارف کرایا بلکہ دعوت دی کہ ایک دن میں ان کے شعبے میں طلبا اور اساتذہ کے ساتھ ایک بے تکلف بات چیت میں شرکت کروں۔ لیکن افسوس مقررہ تاریخ کو کراچی کچھ ایسے بند کی زد میں آ گیا کہ گھر سے نکلنا دشوار ہو گیا۔ اور میں ان سے کچھ سیکھنے اور سننے سے معذور رہا۔

اسلم فرخی صاحب اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو ملک کی تقسیم کے پہلے ہی باشعور ہو چکی تھی۔ ترک وطن کرنے کے کیا عوامل کارفرما تھے میں یہ ان سے پوچھنا چاہتا تھا لیکن اس کا موقع نہیں مل سکا۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ انھوں نے آزادی کے بعد ہندوستان کے حالات دیکھ کر ہی یہ قدم اٹھایا اور نئے ملک میں ترقی کے کچھ امکانات بھی ان کو نظر آئے، انھوں نے پہلے ریڈیو پاکستان میں ملازمت کی، اور اپنے تعلیمی سلسلے کو بھی آگے بڑھاتے رہے۔ سندھ کالج میں تقریباً چھ برس تک پڑھاتے رہے، جامعہ کراچی سے ام اے کی سند حاصل کر کے اس کے اولین طلبا کی فہرست میں نمایاں رہے۔ پی ایچ ڈی کرنے کے لیے انھیں محمد حسین آزاد کا موضوع ملا۔ انھوں نے اپنے موضوع کو گرفت میں لے کر ایسا مبسوط مقالہ لکھا جس میں ان کے علمی تبحر اور موضوع سے ان کی وابستگی کا ان کے اساتذہ نے استقبال کیا۔ یہ ان کی پہلی تصنیف 'محمد حسین آزاد حیات و تصنیف' کے نام سے شائع ہوئی۔ آزاد کے اسلوب کی خوبیاں اور انشائیہ نگاری کی بے ساختگی ان کی تحریروں میں بھی اپنی جلوہ گری دکھاتی ہے۔

اسلم فرخی نے شاعری بھی کی لیکن وہ اپنی شعری کاوشوں کو نمایاں نہیں کرتے تھے۔ نہ وہ رسالوں میں اپنا کلام اشاعت کے لیے بھیجتے تھے۔ نہ عام طور پر اپنی شاعری کا ذکر کرنا چاہتے تھے۔ حالانکہ اس صنف میں بھی ان کو اپنے وقت کے نمائندہ شعرا میں منفرد مقام حاصل ہے۔ ان کے پاس اتنا شعری مواد تو تھا ہی کہ ایک مجموعہ بآسانی مرتب ہو جاتا۔ فہیم اعظمی کے یہاں منعقدہ جس ادبی نشست کا ذکر ہوا ہے وہاں انھوں نے میزبان کی فرمائش پر چند غزلیں سنائی تھیں جو اتفاق سے میری ڈائری میں محفوظ رہ گئی ہیں۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہنگامۂ ہستی سے گذر کیوں نہیں جاتے
رستے میں کھڑے ہو گئے گھر کیوں نہیں جاتے
جس شہر میں گمراہی عزیز دل و جاں ہو
اس شہر ملامت میں خضر کیوں نہیں جاتے
اب جبہ و دستار کی وقعت نہیں باقی
رندوں میں یہ انداز دگر کیوں نہیں جاتے

اور سہل ممتنع کی حامل یہ غزل بھی دیکھیے:

آگ سی لگ رہی ہے سینے میں
اب مزہ کچھ نہیں ہے جینے میں
آخری کش مکش ہے یہ شاید
موج دریا میں اور سفینے میں

کہا جاتا ہے کہ شاعر کا کمال چھوٹی بحروں میں داد سخن دینے سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ بحر بہت ہی رواں اور غنائی کیفیتوں کی حامل ہے، شرط یہ ہے کہ شاعر اپنے مزاج کے مطابق اس سے کتنا فائدہ اٹھاتا ہے اور قافیہ و ردیف کے ساتھ کس طرح

ہم آہنگ کر کے معنی کی تہیں دریافت کرتا ہے

اسی بحر کی ایک اور کامیابی:

یہ حکایت تمام کو پہونچی — زندگی اختتام کو پہنچی
پہلے دو ایک قتل ہوتے تھے — بات اب قتل عام کو پہنچی
رقص کرتی ہوئی نسیم سحر — صبح تیرے سلام کو پہنچی

مجھے یقین ہے کہ اگر وہ شاعری ترک نہ کرتے تو ہمارے نمایاں غزل نگاروں میں ضرور شمار ہوتے، لیکن جب وہ سنجیدہ مطالعے کی جانب پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ لکھنے لگے تو ان کو نثری جہات کی گونا گوں وسعتوں نے اپنا اسیر کر لیا۔ اس میں ان کے لائق و فائق اساتذہ کا بھی ہاتھ تھا، لیکن جب تک یہ ان کی اپنی افتادِ طبع سے میل نہیں کھاتا وہ اس میدان میں اپنی آمد کا اعلان نہیں کر پاتے۔ وہ خوش نصیب تھے کہ ان کو علم و ادب کا وہ مناسب بلکہ برتر ماحول میسر آ گیا جہاں ان کے جوہر بار آور ہو سکے، لیکن شعری اظہار سے ان کی نثر کو بہت فائدہ پہنچا۔ دراصل وقت گذرنے پر ان کی وابستگی نثری اسلوب سے زیادہ ہوتی چلی گئی اور انشائیہ نگاری نے ان کی شاعری کو زیر کر لیا۔

یاد نگاری، یا خاکہ نویسی ایسا میدان ہے جہاں ان کے قلم کے جوہر کھلتے ہیں اور وہ تہذیبی بازیافت کے ایک ایسے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں جہاں ماضی اور حال کے درمیان کچھ بھی حائل نہیں رہتا۔ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ واقعات اور دیدہ و شنیدہ کا پر سوز و پر تاثیر بیانیہ دردمند دل کی آواز بن کر قاری کو مسحور کر لیتا ہے۔ اپنی اس فن کاری اور متناسب مظاہر اور عناصر کی یکجائی کے ذریعے اسلم فرخی نے اپنی خاکہ نگاری کا حق ادا کر کے اپنے اساتذہ اور ہم عصروں اور نادر روزگار بزرگوں کی شخصیات کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔ کاش وہ اپنی خود نوشت بھی لکھ جاتے تو وہ بھی خاصے کی چیز ہوتی، کہ اس میں ان کی تشکیل و تکمیل کا قصہ ایک دور کی تواریخ کو بہ اندازِ دگر یعنی ایک مورخ نہیں بلکہ ایک مستند ادیب کا قلم آدابِ سخن وری کے ساتھ پیش کرتا۔ دوسرے ان کو جتنا بھی جانتے ہیں وہ تو کوئی بھی لکھ دے گا لیکن اپنی ذہنی، نفسیاتی اور روحانی سفر کی روداد جیسا خود وہ لکھ سکتے، کون لکھ سکے گا؟ شکر ہے کہ وہ ان خاکوں میں کہیں کہیں اپنا بیان بھی کر جاتے ہیں۔ پروفیسر حبیب اللہ غضنفر کی ترجمہ نگاری کے بیان میں وہ اپنے والد کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ انھیں بھائی جان کہتے تھے کہ انھوں نے انگریزی کی ایک کتاب پڑھی جو اتنی پسند آئی کہ انھوں نے اس کتاب a world we cannot see کا اردو ترجمہ شروع کر دیا۔ غضنفر صاحب نے اس کا اردو نام تجویز کیا' جہان نادیدہ' جو ان کے والد کو بہت پسند آیا۔ جیسا کہ' آنگن میں ستارے' مطبوعہ جنوری 2001 میں بتایا گیا ہے۔ انھوں نے براہ راست اپنے خاندانی پس منظر اور اسلاف کے بارے میں بہت کم معلومات پیش کی ہیں۔

میں ان کی تحریروں کا گرویدہ اس لیے ہوں کہ ان کے اوراق میں مجھے ایک تہذیبی تسلسل، ایک رنگا رنگ ثقافتی اکائی نظر آتی ہے۔ میں نے نقوش شخصیات نمبر (دو جلد) ان دنوں پڑھا جب میں میڈیکل کالج پہلے سال کی تعطیلات گزارنے کی خاطر اپنے ایک بزرگ کا مہمان تھا۔ ان شخصیتوں کے تفصیلی کارناموں نے میرے دل و دماغ پر ایسا اثر ڈالا کہ میں اپنی زبان اردو اور اس کے تحریری اور تقریری امکانات کی ہمہ گیری کا قائل ہو گیا اور خاکوں کی کوئی کتاب مجھے مل جاتی ہے تو وہ ہاتھ سے نہیں چھوٹتی، کہ میں ان رفتگاں اور قائماں کی کارگزاریوں کو اپنی علمی وراثت کا حصہ سمجھتا ہوں۔ اسلم فرخی کے ان تمام خاکوں میں ان لوگوں کا ذکر بھی برائے بیت آیا ہے، جو ان سطور میں تو ذیلی حیثیت رکھتے ہیں لیکن اپنی الگ اہم پہچان رکھتے ہیں، اس واسطے مجھے ان کے ذکر سے یک گونہ قربت کا احساس ہوتا ہے جیسے مالک رام کے بارے میں لکھتے ہوئے بتاتے ہیں کہ انھوں نے نواب سراج الدین خان سائل دہلوی اور نواب صدر یار جنگ کے جو خاکے لکھے ہیں وہ اردو خاکوں کے مرقعے میں بڑے زندہ جاندار اور دلکش نظر آتے ہیں۔ میرا ذہن ان کے علم و فضل کی روشنیوں سے چراغاں ہونے لگتا ہے۔ سائل دہلوی پر جمیل الدین عالی کا خاکہ بھی بھرپور ہے لیکن مالک رام نے ان کو اپنے طور پر دریافت کیا ہے۔ سارا حسن تو دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے، وہ اپنی دیدہ وری میں اوروں کو بھی شریک کر لے تو نور علی نور۔ وہ صرف ماضی کی تصویر کشی نہیں کرتے لمحہ حاضر کی لاعلمی، کم کوشی اور ذہنی ناداری کو بھی مثال دے کر نمایاں کرنا نہیں بھولتے۔ 'پندرہ فروری' کو مالک رام صاحب نے غالب اکیڈمی کی جانب سے مزار غالب پر ایک یادگار مشاعرہ کیا...... چنانچہ میں مشاعرے میں جا پہنچا......

اتفاق ہے کہ مشاعرے میں آخور کی بھرتی بہت تھی۔ جانے کہاں کہاں کے مبتدی اور نو مشقیے جمع ہو گئے تھے۔ ایک نوجوان نے مطلع پڑھا خیر سے دونوں مصرعے ناموزوں اور مطلع دولخت، الفاظ کا تلفظ بھی عامیانہ۔ میں نے مالک رام صاحب کی طرف دیکھا، مسکرا کر کہنے لگے 'دلی میں ادھر ادھر سے لوگ آ جاتے ہیں۔ ساری فضا کو خراب کر دیتے ہیں۔' مشاعرے کے بعد افسردہ ہو کر کہنے لگے۔' اب دلی وہ دلی نہیں رہی... مگر کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔ (ص 40 آنگن میں ستارے)۔ یہ افسوسناک صورت حال دلی تک محدود نہیں اب مشاعروں کا اعلان اردو رسم خط میں نہیں ہوتا حتیٰ کہ اسٹیج کے اوپر بینر بھی اردو میں نہیں کسی اور رسم خط میں لکھے جاتے ہیں ... پڑھیے تو موسائیرا ہو جائے گا۔ مالک رام صاحب کو کیا معلوم تھا کہ اردو کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا حال برا ہوتا جا رہا ہے۔ وہ اپنے اعلیٰ علمی کاموں میں لگے رہے اور اردو کا چراغ گل ہوتا گیا۔ کیا اب کوئی دوسرا مالک رام پیدا ہو سکے گا؟؟ ان کے خاکوں کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ ان میں زیرِ قلم شخص کی خوبیوں کو ہی اجاگر نہیں کرتے، ان کی بشری کمزوریوں کو بھی اپنے رواں دواں اسلوب میں اس طرح بیان کر جاتے ہیں کہ عیب جوئی کا گمان گذرے بغیر، مزاج کا حصہ معلوم دیتا ہے۔ نورالحسن جعفری صاحب کے متعلق انھوں نے ہنسی ہنسی میں ان کی ایک خصلت کا ذکر کیا ہے' دراصل جعفری صاحب پکے موحد تھے۔ ہر بات لا سے شروع کرتے۔ الا اللہ' کی منزل تک بڑی مشکل سے آتے تھے..... پہلے جملے کا آغاز زوردار نہیں سے ہوتا تھا، کبھی کبھی نہیں ان کا تکیہ کلام معلوم ہوتا تھا۔ مگر جب دباؤ پڑتا یا سمجھایا جاتا تو مان جاتے۔

جعفری صاحب دوسروں کی خوبیوں کا اعتراف کرتے تھے لیکن اپنے طور پر جانچ پڑتال کے بعد۔ انجمن میں جعفری صاحب کا رویہ عملے کے ساتھ عام طور پر، مشفقانہ ہوتا تھا لیکن دفتری معاملات میں وہ اصول پسند اور سخت تھے۔ اس کی وجہ سے بعض اوقات بڑی الجھن بھی پیش آتی تھی۔ عملے کو جھاڑ بھی پلا دیتے تھے۔ لوگ برداشت کرتے تھے کچھ جواب دینے کی جرات بھی کرتے، مگر مرحوم ضمیر الحسن عباسی نے ان کی جھاڑ کا جواب بھی دیا اور پھر رخصت پر چلے گئے۔ چھٹی ختم ہوئی تو استعفیٰ بھیج دیا۔ مرتے مر گئے مگر پھر انجمن نہیں آئے۔ ان کے جانے کے بعد ایسا خلا پیدا ہوا جو کبھی پر نہ ہو سکا۔ جعفری صاحب کو افسوس بھی ہوا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ان کی نیک خوئی اور ہمدردی کے واقعات بھی بیان کیے ہیں فرخی صاحب نے جو کہ انجمن میں ان کے ساتھ کام کرتے رہے تھے، کسی کی مدد کرنے کا واقعہ بھی لکھا ہے کہ رقم بھجواتے ہوئے تاکید کر دی کہ ان کا نام نہ بتائیں۔ یہ عالی ظرفی ان کو وراثت میں ملی تھی۔ جعفری صاحب کے بارے میں بات کچھ زیادہ لمبی ہو گئی لیکن باون گز کے بیان کو ایک سفینہ چاہیے۔ وہ ذی علم ہونے کے ساتھ قلم کے بھی دھنی تھے اور ان کے مضامین ذان اور دوسرے

معیاری جریدوں میں چھپتے تھے۔ مگر جتنا علم ان کے پاس تھا اس کا بہت کم حصہ ان کی لکھائی میں سما سکا۔ وہ کڑی محنت اور پتّا مار کر کام کرنے کے عادی تھے۔ قومی زبان اور اردو کے ہر شمارے کو وہ پوری توجہ سے پڑھتے تھے۔ ایک ایک لفظ دیکھتے، پروف ریڈنگ کی شکایت کرتے کبھی کبھی مضامین کے بارے میں اظہار خیال کرتے۔ غرض کہ یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جعفری صاحب عالی ظرف، شریف النفس اور دردمند انسان تھے۔ نکموں اور خوشامدیوں سے چڑتے تھے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ادا جعفری کا ذکر بھی یہیں کر دیا جائے۔ وہ واحد خاتون ہیں جو' آنگن میں ستارے' میں جگمگا رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ خاکہ نگار جب تک کسی کو قریب سے نہ دیکھے نہ جانے اس پر کس طرح قلم اٹھا سکتا ہے۔ فرخی صاحب ایک خاص نہج کے آدمی تھے، ان کو کسی ادیبہ یا ہم پیشہ خاتون سے ملنے اور ان کو جاننے کا موقع کیسے ملتا۔ شکر ہے کہ انھوں نے ادا جعفری کو قریب سے دیکھا جانا، اور پھر ان کو موضوع گفتگو بنایا۔ جن کو فرخی صاحب نے ایک سادہ اور باوقار انسان کی حیثیت سے پہچانا۔ وہ ان کے پہلے مجموعہ' میں ساز ڈھونڈتی رہی' کی اشاعت سے ہی ان کی کئی نظموں سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ پھر 1967 کی نظم مسجد اقصیٰ نے اہل نظر کو چونکایا تھا۔ اس پس منظر میں ان سے پہلی ملاقات کا ذکر کرتے ہیں۔ شعبہ اردو کے طلبا نے انھیں مدعو کیا تھا۔ ہلکے صوفیانہ رنگ.. چہرے پر حیا کی لہر... ہاتھ میں قدیم وضع کا ایک بٹوا جس میں بن دھنے قسم کی کوئی چیز۔ یہ مشرقی سراپا بہت متاثر کرتا ہے۔ انھوں نے اپنے اعزاز کی تقریب میں انکسار، معصومیت بڑے دھیمے اور شائستہ لہجے میں اپنی شاعری کی بات کی اور اپنے بچوں کا بھی تذکرہ کیا۔ اور یہ اعتراف کیا کہ میں اول اور آخر ایک ماں ہوں۔ آج نسائی حسیت کی بات کرنے والے اسے ایسا رخ عطا کر رہے ہیں جو ہماری اقدار سے لگا نہیں کھاتی۔ خواتین میں سن گن لینے، ٹوہ لگانے، شوہروں پر دھونس گانٹھنے اور بدگمانی برتنے کی عادت بالعموم ہوتی ہے ....ادا بہن اس انداز کی قائل نہیں۔ جعفری صاحب ان سے خوش وہ جعفری صاحب سے مطمئن۔ ممتاز مفتی نے اس نباہ کو اپنے طور سے دیکھا ہے۔' ادا جعفری اور ان کے شوہر نور الحسن جعفری کی خوشگوار زندگی کے راز کو بھی مصنف نے پایا ہے اور وہ اس کا انکشاف اس طرح کرتے ہیں کہ اس میں جو پیچ لگے ہیں وہ ہم آہنگ نہیں تھے ایک گول دوسرا چوکور میاں مکمل طور پر ایکسٹروورٹ اور بیوی کلیتاً انٹروورٹ، میاں خارجی علوم سے آراستہ بیوی کے پاس تاروں کی رم جھم کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس شادی کی کامیابی کے لیے ادا کے پاس ایک چیز تھی مدھم محبت کی ایک پیہم لرزش۔ جعفری کی نسبی اور خاندانی شرافت نے اس شادی کو کامیاب کیا (ص 83، اونچے لوگ، اردو سوانح نگاری آزادی کے بعد)۔ فرخی صاحب نے ادا بہن کی گوناگوں خوبیوں اور صبر و تحمل کی مثالیں دے کر یہی نتیجہ نکالا ہے کہ ادا بہن کی ساری شخصیت حسن معاملہ اور نیک نیتی سے عبارت ہے۔

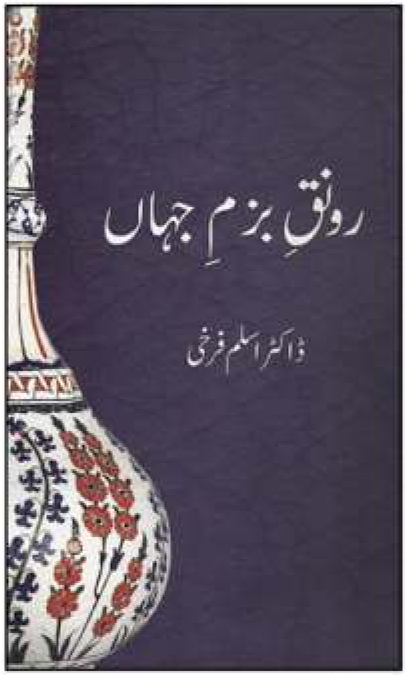

اسلم فرخی کی خاکہ نگاری کی زنبیل میں بہت کچھ ہے۔ حکیم چھٹکے باز جیسے نادر روزگار، معروف صحافی ضمیر نیازی، شہرت سے بے نیاز واصل عثمانی، درویش خدا مست محمد احمد سبزواری، رقص کرنے والا بگولہ حمید نسیم جن کے بیان کو دفتر چاہیے۔ مجھے اطمینان اس بات کا ہے کہ ان میں سے بیشتر ایسے ستارے بھی ہیں جن سے میرے ذہنی افق کو روشنی ملتی رہی ہے۔

انھوں نے بچوں کے ادب پر بھی خاصا دھیان دیا ہے اور ایک سیریز بچوں کے لیے لکھ دی ہے، جن میں بچوں کے ڈپٹی نذیر احمد، بچوں کے مرزا غالب اور بچوں کے رنگا رنگ امیر خسرو قابل ذکر ہیں۔

موضوع کیسا بھی ہو وہ اسے دلچسپ اور بامحاورہ رواں دواں اسلوب میں کر کے اس طرح لکھ جاتے ہیں جو اسے بوجھل نہیں ہونے دیتا۔ موقع اور محل سے وہ فارسی اور اردو کے مناسب اشعار سے مضمون کے لطف کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ لکھے ہوئے لفظ کی حرمت اور طلاقت کا پاس جتنا ان کے قلم کو رہا ہے وہ ان دنوں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہوتا جا رہا ہے۔

ان کے اسلاف کا وطن فرخ آباد تھا، گرچہ ان کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی تھی لیکن ان کا تعلق دلی سے بھی تھا کہ ان کی والدہ شاہد احمد دہلوی کی بھانجی اور ڈپٹی نذیر احمد کی پر پوتی ہیں۔ اسی لیے ان کی ذہنی وابستگی دلی اور اہل دلی سے بھی کم نہیں ہے۔ ان کا ننہالی خانوادہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ سے بہت عقیدت رکھتا تھا۔ اپنے نام کے بجائے انھیں صاحب جی سلطان جی کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ انھوں نے اس نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہے اور' بچوں کے سلطان جی' کے عنوان سے ان کے لیے دوسری کتاب لکھی ہے۔ مجھے یاد نہیں لیکن شاید افتخار اجمل شاہین نے بتایا تھا کہ خواجہ صاحب پر انھوں نے اور کتابیں بھی لکھی ہیں جن کو دیکھنے کا مجھے موقع نہیں مل سکا شاید دبستان نظام ایسی ہی تصنیف ہے اور بچوں کے سلطان جی بھی۔ ان کی دوسری معروف کتابیں ہیں: فرید و فرد فرید جو بابا فرید شکر گنج استاذ حضرت نظام الدین کے بارے میں ہے۔ میں اسے بار بار پڑھتا رہا ہوں اور اس کے انداز بیان اور سادہ اسلوب کی داد دیتا رہا ہوں۔ بچوں کے لیے انھوں نے اور کتابیں لکھی ہیں جن میں بچوں کے رنگا رنگ امیر خسرو اور چند برسوں پہلے 2012 میں چھپنے والی قلفی والی سائیکل ہے۔ گلدستہ احباب بھی ان کی تصنیف مجھے کسی ذریعے سے ملی تھی۔ لیکن انھوں نے اپنے دستخط اور نیک خواہشات سے جو کتاب مجھے بھجوائی تھی وہ تھی آنگن میں ستارے۔ جو ایسی شخصیتوں کے بارے میں ہے جن کو وہ بھولے نہیں۔ (یہ کتاب الگ مطالعے کی طلبگار ہے) اس سلسلے کی آخری کتاب، بہار جیسے لوگ، ہے جو مجھے نصیب نہیں ہو سکی۔ لیکن ان کی تمام تصنیفات میں ایک تہذیبی اور ثقافتی شائستگی کے واضح نشانات ثبت ہیں جو ہماری وراثت کا ایک ایسا روشن باب رقم کرتے ہیں جو وقت کی گرد میں گم ہوتا جا رہا ہے۔

فرخ آباد، لکھنؤ، دلی اور کراچی میں اپنی آب و تاب دکھا کر یہ روشن چراغ جامعہ کراچی کے قبرستان میں 16 جون 2016 کو ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا۔ اب انھیں ڈھونڈھ چراغ رخ زیبا لے کر

وہ اپنی مسند علم و فضیلت کر گئے خالی
انھیں لائیں کہاں سے تھی جنھیں پہچان لفظوں کی

■

Arman Najmi C/o Dr. S. Hassan
Peeli Kothi, Mohalla Baqarganj
P.O: Bankipur, Patna 800004 (Bihar)

مظفر حسین سید

عندلیب گلشن خود آفریدہ

خلیق انجم کی یاد میں

خلیق انجم اسم با مسمّٰی تھے، حسن اخلاق کا پیکر یعنی خلیق اور آسمان اردو کا اختر درخشاں یعنی انجم، اپنے قلمی سفر کی ابتدا میں انھوں نے اپنا قلمی نام خلیق اقبال رکھا تھا، اگر یہ نام برقرار رہتا تب بھی وہ اسم با مسمّٰی ہوتے کہ بلند اقبال ہونا تھا۔ خوش بختی، خوش مزاجی، خوش مذاقی، خوش کلامی، خوش فکری، خوش رقمی کے ایسے مجسمے کم نظر آتے ہیں، جیسے کہ (اب مرحوم) خلیق انجم تھے، کم از کم راقم الحروف نے ان کے مثل خوش سلیقہ، خوش طریق، خوش خیال اور خوش طبع اشخاص اقلیت میں ہی پائے ہیں۔ اسی پر آیت نہیں، اور بھی کئی خوش تھے جو ان کے وجود میں یکجا تھے، مثلاً خوش پوشی، خوش خرامی اور خوش قلبی۔ ہمیں فخر ہے کہ ہم نے 'خلیق' کو دیکھا تھا۔ یہی نہیں ہم نے انھیں، سنا، برتا اور ان سے خاطر خواہ فیض حاصل کیا، گرچہ اس کوتاہ قلم کا یہ بیان بعض 'حبسی' مزاج کے حاملین کو مبالغہ آرائی پر مبنی محسوس ہو سکتا ہے، مگر جن با نصیب اردو دانوں نے خلیق انجم نام کے ایک متحرک ادارے کو بالمشافہ دیکھا اور ہم کلامی کا شرف حاصل کیا، انھیں اپنے تمام تر تحفظات کے باوصف اس ناچیز سے اتفاق ہو سکتا ہے۔

جی ہاں خلیق انجم محض ایک ذات فعال کا ہی نام نہیں تھا، بلکہ وہ ایک شخص خود اپنے وجود میں ایک ادارہ تھا، اور ادارہ بھی کثیر الجہت، ہمہ گیر، نیز اپنے آپ میں مکمل، ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک ہی شخص، بیک وقت عالم، مفکّر، مصنف، مولف، مدوّن، ناقد، محقق، مرتب، مدرس اور منتظم ہی نہیں، بلکہ اپنی حیات مصروف کے حاشیے پر ایک ماہر عکاس، برق کار، 'کارباز' اور باغبان بھی ہو، اسی پر بس نہیں اسے آثار قدیمہ کی شناخت اور فن تعمیر کی معقول فہم بھی ہو، مگر یہ تمام ناممکنات، ممکن ہوئے، کہ اس فرد فرید کا نامی اسم گرامی خلیق انجم تھا، جی، ہاں ڈاکٹر خلیق احمد خاں، المعروف بہ خلیق انجم۔ ان کی شخصیت کو چند لفظوں میں سمونا ہو تو یہ مصرعہ کافی ہے۔ ع وہ تھا ظریف وخوش اندیشہ وشگفتہ دماغ بہ اعتبار حلیہ، خلیق انجم کی شخصیت ہرگز غیر معمولی نہیں تھی، وہ نہ حسین وجمیل تھے، نہ سرخ وسفید، ان کا رنگ ہلکا سانولا، اور ناک موٹی، ہونٹ بھی موٹے، البتہ آنکھیں بڑی بڑی تھیں، قد نہ دراز نہ پست، مگر میانہ سے قدرے سوا، بال ایک طریق سے ترشے ہوئے اور سلیقے سے سنورے ہوئے۔ چہرہ ریش سے عاری، آنکھوں پر بصارتی عینک۔ یہ تھا، ان کا ایک عام آدمی جیسا حلیہ، البتہ خوش لباس تھے، اور کوئی بات تھی کہ مجمع میں لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کر لیتے تھے۔ شاید اسی کو اقبال کہتے ہیں، اور سب پر سوا ان کی مہارت گفتگو تھی، جس سے وہ عام ہی نہیں، خاص انسانوں کے اجتماع پر بھی بھاری پڑتے تھے۔ ہر عظیم وکامیاب شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں اس کے اساتذہ کا زبردست دخل ہوتا ہے یہ معاملہ خلیق صاحب کے ساتھ بھی تھا، دوران تعلیم ثانوی، انھیں رہبر پرتاب گڑھی، فرقت کاکوروی، شمیم کرہانی اور زبیر قریشی جیسے لائق ومشفق استاد نصیب ہوئے۔ دانشگاہ سید پہنچے تو دیگر اکابرین کے علاوہ جذبی صاحب کی راہ نمائی حاصل ہوئی۔

خلیق صاحب اصلاً ونسلاً پٹھان تھے روہیلہ پٹھان، ان کی پٹھانیت مستند تھی، اگرچہ افغانستان سے آئے صدیاں بیت گئی تھیں مگر اب بھی پختونی خون رگوں میں موجیں مار رہا تھا، ایک مرتبہ کسی فوجی افسر سے انھوں نے کہا تھا، "جناب! آپ ہماری نرم گفتاری وشریفانہ روش پر نہ جائیے، ہم پشتینی جنگجو ہیں، پیشۂ آبا سپہ گری ہے، ہمارے اجداد کا مشغلہ صدیوں تک جنگ وجدل رہا ہے۔ یہ تو پتہ نہیں کیسے ہمارے دادا پڑھ لکھ کر بگڑ گئے اور خاندانی روایت بدل گئی۔" الغرض وہ اپنی پٹھانیت کے ضمن میں بھی اتنے ہی حساس تھے جتنے اپنی دہلویت کے باب میں۔ جیسا کہ مذکور ہوا، اگرچہ خلیق صاحب کا خاندان روایتی طور پر سپہ گر تھا، مگر ان کے دادا تعلیم یافتہ تھے اور والد جدید علم کے حامل، ان کی والدہ بھی سند یافتہ تھیں، لیکن اصل فیض ان کے نانا کا تھا، جو صاحب علم بھی تھے، صاحب قلم بھی، اور اس پر طرہ یہ کہ فرنگیوں کو تعلیم دیتے تھے۔

دلچسپ بات یہ کہ خلیق انجم دہلوی بھی تھے اور علیگ بھی، لیکن انھوں نے کبھی ان ہر دو نسبتوں کو اپنے نام کا لاحقہ نہیں بنایا، اگرچہ انھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تدریس یافتہ ہونے پر بھی فخر تھا، اور دہلی کا پروردہ ہونے پر بھی۔ علی گڑھ میں ان کا قیام مختصر تھا، یوں بھی علیگیت پس پشت چلی گئی تھی۔ مگر ان کی دہلویت کی جڑیں بہت گہری تھیں اور انھیں اپنی دہلویت پر گونہ فخر، بلکہ غرّہ تھا، اگر کبھی دہلویت پر آنچ آنے لگتی تو وہ پنجے جھاڑ کر، اپنی تمام تر شرافت ونجابت کو کنارے کر میدان میں اتر آتے تھے، بقول راوی انھوں نے ایک مرتبہ حضرت دہلی کی توہین کے مرتکب ایک مقرر کو براہ راست دعوت مبارزت دے ڈالی تھی، خیریت یہ ہوئی کہ فریق ثانی کا واکاٹ گیا، ورنہ پتہ نہیں کیا کارزار گرم ہوتا اور دہلویت کا یہ نگہبان عسکری کیا رنگ دکھاتا۔

خلیق صاحب اس امر کے معترف تھے کہ ان کی گل تو دہلی کی ہے، مگر ان کے وجود خاکی پر رنگ و روغن علی گڑھ کا ہے، اگرچہ اعلیٰ تعلیم بوجوہ وہاں حاصل نہ ہو سکی تھی، جس کا انھیں شدید ملال تھا، کبھی کبھار از راہ لطف کہتے تھے، "بھائی آپ لوگ سند بند علیگ ہیں، ہم تو

جز وقتی عِلّیگی ہیں‘‘۔ البتہ ان تمام باتوں کے باوصف، وہ اگر معاشرتاً دہلی والے تھے تو تہذیباً علی گڑھ والے تھے، وضع داری دہلی کی تھی، حسن اخلاق علی گڑھ کا۔ ہم نے ایک بار تفریحاً پوچھا’’ آپ علی گڑھ کی مخصوص منافقت سے کیسے محفوظ رہ سکے؟‘‘ اس پر انھوں نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور بولے،’’ارے بھائی، ہمیں اتنا وقت ہی کہاں ملا کہ منافقت کے اوصاف سے جھولی بھرتے، اس لیے کم از کم اس معاملے میں تو ہم تہی دست واپس آئے‘‘۔

خلیق انجم ادارہ ساز تھے، بحیثیت معتمد عمومی انجمن ترقی اردو (ہند)، ان کا دور عملی بابائے اردو مولوی عبدالحق کے طویل دور کارگزرگی کے ارب قریب تھا۔ بابائے اردو کی بے مثل خدمات کا منکر کون کافر ہو سکتا ہے، لیکن اگر علامہ شبلی و مولانا ابوالکلام آزاد، انجمن کے بنیاد گزار تھے، مولوی عبدالحق اس کے توسیع کار تھے، قاضی عبدالغفار اردو کے اس ایوان لرزیدہ کو قوت و طاقت بخشنے والے تھے اور آل احمد سرور اسے ایک ہمہ گیریت، دیر پا فعالیت عطا کرنے والے تھے، تو خلیق انجم اس کے استحکام مستقل کے ضامن، نیز اس ادارے کو خود کفیل بنانے والے تھے۔ ان کا کمال نادر اور کارنامہ روشن یہ تھا اور ہے کہ انھوں نے انجمن کو نہ صرف حفاظتی دیواریں، اس کا بوجھ اٹھانے والے ستون اور مضبوط چھت بخشی، بلکہ اس کی برقراری اور استقراری کا اہتمام بھی کر دیا کہ آج اردو کا یہ قدیم، تاریخی ادارہ اپنے وجود کی بقا اور اپنی نشو و نما کے لیے کسی کا محتاج نہیں، حکومت وقت کی ناکافی امداد کا بھی نہیں۔ اگر ان کی تمام ادبی و علمی خدمات کو ایک جانب رکھ کر انھیں ایک پردۂ زنگاری سے چھپا دیا جائے، تب بھی صرف انجمن کا استحکام، اہتمام و انصرام اور اس کی پناہ گاہ ’اردو گھر‘ کی تعمیر ہی ان کا ایسا کار عظیم ہے کہ وہ تاریخ اردو کے ایک روشن باب کے عنوان کی حیثیت سے سدا جلوہ گر رہیں گے۔ اگر مختصراً کہا جائے تو انھوں نے ’بے گھر‘ اردو کو ’گھر‘ دیا، اسے مفلسانہ لباس بوسیدہ سے نجات دلا کر باثروت عمدہ لباس کا متصرف بنا دیا، حق یہ ہے کہ آج کے اردو گھر میں اردو کی سرگرمیوں اور اہل اردو کارکنان کو دیکھ کر ہر دردمند اردو کو گونہ طمانیت کا احساس ہوتا ہے، اب کسی کو اردو پر ترس نہیں آنا چاہیے۔

خلیق انجم مستقل مزاج تھے، عزم محکم کے حامل تھے انھوں نے شعراء، ادباء کی ہمت افزائی کی اور حتی الوسع ان کی مدد بھی کی، اردو کتب کی اشاعت کا باقاعدہ نظام بنایا، تاکہ اردو زبان و ادب کی محض نمائش نہ ہو بلکہ اس کی حقیقی ترویج و اشاعت ہو۔ آمد آفتاب، دلیل آفتاب‘ کے مصداق ان کے اس کار عظیم کو کسی ثبوت کی چنداں حاجت نہیں۔ ’اردو گھر‘ کی تعمیر و تشکیل کا قصہ بھی بڑا دلچسپ و سبق آموز ہے اگرچہ اس کی داغ بیل خاصی پہلے دور سرور میں پڑ چکی تھی، بعض مجاہدین اردو کی جہد مسلسل کے ثمر کے طور حکومت وقت سے ایک قطعہ زمین بھی حاصل ہو گیا تھا، سنگ بنیاد بھی رکھا جا چکا تھا اور ابتدائی تعمیر کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ مگر اس کی تکمیل و آرائش کی کوئی سبیل تاحد نظر نہ تھی۔ اس وقت تک انجمن کا صدر دفتر علی گڑھ میں، سلطان جہاں منزل کے ایک حصے میں تھا اور برسوں سے تھا، اگرچہ اس کا یہ مسکن تاریخی تھا، وسیع و عریض تھا تاہم اپنا نہ تھا، پرایا تھا، کہ انجمن رسماً ہی سہی مگر کرایہ دار تھی اسے مالکانہ حق حاصل نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ اس کار خیر کا سرانجام ہونا خلیق انجم کے مقدر میں تھا کہ اردو کو اس کا گھر نصیب ہو، دفتر حاصل ہو، اس کے استحکام دائمی کا بندوبست ہو، سو ہوا۔ برسوں پہلے بابائے اردو مولوی عبدالحق نے یہ طے کیا تھا کہ انجمن ترقی اردو کا صدر دفتر جب بھی بنے گا اس کا نام ’اردو گھر‘ رکھا جائے گا، کہ اس میں سادگی بھی تھی اور ہندوستانیت بھی۔

خلیق انجم نے صرف ایوان اردو ہی تعمیر نہیں کیا بلکہ اس کے مکینوں اور پناہ گزینوں کے مفادات کے تحفظ کا مستقل اور دیرپا، ایسا نظام تشکیل دیا کہ وہ ہمیشہ خود کفیل رہے، یعنی کرائے کا بندوبست، جس میں گرانی کے ساتھ خودکار طریقے سے اضافہ ہوتا رہے گا۔ انھوں نے عملے کی حقیر تنخواہوں کو خطیر مشاہروں میں تبدیل کیا، جس کا نتیجہ یہ کہ آج اردو کے اس ادارے کے کارکنان کے ماہانہ مشاہرے، مرکزی حکومت کے ملازمین کے مساوی ہیں، کام کا ہفتہ پانچ روز کا ہے اور وہ تمام آسائشیں و مراعات بھی میسر ہیں، جو کسی بھی زمرے کے کسی اوسط ادارے میں ممکن

سوانحی کوائف

اصل نام: خلیق احمد خاں، **قلمی نام:** خلیق انجم، **تاریخ پیدائش:** 22 دسمبر 1935، **والد:** مرحوم محمد احمد (ریلوے انجینئر) **والدہ:** مرحومہ قیصر سلطانہ (صدر مدرّس)، **دادا:** اصغر خاں، **پر دادا:** ثمر خاں، **بہن بھائی:** بھائی کوئی نہیں، پانچ بہنیں۔ **شریک حیات:** مومنی انجم (سابق پروفیسر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) **اولاد:** سیما انجم (استاد، انگریزی)، ثمر انجم (مقیم کناڈا)

تعلیم: ایم اے، پی۔ ایچ۔ ڈی (اُردو)

مناصب: لکچرر کروڑی مل کالج، دہلی، ڈائریکٹر وزارت تعلیم، حکومت ہند، جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند، نائب صدر، انجمن، ترقی اردو، ہند۔

ادارت: اعتماد یہ (اسکول میگزین)، ماہنامہ جھلک (علی گڑھ)، سہ ماہی ادبی تبصرے (دہلی)، پندرہ روزہ۔ سیکولر ڈیمو کریسی (دہلی)، سہ ماہی اردو ادب۔ (دہلی) ہفت روزہ۔ ہماری زبان (دہلی)

ادبی خدمات: غالب کی نادر تحریریں (ترتیب)، مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط (فارسی سے ترجمہ)، مرزا محمد رفیع سودا (تصنیف)، متنی تنقید، غالب اور شاہان تیموریہ (تصنیف)، غالب کے خطوط (ترتیب)، فیض احمد فیض: تنقیدی جائزہ (ترتیب)، مشفق خواجہ: ایک مطالعہ (ترتیب)، مولانا ابوالکلام آزاد: شخصیت اور کارنامے: (ترتیب)، رسوم دہلی (ترتیب)، دلّی کے آثار قدیمہ (ترجمہ)، دلّی کی درگاہ شاہ مرداں (تالیف)، محی الدین قادری زور (ترتیب)، انتخاب خطوط غالب (ترتیب)، آثار الصنادید (ترتیب۔ تین جلدوں میں)، غالب: کچھ مضامین۔ ترتیب، ڈاکٹر فرمان فتح پوری: شخصیت اور ادبی خدمات: کتاب نما۔ خاص نمبر، مولوی عبدالحق: ادبی اور لسانی خدمات (ترتیب)، مرقع دہلی (فارسی متن: ترتیب و ترجمہ)، جگن ناتھ آزاد: حیات اور ادبی خدمات (ترتیب) پروفیسر نثار احمد فاروقی (کتاب نما۔ خاص نمبر) راج بہادر گوڑ: حیات اور ادبی کارنامے (ترتیب)، انتخاب خطوط غالب (ترتیب)، حسرت موہانی (تصنیف)، فن ترجمہ نگاری (ترتیب)، انتخاب کلام حسرت موہانی (ترتیب)، پنڈت آنند نرائن ملا کی ادبی خدمات (ترتیب)، پروفیسر مسعود حسین خاں: ایک جامع حیثیات شخصیت (ترتیب)، جوش ملیح آبادی کے خطوط (ترتیب)، گل کاری وحشت کا شاعر: مجروح (ترتیب) خواجہ غلام السیدین (ترتیب)، غالب کا سفر کلکتہ: ادبی معرکہ (ترتیب)

انعامات و اعزازات: غالب انسٹی ٹیوٹ تحقیق و تنقید ایوارڈ • حلقۂ نگاراں، کراچی، انٹر نیشنل ایوارڈ • اتر پردیش اردو ایوارڈ • بہار اردو اکادمی ایوارڈ • اتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ • دہلی میونسپل لٹریری ایوارڈ • مغربی بنگال اردو اکادمی، نیشنل ایوارڈ • غالب ویلفیئر سوسائٹی ایوارڈ • ذوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ایوارڈ • عالمی اردو ایوارڈ • مدھیہ پردیش اردو اکادمی، ایوارڈ • مساوات انڈیا، نیشنل انٹیگریشن ایوارڈ۔

نہیں، خلیق صاحب کی غریب پروری کا عالم یہ تھا کہ جو ضرورت مند آیا، اس کی خاطر خواہ مدد کی، بلکہ ممکن ہوا تو مستقل ملازمت بھی دے دی۔ ان کی پرورش غربا کا ذکر آیا ہے تو یہ حوالہ برمحل ہے کہ وہ اپنی ذاتی آمدنی سے نہ صرف بہت سے طلبا کی سرپرستی فرماتے تھے بلکہ اردو کے کئی ادیبوں، شاعروں کی مدد بھی اس خاموشی سے، یوں کرتے تھے کہ کسی تیسرے کو بھنک بھی نہ لگ پاتی تھی، یہ راز تو بعد میں خود حاصلین امداد نے افشا کیا۔

اس مرفوع القلم کو اس امر کے اعتراف میں ذرا بھی باک نہیں کہ عالی قلم خلیق انجم سے اس کے کسی قسم کے گہرے روابط نہ تھے، کسی تعلق خاص کا دعویٰ بھی نہیں، تاہم موصوف کے ساتھ اس ناچیز کے روابط و ایک قسم کی ذہنی مفاہمت کا عرصہ کم و بیش چالیس برس کو محیط ہے، اس تحریر ناقص کی اساس انھی یادہائے منوّر پر ہے، جو مرحوم خلیق صاحب سے منسلک ہیں۔ راہ و رسم گہری اور ملاقاتیں متواتر نہ سہی، مگر اس ناسواد کو خلیق صاحب کو قریب سے دیکھنے، پرکھنے اور استفادہ کرنے کا موقع خوب ملا کہ ربط و ضبط وافر تھا۔ اس میں ربط شاید ہمارا ہو، مگر ضبط انھی کا تھا۔ ان سے رابطے کا ایک خاص الخاص وسیلہ 'ہماری زبان' تھا، جس کے وہ مدیر اعلیٰ تھے اور یہ کم فہم اس کا صفرسن مضمون نگار۔ قلم بازی کے ابتدائی دور میں انھوں نے اس محدود القلم کو بھرپور مواقع فراہم کیے اور بے محابا ہمت افزائی کی۔ مضمون نگاری، اکثر و بیشتر تھی اور تبصرہ نگاری، تقریباً مستقل۔ ان دنوں خاکسار کا ایک مضمون 'اردو کا مقدمہ' خاصے تذکروں میں رہا تھا، خلیق صاحب کو وہ معمولی سا مضمون یوں پسند آیا تھا کہ اس میں (بقول ان کے) بڑی تلخ و تند باتیں تھیں اور اردو کے نام نہاد پرچم برداروں پر گہری چوٹ کی گئی تھی، بلکہ دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا گیا تھا۔ یہ وہ مضمون تھا، جس پر ناز انصاری، شہباز حسین و دیگر کئی اکابرین صحافت نے اس خاکسار کو داد دی تھی۔

فکر تونسوی کے طنزیہ مضامین کا اوّلین مجموعہ منظر عام پر آیا تو خلیق صاحب نے کتاب تبصرے کے لیے اس ناچیز کو عنایت فرمائی، اگرچہ کئی خرانٹ قلم کار اس پر تبصرہ کرنے کے خواہش مند تھے۔ کتاب انجمن نے شائع کی تھی اور اس کا پیش لفظ خود خلیق صاحب نے تحریر کیا تھا۔ خاکسار نے تبصرہ لکھا، بڑی محنت سے لکھا، اور حسب عادت طویل لکھا، خلیق صاحب نے اسے نہ صرف پسند کیا، بلکہ اس کی طوالت کو بھی انگیز کیا۔ تب تک راقم کی فکر تونسوی صاحب سے ذاتی ملاقات نہ تھی، پھر ستم یہ ہوا کہ کناٹ پلیس کے کافی ہاؤس میں ہر روز برپا ہونے والی، ادیبوں، شاعروں کی پارلیمان میں جب یہ معاملہ زیر بحث آیا تو کئی حضرات نے یہ اعتراض داغ دیا کہ اتنے معروف ادیب کی کتاب پر ایک نووارد قلم کار تبصرہ (تنقید) کرے، یہ کتاب کے شایان شان نہیں، لہٰذا تبصرہ رام پرکاش راہی لکھیں گے۔ اس تجویز سے خلیق صاحب کو بھی آگاہ کر دیا گیا، اور انھوں نے پتہ نہیں کس دباؤ میں یہ تبدیلی قبول کر لی، اگرچہ خاکسار سے معذرت کی اور برملا کہا، ''تمھارا تبصرہ، دوسرے تبصرے سے بہتر ہے، مگر

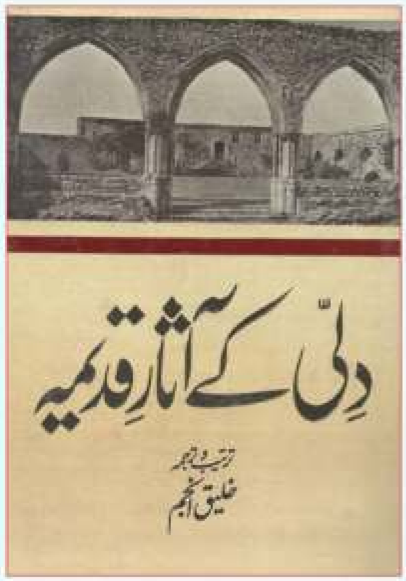

میں مجبور ہوں کہ فکر صاحب بڑے قد آور قلم کار ہیں۔ خیر سے اس ناچیز کا تحریر کردہ تبصرہ قربان ہوا اور راہی صاحب کا تبصرہ شائع ہوا، اس وقت ہمیں یہ عقل نہ تھی کہ اس تبصرے کو کہیں اور شائع کرا لیا جاتا۔ اب اس قصے کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ بعد ازاں جب فکر صاحب سے اس نارسا نے ملاقات کی اور ان سے اپنا درد بیان کیا تو انھوں نے اس کے تبصرے کا بغور مطالعہ کیا اور بے تکلف کہا، ''آپ کا تبصرہ شائع شدہ تبصرے سے بدرجہا بہتر ہے''۔ انھوں نے اس ضمن میں اپنی صفائی بھی پیش کی کہ جو ہوا، وہ ان چاہے، ان جانے میں ہوا۔

ایک مرتبہ خلیق صاحب نے ناچیز کو ایک نئی کتاب، 'صحت الفاظ'، مولفہ سید بدرالحسن، اس تبصرے کے ساتھ، تبصرے کے لیے دی، ''لیجیے تبصرہ کر دیجیے، اس کتاب سے آپ کے علم میں اضافہ ہوگا، میرے تو بہت ہوا''۔ یہ اس کتاب کا پہلا اڈیشن تھا، اس کا نیا اڈیشن آج کل بازار میں دستیاب ہے۔ راقم نے تبصرہ کیا اور حسب عادت طویل رکھا۔ اسے پڑھ کر خلیق صاحب نے فرمایا، ''بھئی مزہ آ گیا''۔ ویسے وہ یہ جملہ اکثر ادا فرماتے تھے، تکیہ کلام کی حد تک۔ خلیق صاحب کا دوسرا تکیہ کلام تھا۔ ''آپ سچ کہتے ہیں''، جس کا فائدہ یہ تھا، کہ گفتگو کرنے والا موذی سے موذی شخص، ان کے جال میں پھنس جاتا، ان کی تقریر سننے کے بعد عموماً خاموش ہو رہتا، اور محفل خلیق صاحب کے ہاتھ رہتی۔

'ہماری زبان' کے حوالے سے خلیق صاحب کی بے شمار یادیں ذہن و دل سے پیوستہ ہیں۔ ایک اور واقعہ یاد آتا ہے کہ مشہور افسانہ نگار اور ناچیز کے کرم فرما بلراج ورما نے 'تناظر' کے نام سے ایک ضخیم سہ ماہی جریدہ شائع کیا تھا، اس کے شمارۂ اوّلین کے مدیر، کرم فرمائے دگر عتیق اللہ تھے۔ اس پرچے کی تیاری میں سب سے زیادہ مشقت اس خاکسار نے کی تھی، اور دوسرے عرق ریز مددگار (فی الوقت 'کونسل برائے فروغ اردو' کے مہتمم اعلیٰ) ڈاکٹر ارتضیٰ کریم تھے۔ رسمی طور پر ہم دونوں 'تناظر' کے مدیران معاون تھے اور عتیق اللہ، نیز، خود بلراج ورما ہم دونوں کی محنت شاقہ کے معترف بھی تھے، ہم دونوں کا نام پرچے میں آنا طے تھا، مگر پس پردہ، پتہ نہیں کیا ہوا کہ اعلیٰ سطح پر یہ فیصلہ ہوا کہ ہم دونوں کے نام مجلس ادارت میں شامل نہیں ہوں گے۔ بہرکیف، ہمیں پرچے کے بازار میں آنے سے قبل اس سازش کا علم ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ ہم لوگوں کو سخت طیش آیا۔ ارتضیٰ صاحب تو ازلی شریف انسان ہیں، انھوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ مگر ہم صبر کرنے کے حق میں نہ تھے، لہٰذا ہم نے بطور احتجاج ایک مراسلہ تحریر کیا جو خلیق صاحب کی روایتی رواداری کے طفیل 'ہماری زبان' میں شائع ہو گیا اور وہ بھی 'تناظر' کی آمد سے قبل۔ بس پھر کیا تھا، ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ قابل ذکر ہے کہ خلیق صاحب نے ہمیں شاباشی بھی دی کہ ایک خوددار قلم کار میں ایسی ہی جرأت ہونی چاہیے۔

اردو اکادمی کا عنفوان شباب تھا، شریف صاحب کی عمل داری تھی۔ ان دنوں خلیق صاحب کی تحریک اور ڈاکٹر صلاح الدین کی کاوش سے دہلی کی تاریخی ثقافت کا ایک نمائندہ پروگرام 'دہلی والے'، شروع ہوا، جو غالباً صرف تین برس جاری رہ سکا کہ یاروں کو اس پر سخت اعتراض تھا۔ خلیق صاحب دہلی والے تھے اس لیے وہ اس مجلس دہلویت کے زبردست حامی تھے، اگرچہ یہ ہیچ مداں دہلی والا نہیں، مگر ڈاکٹر صلاح الدین اور شریف صاحب کی مشترکہ عنایات کے طفیل، تین برس کے تین پروگراموں میں دو برس تک اس کوتاہ قلم کو دہلی والوں کے قلمی مرقعے بنانے کا موقع ملا، وہ بھی نادیدہ دہلویوں کے اور خدا کا شکر کہ بھرم رہ گیا، عزت سادات بچ گئی۔ خلیق

صاحب کو ہماری یہ جرأت رندانہ پسند آئی اور انھوں نے، ہمارے شانے پر اپنا دست شفقت بہ محبت رکھ کر کہا، ''صاحب زادے کبھی ہمارا خاکہ بھی اڑانا''۔ ظاہر ہے کہ ہم نے دست بستہ یہی کہا، '' خاکہ اڑائیں گے نہیں، خاکہ رقم کریں گے اور وہ بھی بہ شرط دیانت۔ ان کی اس فرمائش کی تکمیل کی نوبت اب آ رہی ہے۔ یہ صراحت لازم ہے کہ ان کی اس فرمائش میں جو درد پوشیدہ تھا، اس کا منبع یہ تھا کہ 'دلّی والے' کے تحت صرف رفتگاں پر ہی قلم آرائی کی اجازت تھی، باحیات اکابرین پر نہیں۔

خلیق صاحب ایک بامہارت محفل باز تھے، محفل کیسی ہی سنجیدہ ہو، وہ کوئی نہ کوئی شگوفہ چھوڑ کر محفل کا ماحول یکسر بدل دینے میں ملکہ رکھتے تھے۔ ع۔ بس دیکھیے، انداز گل افشانیِ گفتار، والا معاملہ تھا۔ ان کی جملہ بازی کا ہدف کوئی بھی ہو سکتا تھا، اس سلسلے میں وہ اپنے عزیز ترین احباب، اسلم پرویز اور صدیق الرحمٰن قدوائی کو بھی نہیں بخشتے تھے، ممکن ہے کہ نثار احمد فاروقی جو، ہمیشہ سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے رہتے تھے، وہ ان کے پُر مزاح تیر وتفنگ سے محفوظ رہتے ہوں، اور تو کسی کو امان پاتے، ہم نے دیکھا نہیں۔

ایک مرتبہ شاہد ماہلی کو دعوت اظہار خیال دیتے ہوئے انھوں نے بھری محفل میں کہا، '' بھائی آپ لوگ ان کی شکل پر مت جایئے، یہ آدمی کام کے ہیں'' باور ہو کہ اس وقت شاہد صاحب ادارۂ غالب کے مہتمم اعلیٰ تھے۔ ایک پاکستانی مزاح نگار کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ دوست کھو دیتے ہیں، جملہ نہیں کھوتے۔ کچھ یہی احوال خلیق صاحب کا تھا، وہ زبان پر آیا ہوا جملہ ادا کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ اب یہ ان کے احباب کی قوت برداشت، رواداری اور معاملہ فہمی پر منحصر تھا کہ ان کے دوست نہ کم ہوتے، نہ گم ہوتے، بلکہ گلے کا ہار بنے رہتے۔ خلیق صاحب کے بہت سے لطیفے مشہور ہیں اور معدود مضامین کا حصہ بھی بن چکے ہیں، تاہم راقم السطور چند ایسے مفرح واقعات کا ذکر کرنا چاہتا ہے، جن کا شاہد و سامع وہ بذات خود ہے، اور یہ ابھی تک تحریری شکل میں کہیں وا رد بھی نہیں ہوئے ہیں۔ مثلاً، ایک مرتبہ خلیق صاحب کسی پاکستانی مہمان کے اعزاز میں منعقد کی گئی، ایک بزم میں تقریر فرما رہے تھے، دوران گفتگو انھوں نے ایک واقعہ کا ذکر کیا کہ ایک بار وہ کراچی سے لاہور ہوتے ہوئے دہلی آئے تھے، ان کے پاس کئی عدد کارٹون تھے جن کا وزن مقررہ حد سے زیادہ تھا اور انھوں نے اس کا ہرجانہ بھی بھرا تھا۔ جب سامان باہر آیا تو ان کے ایک ہم سفر، جو ہندوستانی ہی تھے، دریافت کرنے لگے، کہ ان بڑے بڑے گتے کے بکسوں میں کیا ہے، تو انھوں نے سادگی سے جواب دیا، '' جناب ان سب میں کتابیں ہیں، صرف کتابیں، باقی، میرا ذاتی زادِراہ تو ایک حقیر سے چرمی تھیلے پر محیط ہے، جو میرے ساتھ ہے۔ اس پر ان صاحب نے دریافت کیا، '' کیا پاکستان سے کتابیں لانے میں منافع زیادہ ہوتا ہے؟'' خلیق صاحب اس معصومانہ سوال کا جواب کیا دیتے، مسکرانے پر اکتفا کیا۔

ایک اور واقعہ۔ کسی ادبی مجلس میں ایک مشہور ادیب کسی دوسرے ادیب کو ادبی لعن طعن، بلکہ مہذبانہ دشنام کا نشانہ بنا رہے تھے، ساری محفل لطف لے رہی تھی، وہیں اگلی صفوں میں ایک صاحب ہر جملے کی داد دے رہے تھے اور وقفہ بہ وقفہ ایک آدھ قہقہہ بھی داغ دیتے تھے۔ بحیثیت ناظم جب خلیق صاحب مکبر الصوت کے روبرو آئے تو انھوں نے کہا، ''حضرات ایک لطیفہ سنیے، محلّے کے چوک میں ایک صاحب صحت کسی دوسرے صحت مند شخص کو اس کے غیاب میں برا بھلا کہہ رہے تھے، بلکہ گالی گلوج سے بھی نواز رہے تھے ان کی باتوں کا لطف تو سبھی اہل محلّہ لے رہے تھے، مگر ایک صاحب جو قدرے ناتواں تھے، وہ خاص طور پر دلچسپی بھی لے رہے تھے، اور بہ آواز بلند ہنس بھی رہے تھے، تبھی اتفاقاً، دشنام طرازی کے ہدف، صاحب معاملہ بھی وہاں آ پہنچے، وہ اگرچہ خود بھی صحت مند تھے مگر ان صاحب دشنام سے ذرا دبتے تھے، لہٰذا انھوں نے صاحب گفتگو سے تو کوئی تعرض نہیں کیا، مگر آسان شکار خیال کر کے اس دھان پان شخص کی گردن پکڑ لی اور کہا، '' کیوں بے، کیا ہو رہا ہے؟'' وہ غریب منمنا کر بولا ''میں تو کچھ نہیں کہہ رہا ہوں، سب کچھ تو وہ کہہ رہے ہیں''، اس پر وہ حضرت بولے، '' کہ وہ کہہ رہا ہے تو کہنے دے، تو کیوں مزے لے رہا ہے''۔ لطیفہ سنا کر، خلیق صاحب نے اپنے مخصوص لہجے میں ان اولین صف نشین سے مخاطب ہو کر فرمایا، '' حضرت! اب اپنی خیر منایئے''۔

غرض کہ خلیق صاحب کی بذلہ سنجی، خوش مزاجی و خوش مذاقی بے مثل تھی، ان کی حس مزاح ارفع درجے کی تھی، دوسروں کا مضحکہ اڑانے کے ساتھ، انھیں یہ ملکہ بھی حاصل تھا کہ وہ خود اپنی ذات کو بھی ہدف مذاق بنا سکتے تھے، اس میں انھیں کوئی عار نہ ہوتا تھا۔ خاکسار نے ایک بار کہا، '' آپ نے قصر اردو کی عمارت تو بہت شاندار بنائی ہے'' کہنے لگے، '' واقعی شاندار ہے''؟۔ ہم نے کہا، ''شاندار بھی ہے اور جاندار بھی''۔ اس پر انھوں نے ہنس کر کہا، '' جی ہاں، مگر ہماری اپنی جان نکل گئی، اسے بنوانے میں۔ ہم خلیق انجم سے خلیق ذرہ ہوتے ہوتے بال بال بچے ہیں''۔

خلیق صاحب کی زندگی ہر دم رواں، ہر دم دواں تھی، تمام تر مصروفیت سے عبارت تھی، لفظ 'فرصت' ان کی لغات میں موجود ہی نہ تھا، ورنہ ایک عرصہ حیات میں وہ سارے کام کیوں کر ممکن تھے، جو انھوں نے فرجام رسید کیے۔ سادگی کا یہ عالم تھا کہ اپنے عملے کے ساتھ کھانا کھاتے، وہی کھاتے جو سب کھاتے اور ویسے ہی کھاتے، جیسے سب کھاتے۔ ان کے دفتری دسترخوان پر محمود و ایاز کی ہمسری کا منظر ہوتا تھا۔

پاکستان سے 'انجمن ترقی اردو پاکستان' کے معتمد عمومی (یا اعزازی) جمیل الدین عالی، دورہ ہند پر تشریف لائے، ہر چند کہ دلّی والے تھے، مگر مہمان تھے، لہٰذا خلیق صاحب نے غالب اکادمی میں انھیں ایک شاندار استقبالیہ دیا۔ پر زور تقاریر ہوئیں، کچھ بحث وتمحیص بھی ہوئی، آخر میں مہمان خصوصی نے جلسے سے خطاب کیا۔ راقم السطور سمعی شاہد ہے کہ انھوں نے انجمن کی کارگردگی کے سلسلے میں یہ تاریخی جملے ارشاد فرمائے، ''ہمیں اپنی خدمات پر بڑا فخر تھا، کہ ہم پاکستان میں اردو کے سلسلے میں بڑا کام کر رہے ہیں، مگر 'انجمن ترقی اردو (ہند)' کی کارکردگی اور خصوصاً اس کے اشاعتی کارناموں کو دیکھ کر میری آنکھیں کھل گئیں کہ اتنا کام تو وہاں بھی نہیں ہوا، جہاں اردو کو سرکاری سرپرستی حاصل ہے۔ جبکہ آپ کی انجمن ایک غیر سرکاری ادارہ ہے، جس پر خود اپنی کفالت کی ذمے داری ہے۔'' انھوں نے مزید کہا، '' کئی کتابوں کو دیکھ کر تو مجھے یہ حسرت دامن گیر ہوئی کہ کاش یہ کام میں کرتا' ظاہر ہے کہ جمیل الدین عالی نے بڑی صاف گوئی سے اقبال حقیقت کیا تھا اور ان کا یہ پرستانہ اعتراف، خلیق صاحب کی خدمت میں ایک زبردست خراج تحسین تھا۔

خلیق صاحب نے کئی مسکن بدلے، اور ہر مرتبہ دور سے دور گئے، اس لیے (ذہنی نہیں) ارضی فاصلہ بڑھتا رہا، عملی رابطہ کم ہوتا گیا اور ان کے دور آخر میں تقریباً معدوم ہو گیا، مگر اک تعلق خاطر تھا، جو برقرار رہا، استوار رہا، روز افزوں نہ تھا مگر قائم تھا، مگر اب تو وہ دور سے دور، اتنی دور جا چکے ہیں کہ کسی تعلق کی برقراری کی کوئی سبیل نہیں۔ مگر، ع۔ رفتید، ولے نہ از دل ما۔

■

Dr. Muzaffar Husain Syed
29/11, Sir Syed Road
Dariya Ganj, New Delhi - 110002
Mob.:9818827853
E-mail.: syedmh92@yahoo.com,
syedmh92@gmail.com

ادب

آفاق کا روشن ستارہ

پروفیسر آفاق احمد

عارف عزیز

وہ قافلہ جسے ہم پرانی پیڑھی کے نام سے جانتے ہیں، اُفق کی پہنائیوں میں گم ہورہا ہے، 20 ویں صدی کے نصف اوّل میں بوئی ہوئی فصل تیزی سے کٹ رہی ہے، وہ محفل جو 1930-40 میں جمی تھی اور 1950-60 تک سرشاری، سرمستی اور خودفراموشی کے عروج پر نظر آتی تھی، اُس کی بساط اُلٹ گئی ہے، یہ تاثر ہر اُس موقع پر شدید ہوجاتا ہے، جب اس پیڑھی کا کوئی فرد بلبلے کی طرح پھوٹ کر وقت کے اُس سیل رواں میں کھو جاتا ہے، جو ازل سے ابد تک بہہ رہا ہے۔

پھر استادِ گرامی پروفیسر آفاق احمد کا شمار تو اُردو دنیا کے اُن اُستادوں، ادیبوں اور دانشوروں میں ہوتا ہے جو آسمانِ ادب پر پوری نصف صدی تک اپنی تابنا کی بکھیر کر ایک جہاں کو خیرہ کرتے رہے۔ آفاق صاحب بلند پایہ استاد ہی نہیں، معیاری تخلیق کار اور محقق و مولف بھی تھے، بظاہر شمار میں ان کی تصانیف کی تعداد زیادہ نہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے خود کو اردو تدریس و تحریک سے مستقلاً جوڑے رکھا تھا۔ تاہم ان کی طبع زاد چار کُتب اور تالیف کردہ 19 کتابیں علم و ادب سے اُن کے گہرے شغف کا واضح ثبوت ہیں۔ اسی طرح اردو تحریک میں اُن کے استغراق کا اندازہ انجمن ترقی اردو مدھیہ پردیش اور جن وادی لیکھک سنگھ کی صدارت سے ہوتا ہے جو وہ پچیس تیس سال سے انجام دے رہے تھے ایک اور ادبی انجمن حلقہ اربابِ ادب کے بانی اور جنرل سکریٹری کی ذمے داری وہ اِس سے زیادہ پچپن سال سے نبھا رہے تھے۔

آفاق صاحب ایک بڑے عہدے سے اُس وقت نوازے گئے جب 1989 میں انھیں 'انجمن اساتذہ اردو جامعات' کی صدارت تفویض کی گئی، آفاق صاحب سے پہلے اور بعد میں یہ اعزاز صرف یونیورسٹی پروفیسر کو ہی ملتا تھا۔ عبدالقادر سروری، نورالحسن ہاشمی، آل احمد سرور، اور محمد حسن جیسی شخصیتیں اس عہدے سے سرفراز ہوتی رہی ہیں۔

پروفیسر آفاق احمد 30 جولائی 1932 میں بھوپال کے نجیب الطرفین خاندان میں پیدا ہوئے، ان کا پدری تعلق ایک فوجی گھرانے سے ہے، والد اعجاز احمد ریاست بھوپال کی فوج میں کیپٹن تھے۔ ننھیالی رشتہ مرزا غالب کے بھوپال میں شاگرد مولانا عباس رفعت شیروانی سے پانچویں پیڑھی میں ملتا ہے، نانا سید علی نقوی ریاست کے منصب داروں میں تھے۔

ابتدائی تعلیم کے بعد آفاق صاحب کی اعلیٰ تعلیم کے مراحل بھوپال کی مشہور درس گاہ گورنمنٹ حمیدیہ کالج میں طے ہوئے۔ جو اُس وقت معیاری تعلیم کے لحاظ سے کسی اعلیٰ یونیورسٹی سے کم نہ تھا اور اس کا اردو شعبہ تو نامور اردو اساتذہ اور ادیبوں سے مزین تھا۔ جس دور میں آفاق صاحب یہاں زیرِ تعلیم تھے، اُس سے کچھ ہی پہلے جاں نثار اختر، پروفیسر کے عہدے کو خیرباد کہہ کر ممبئی چلے گئے تھے لیکن اُن کی بیگم صفیہ اختر انتقال تک کالج سے وابستہ رہیں، اُس زمانے میں ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر ابو محمد سحر، ڈاکٹر سلیم حامد رضوی جیسی ممتاز ادبی شخصیتیں شعبہ اردو میں استاد تھیں۔ ان لائق اساتذہ کی نگرانی میں آفاق صاحب نے ایم اے اردو میں فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔

پروفیسر آفاق احمد کو خوش قسمتی سے حمیدیہ کالج میں ہی 1959 میں لیکچرار شپ مل گئی۔ پروفیسر کے عہدے پر 1972 کے دوران اُن کی ترقی ہوئی اور 1992 میں حسن خدمت پر سبکدوش ہوگئے۔ آفاق صاحب کی ملازمت کا طویل عرصہ گورنمنٹ مہارانی لکشمی بائی گرلز کالج بھوپال میں گزرا۔ وہ زمانہ تعلیم سے طلبا تحریکات اور ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔

شادی 1960 میں ہوئی تو اہلیہ بلقیس جہاں صاحبہ بھی، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہم مذاق ملیں، وہ بیک وقت انگریزی اور اردو ادب میں ایم اے اور پی ایچ ڈی ہیں اور پروفیسر کے عہدے سے سبکدوش ہوئی ہیں۔ اُن کی دو بیٹیاں ایک ٹورنٹو دوسری نیویارک میں برسرکار ہیں۔ آفاق صاحب کے چھوٹے بھائی قمر اشفاق صاحب روزنامہ ندیم کے ایڈیٹر، دوسرے بھائی شفیق اعجاز صاحب تجارت میں مصروف ہیں۔

پروفیسر آفاق احمد اپنی خداداد صلاحیت اور اساتذہ کی تربیت کے نتیجے میں بہت جلد اپنے اساتذہ کی صف

میں کھڑے نظر آئے اور ایک وقت وہ آیا کہ اپنے اساتذہ کے لیے اور اساتذہ اپنے شاگرد کے لیے باعث فخر ثابت ہوئے، آفاق صاحب اعلیٰ درجے کے مدرس ہونے کے ساتھ اوّل درجے کے کھلاڑی بھی تھے۔ انھوں نے 1958 میں سری لنکا میں منعقد بین الاقوامی ہاکی ٹورنامنٹ میں بھوپال ہاکی ٹیم کی بطور کپتان قیادت کی اور دیگر اہم میچوں میں ٹیم اُن کی کپتانی میں کھیلتی رہی، وکرم یونیورسٹی اوجین کی نمائندگی کے ساتھ ہاکی کے علاوہ باسکٹ بال، جمپنگ میں بھی انھوں نے نمایاں مقام حاصل کیا۔ جلد ہی ان کی شناخت ایک ایسے ماہر تعلیم کی ہوگئی، جو طلبا کی تعلیم وتربیت میں خصوصی دلچسپی بلکہ عرق ریزی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ حمیدیہ کالج اور مہارانی لکشمی بائی گرلز کالج کی ملازمت کے عرصے میں انھوں نے جہاں سیکڑوں طلبا و طالبات کو اردو کی تعلیم سے آراستہ کیا، وہیں 29 طلبا و طالبات کو اپنی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کرائی، جبکہ 21 طلبا کو ایم اے سال آخر کے ایک پرچے کے مترادف تحقیقی مقالے اپنی زیر نگرانی مکمل کرائے، ریٹائرمنٹ کے بعد بھی شعبہ تعلیم میں اُن کی سرگرمی مثالی رہی۔ اسی طرح اُن کے زیر تعلیم وتربیت جو طلبا رہے، فراغت کے بعد جن شعبوں میں قدم رکھا، ان میں اپنی خاص شناخت بنائی۔ ایسے ہونہار طلبا میں ڈاکٹر عزیز اندوری، ڈاکٹر راحت اندوری، ڈاکٹر ویرمنی (سبکدوش پولیس افسر) شامل ہیں۔

پروفیسر آفاق احمد تخلیق ادب کی بھر پور صلاحیت کے مالک تھے، جو استاد 29 طلبا، کو اپنی نگرانی میں تحقیقی کام کرا چکا ہو، اُس کی علمیت کا اندازہ بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے باوجود ادب کی تخلیق میں ان کی سست گامی کی وجہ یہی ہے کہ ان کی توجہ اپنے طلبا، پر زیادہ مرکوز رہی اور جو وقت ملا وہ سمیناروں اور دیگر علمی پروگراموں کی نذر ہوگیا۔ اسی درمیان آفاق صاحب نے پانچ سال مدھیہ پردیش اردو اکادمی سکریٹری کے فرائض انجام دیے اور اکادمی کے سمینار وں یا دوسرے پروگراموں میں بڑی ہستیوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے اور اُن سے مقالات وغیرہ تحریر کرانے میں اپنی صلاحیتیں صرف کرتے رہے۔

خود آفاق صاحب نے سراج میر خاں سحر بھوپالی، رشید احمد صدیقی، تخلص بھوپالی، پریم چند، اقبال اور مہدی افادی پر جو مقالات تحریر کیے، انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ یہ مقالات 'امانتِ قلب ونظر' کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔

بڑے ادیبوں کی ایک پہچان یہ بھی ہوتی ہے کہ نئی نسل کے بارے میں فکر مند رہتے ہیں اور اکثر نے بچوں کا ادب تخلیق کرنے پر توجہ دی ہے، آفاق صاحب بھی اس فہرست میں شامل ہیں۔ اسی فکر مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انھوں نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز بچوں کے ادب سے کیا۔ پہلی کتاب ''پریوں کی ملکہ' (بچوں کی کہانیوں کا مجموعہ) 1960 میں شائع ہوئی۔ دوسری کتاب 'پُر شور خاموشی' (افسانوں کا مجموعہ) 1991 میں منظر عام پر آئی، تیسری کتاب 'ایک کرن اُجالے کی' (راج گوپال اچاریہ کی کہانیوں کا اردو ترجمہ) 1995 اور چوتھی کتاب 'امانتِ قلب ونظر' (مضامین کا مجموعہ) 2007 میں طبع ہوئی۔

پروفیسر آفاق احمد تخلیق ادب کی بھر پور صلاحیت کے مالک تھے، جو استاد 29 طلبا، کو اپنی نگرانی میں تحقیقی کام کرا چکا ہو، اُس کی علمیت کا اندازہ بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے باوجود ادب کی تخلیق میں ان کی سست گامی کی وجہ یہی ہے کہ ان کی توجہ اپنے طلبا، پر زیادہ مرکوز رہی اور جو وقت ملا وہ سمیناروں اور دیگر علمی پروگراموں کی نذر ہوگیا۔ اسی درمیان آفاق صاحب نے پانچ سال مدھیہ پردیش اردو اکادمی سکریٹری کے فرائض انجام دیے اور اکادمی کے سمیناروں یا دوسرے پروگراموں میں بڑی ہستیوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے اور اُن سے مقالات وغیرہ تحریر کرانے میں اپنی صلاحیتیں صرف کرتے رہے۔

آفاق صاحب ایک کامیاب مولف بھی تھے، بظاہر تالیف وتدوین کا کام آسان نظر آتا ہے، لیکن ہوتا کافی دماغ سوزی کا طالب، کیونکہ اِس کے لیے مولف کا کثیر المطالعہ اور موضوع پر گہری دسترس رکھنا ضروری ہے، جن میں (1) مثنوی سحر البیان، (مع شرح وتقریظ)، (2) 'عورت ذات' (ملا رموزی کے غیر مطبوعہ مضامین مع پیش لفظ)، (3) 'اقبال آئینہ خانہ میں' (اقبال صدی پر سمینار کے تحقیقی وتنقیدی مقالات)، (4) 'نگارشات' (حکیم سید قمر الحسن کے مضامین)، (5) 'بیا مجلسِ اقبال' اور مجلس اقبال (علامہ اقبال پر منعقدہ سمیناروں کے آٹھ مجموعے)، (6) 'پریم چند شناسی' (پریم چند پر مقالات)، (7) 'مدھیہ پردیش میں اردو زبان وادب' (اردو اکادمی سمینار کے تحقیقی وتنقیدی مقالات)، (8) 'کلام رزمی' (سعید اللہ خاں رزمی کے کلام کا مجموعہ)، (9) 'مجلسِ ممنون' (ترتیب وپیش کش)، (10) 'داستانِ سفر' (حصہ اوّل، دوم اور سوم)

ادبی موضوعات نیز ہم عصر شخصیات پر ہر اتوار کو آئینہ خانہ کے عنوان سے کالم لکھتے تھے، اُن کا حافظہ اچھا تھا، جس کو کام میں لاکر وہ طلبا کے تحقیقی کام میں مددگار بنتے، اس کا اندازہ مذکورہ کالم سے بھی ہوتا ہے، جس کو دفتر 'ندیم' تک پہنچانے، کمپوز کرانے، پروف پڑھنے کی ذمے داری راقم نے لے رکھی تھی۔ اُسے آفاق صاحب کی حاضر دماغی کا بارہا تجربہ ہوا، وہ کالم کے لیے نئے نئے موضوعات ہی منتخب نہیں کرتے، اُس کی مناسبت سے تصاویر بھی فراہم کر دیتے تھے۔

مذکورہ کتابوں کی تالیف کے علاوہ زبان وادب کے فروغ میں آفاق صاحب کی مزید کارگذاری درج ذیل ہے:

(1) مدھیہ پردیش پاٹھیہ پستک نگم نصاب کی بال بھارتی (حصہ ششم وہشتم) کی ترتیب میں تعاون۔

(2) ایم پی ہائر ایجوکیشن گرانٹ کمیشن کی B.A.II کی اردو نصابی کتاب کی تدوین میں تعاون۔

(3) مدھیہ پردیش محکمہ اعلیٰ تعلیم کی اردو نصابی کتابوں میں شریک مدیر۔

(4) 'شریف زادہ' میرزا ہادی رسوا برائے نصاب B.A.II کی تلخیص۔

اس کے ساتھ آپ نے سہا مجددی کے 'مطالب الغالب' اور 'بیاضِ سحر' کے نئے عکسی ایڈیشن کا مقدمہ بھی تحریر کیا۔

آفاق صاحب صحافی تو نہیں تھے لیکن ادبی صحافت سے اُن کی دلچسپی زمانۂ طالب علمی سے تھی۔ اسکول اور کالج کی میگزین کے بالترتیب 1949، اور 1954 میں ایڈیٹر رہے ہیں۔ عملی زندگی میں آنے کے بعد 'ملاپ' اور 'تیج' کے لیے نامہ نگاری کی اور بھوپال سے شائع روزنامے 'افکار' اور 'ندیم' میں کالم نگاری بھی کرتے رہے۔ ستمبر 2013 سے 'ندیم' بھوپال میں پھر کالم نگاری کا آغاز کیا۔ ادبی موضوعات نیز ہم عصر شخصیات پر ہر اتوار کو آئینہ خانہ

کے عنوان سے کالم لکھتے تھے، اُن کا حافظہ اچھا تھا، جس کو کام میں لاکر وہ طلبا کے تحقیقی کام میں مددگار بنتے، اس کا اندازہ مذکورہ کالم سے بھی ہوتا ہے، جس کو دفتر 'ندیم' تک پہنچانے، کمپوز کرانے، پروف پڑھنے کی ذمے داری راقم نے لے رکھی تھی۔ اُسے آفاق صاحب کی حاضر دماغی کا بارہا تجربہ ہوا، وہ کالم کے لیے نئے نئے موضوعات ہی منتخب نہیں کرتے، اُس کی مناسبت سے تصاویر بھی فراہم کر دیتے تھے۔ صحت کی ناسازی ملک و بیرون ملک کے دورے اور سیمناروں میں شرکت کی وجہ سے یہ کالم مسلسل نہیں لکھا جا سکا، تاہم جو بھی تحریریں ہیں، اُنھیں مرتب کر کے شائع کیا جا سکتا ہے۔

آفاق صاحب نے عمر کے آخری حصے میں شاعری کی، کوثر صدیقی صاحب کے بقول "وہ چھپے شاعر تھے اور شاعری کے عیب و ہنر سے بخوبی واقف تھے، لیکن اپنی غزلیں اور نظمیں انھوں نے رسائل میں چھپوانے یا مشاعروں میں سنانے میں دلچسپی نہیں لی، ایک منتظم کی حیثیت سے بھی آفاق صاحب گونا گوں صلاحیتوں کے مالک تھے، اپنی 33 سالہ ملازمت کے دوران انھوں نے کوئی پندرہ سال حمیدیہ کالج اور لکشمی بائی گرلز کالج میں شعبہ اردو کی کامیاب سربراہی کی، اس کے بعد سکریٹری اردو اکادمی کے عہدے پر پانچ برس خدمات انجام دینے کے باوجود، اپنے حسنِ انتظام سے کسی قسم کی عوامی تنقید یا تنازعے کا

ہندوستان کی بیشتر جامعات اور ادبی مراکز تو اُن کے چھانے ہوئے تھے، اس کے علاوہ پاکستان، انگلستان، اور کنیڈا کے سمیناروں اور ادبی مجلسوں میں بھی انہیں مدعو کر کے اعزاز سے سرفراز کیا جاتا رہا۔ آفاق صاحب کی اس دانش و بنش کے اعتراف کے طور پر انہیں یادگاری خطبات پیش کرنے کے لیے بھی دعوت دی گئی۔ 2011 میں فراق گورکھپوری کی شاعرانہ فکر و نظر پر آفاق صاحب نے قومی اردو کونسل نئی دھلی کے زیر اہتمام یادگاری خطبہ دیا، دوسرے خطبے کا موقع انہیں 2015 میں مولانا ابوالکلام اردو یونیورسٹی جودھپور میں ملا اور انہوں نے علامہ شبلی نعمانی صدی کی مناسبت سے شبلی کے تعلیمی نظریات پر سیر حاصل خطاب فرمایا۔

شکار نہ بنے، ساتھ ہی سندھی ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری کے طور پر انتظامی امور انجام دیتے رہے اور ان اداروں سے سبکدوش ہونے کے بعد علامہ اقبال ادبی مرکز کے بھی پانچ سال سکریٹری رہے۔ اس پورے عرصے میں اُن کا دل اُردو کی خدمت سے سرشار رہا، جس کے عملی مظاہرے کے طور پر انھوں نے مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے بعد سندھی ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری کی حیثیت سے کوئی تنخواہ نہیں لی، صرف ایک روپے ماہنامہ اعزازیہ پر دس سال تک اپنی صلاحیتوں اور تجربوں سے مذکورہ اداروں کو نوازتے رہے، اس کے علاوہ علامہ اقبال ادبی مرکز کو اپنی ذاتی لائبریری کی 1535 کتابیں عطیہ کیں اور باقی ماندہ کتب اُن کی وصیت کے مطابق انتقال کے بعد ایک ٹرک میں بھر کر دارالعلوم تاج المساجد بھوپال کے سلیمانیہ کتب خانے پہنچادی گئیں۔

آفاق صاحب کی تحریر کی طرح اُن کی تقریر بھی کوثر وتسنیم سے دھلی محسوس ہوتی تھی، کلاس روم میں اُن کا لیکچر جتنا معلوماتی ہوتا، اُتنی ہی موثر تقریر وہ عوامی جلسوں، ادبی وتہذیبی پروگراموں میں کرتے بلکہ یہ کہا جائے تو حسبِ حال ہوگا کہ اُن کی زبان سے ادا ہونے والے ہر جملے کے پیچھے ایک شاعرانہ تہہ داری اور فکر کی گہرائی ہوتی تھی۔ لکھنا، پڑھنا اور بولنا اُن کا شوق ہی نہیں مزاج کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ وہ جس زبان کو بولتے تھے اسی میں لکھتے بھی تھے، اسی لیے اُن کی تحریر وتقریر میں گہری یکسانیت پائی جاتی تھی۔ ہندوستان کی بیشتر جامعات اور ادبی مراکز تو اُن کے چھانے ہوئے تھے، اس کے علاوہ پاکستان، انگلستان، اور کنیڈا کے سیمناروں اور ادبی مجلسوں میں بھی انھیں مدعو کر کے اعزاز سے سرفراز کیا جاتا رہا۔ آفاق صاحب کی اس دانش وبنش کے اعتراف کے طور پر انھیں یادگاری خطبات پیش کرنے کے لیے بھی دعوت دی گئی۔ 2011 میں فراق گورکھپوری کی شاعرانہ فکر ونظر پر آفاق صاحب نے قومی اردو کونسل نئی دہلی کے زیر اہتمام یادگاری خطبہ دیا، دوسرے خطبے کا موقع انھیں 2015 میں مولانا ابوالکلام اردو یونیورسٹی جودھپور میں ملا اور انھوں نے علامہ شبلی نعمانی صدی کی مناسبت سے شبلی کے تعلیمی نظریات پر سیر حاصل خطاب فرمایا۔

آفاق صاحب کی ادبی خدمات کا اعتراف یوں تو پوری اردو دنیا میں ہوا، لیکن مدھیہ پردیش اردو اکادمی کا میر تقی میر ایوارڈ انھیں کافی تاخیر سے تفویض ہوا، اس تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ وہ طویل عرصے تک اردو اکادمی کے سکریٹری کے عہد پر فائز رہے، ظاہر ہے کہ اس زمانے میں یہ ایوارڈ جیوری انھیں نہیں دے سکتی تھی، پھر بھی زندگی کے آخری حصے میں حق بحق دار رسید کے مصداق وہ اُس اعزاز سے نوازے گئے، جس کو برسوں دوسروں کو دیتے رہے تھے۔

آفاق صاحب کی زندگی وفاداری بشرط استواری کی ایک مثال ہے، بائیں بازوں کے جن نظریات سے انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنّفین کے وسیلے سے رشتہ قائم کیا، اس کو آخر دم تک برقرار رکھا، اُن کی دوسری خصوصیت تہذیبی وفاداری اور ہمہ رنگی تھی، تاہم یہ بھی سچائی ہے کہ وہ تحریکی مزاج کے مالک نہیں تھے بلکہ ذہنی طور پر بائیں بازو کا ساتھ نبھاتے رہے، اس لیے وہ دوسروں کو نظریاتی اچھوت نہیں مانتے تھے، اُن کا سلوک سب کے ساتھ عموماً معاملہ فہمی کا ہوتا تھا اور اسی رویے کی بنا پر وہ ہر جگہ اپنا مقام بنا لیتے تھے، بحیثیت مجموعی وہ ہماری ملی جلی اُس تہذیب کے نمائندہ تھے، جو غلو آمیز قوم پرستی کی بنا پر آج اپنی صحیح شکل و صورت کھوتی جارہی ہے۔

آفاق صاحب کی زندگی وفاداری بشرط استواری کی ایک مثال ہے، بائیں بازوں کے جن نظریات سے انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنّفین کے وسیلے سے رشتہ قائم کیا، اس کو آخر دم تک برقرار رکھا، اُن کی دوسری خصوصیت تہذیبی وفاداری اور ہمہ رنگی تھی، تاہم یہ بھی سچائی ہے کہ وہ تحریکی مزاج کے مالک نہیں تھے بلکہ ذہنی طور پر بائیں بازو کا ساتھ نبھاتے رہے، اس لیے وہ دوسروں کو نظریاتی اچھوت نہیں مانتے تھے، اُن کا سلوک سب کے ساتھ عموماً معاملہ فہمی کا ہوتا تھا اور اسی رویے کی بنا پر وہ ہر جگہ اپنا مقام بنا لیتے تھے، بحیثیت مجموعی وہ ہماری ملی جلی اُس تہذیب کے نمائندہ تھے، جو غلو آمیز قوم پرستی کی بنا پر آج اپنی صحیح شکل وصورت کھوتی جارہی ہے۔

■

Arif Azeez, 20 Ghati Bahar Bhonja Road
Talayya, Bhopal - 462001 (MP)
Mob.:094256-73760
E:mail. arifazizbpl@rediffmail

شاہ رشاد عثمانی

ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی

(ایک ہمہ جہت اور قلندر مزاج شخصیت)

سرسید کا قول ہے کہ ''کسی قوم کے لیے اس سے زیادہ بے عزتی نہیں کہ وہ اپنی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کو کھودے۔'' اس دور کا شاید یہ المیہ ہے کہ برق رفتاری سے گزرنے والا وقت زندگی کی کشاکش اور مصروفیات میں مبتلا انسان کو اتنی مہلت نہیں دیتا کہ وہ یادوں کے چراغ روشن کرے اور اپنے ان محسنین اور بزرگوں کو خراج عقیدت پیش کرے جنھوں نے اپنی زندگیاں ایثار و قربانی کے ساتھ بندگان خدا کی خدمت، شعر و سخن کی ترقی اور تہذیب و ثقافت اور زبان و ادب کے فروغ کے لیے وقف کردیں۔ ایسی ہی ایک فرشتہ صفت شخصیت محمود حسن الہ آبادی کی ہے۔ انھوں نے پوری زندگی اردو زبان و ادب کے فروغ میں لگادی۔ ایسی شخصیت پر بطور خراج عقیدت کچھ لکھنا میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔

معروف ادیب، نقاد و محقق اور دانشور ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی نے 22 فروری 2016 کو 84 برس کی عمر میں بھیونڈی (مہاراشٹر) میں آخری سانس لی۔ اسی دن بعد نماز مغرب مسجد بدر بھیونڈی میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور وہیں پانجرہ پول قبرستان میں انھیں سپرد خاک کیا گیا۔ آپ کی اہلیہ محترمہ کا پہلے ہی انتقال ہوچکا تھا۔ پس ماندگان میں ایک بیٹا اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ ڈاکٹر محمود حسن مرحوم ایک بے حد منکسر المزاج، خوش اخلاق، ملنسار، دیندار، متقی و پرہیزگار اور کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ جہاں وہ ایک طرف ادیب، محقق، نقاد اور تجزیہ و تبصرہ نگار تھے، وہیں دوسری طرف معروف اسلامی اسکالر، داعی اور مبلغ تھے۔ ان کے یہاں بلا کا تنوع پایا جاتا تھا۔ اسلامیات، قرآنیات، سیاسیات، تعلیمات، فلسفہ، قانون، طب، جغرافیہ، تاریخ، ادب و ثقافت اور تنقید و تحقیق ہر موضوع پر بے دریغ لکھتے اور موضوع کا حق ادا کرتے۔ اسلوب بیان شگفتہ اور زبان میں سلاست و روانی پائی جاتی تھی، جس کی وجہ سے موضوع کی ثقالت اور طوالت قاری کو گراں بار نہیں کرتی اور تحریر میں جاذبیت برقرار رہتی۔

ڈاکٹر محمود حسن کی ولادت اتر پردیش کے قصبہ لال گوپال گنج ضلع الہ آباد میں 17 ستمبر 1932 کو ہوئی تھی۔ اپنی ابتدائی تعلیمی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''پڑھنے کا شوق مجھے بچپن سے تھا، مڈل اور ہائی اسکول کی لائبریریوں میں اردو کی کوئی کتاب ایسی نہ تھی جو نظر سے نہ گزری ہو، ادیب، ادیب ماہر، ادیب کامل کے امتحانات ہائی اسکول (1949) کے دوران ہی پاس کرلیے تھے۔ 1950 میں منشی فارسی، 1951 میں انٹر، 1952 میں کامل فارسی کے امتحانات پرائیویٹ سے پاس کیے اور 1953 میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ سات سال تک دو جگہ سرکاری ملازمتوں میں خوار ہوتا رہا، ایک سے میں نے استعفیٰ دیا، دوسرے نے مجھے مستعفی کیا۔ معاش کی فکر ہوئی تو 1961 میں عالم عربی اور 1963 میں فاضل طب کی تکمیل کی اور الحمدللہ رجسٹرڈ میڈیکل پریکٹیشنر ہوں۔ 1966 سے بھیونڈی (مہاراشٹر) میں مقیم ہوں۔ 1979 میں ممبئی یونیورسٹی سے ایم اے (انگریزی) کی بھی سند لے لی ہے، لیکن سچ پوچھیے تو یہی چار زبانیں، مجھے نہیں آتیں یعنی اردو، فارسی، عربی اور انگریزی۔''

(دیباچہ، ادبیات محمود جلد اول، ص 8)

ڈاکٹر محمود حسن مرحوم کی علمی و ادبی اور دینی موضوعات پر تقریباً ایک درجن کتابیں شائع ہوچکی ہیں، جن میں ادبیات محمود (تین جلدوں میں)، تنقیدات محمود (تین جلدوں میں) اور مطالعات محمود (تین جلدوں میں) بہت مشہور و مقبول ہیں۔ آپ نے نثری و شعری کتب پر سیر حاصل تبصرے بھی بڑی تعداد میں کیے جو مشہور و منفرد مجلّہ 'اردو بک ریویو' دہلی میں تواتر کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔

آپ کے مضامین 1953 سے ہی اردو ٹائم؟ انقلاب اور دعوت میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ علمی و تحقیقی مقالات، تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، زندگی دہلی، مطالعات دہلی، برہان دہلی، افکار عالیہ، معارف اعظم گڑھ، نوائے ادب ممبئی، پیش رفت دہلی، اقبال ریویو لاہور اور سفیر لغت کراچی وغیرہ میں بکھرے پڑے ہیں۔

'ادبیات محمود' جلد اول ڈاکٹر محمود حسن کے ادبی مضامین و تبصرے کا پہلا مجموعہ ہے جو 2011 میں ادارۂ ادب ممبئی کی جانب سے شائع کیا گیا ہے جس میں ادب اور غیر ادب، اردو ادب پر مغربی فکر کے اثرات، اسلام

اور تمثیل نگاری، ابر سفید اور شاعر، چراغ حرا، طفیل مدنی اور ان کی شاعری جیسے چھ مقالات ہیں۔ اس کے بعد 25 نثری و شعری کتب پر سیر حاصل تبصرے اور آخر میں پانچ ادبی شخصیات کی حیات و خدمات پر مفصل مضامین شامل کتاب ہیں۔

اس کتاب کا پہلا مضمون 'ادب اور غیر ادب' بہت ہی مبسوط اور مدلل ہے جس میں مشرقی اور مغربی ادبا و ناقدین کے حوالے سے ادب کیا ہے، اس کی ماہیت اور مبادیات پر بحث کی گئی ہے۔ اس ذیل میں مختلف ادبی رجحانات اور ان سے وابستہ شخصیات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح کتاب کا دوسرا مقالہ 'اردو ادب پر مغربی فکر کے اثرات' کے عنوان پر ہے، اس مضمون میں 1857 کے بعد اردو نثر و نظم میں قدیم رجحانات کے مقابلے میں جدید اردو ادب پر اصلاحی، معاشرتی، سیاسی، تاریخی، فلسفیانہ اور ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ خاص طور سے صنف تنقید میں مغربی اثرات کے علاوہ فکشن اور شاعری میں تبدیل شدہ نظریات کا جائزہ نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر محمود حسن مرحوم نے اپنے اس فکر انگیز مقالے کا اختتام مندرجہ ذیل بصیرت افروز اقتباس پر کیا ہے:

''اردو ادب پر مغربی فکر کے اثرات کے موضوع پر یہ درازنفسی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ادب کے تاریخی اور طبعی ارتقاء کے باوجود اردو ادب کی ہر صنف پر مغرب کے اثرات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ عرب اس سے قبل یونانی علوم سے فائدہ اٹھا چکے ہیں، مغرب نے علم وفن میں ترقی کا درس اولین انھیں سے لیا تھا۔ ہماری آنکھیں اس دن کو ترس رہی ہیں، جب مغرب پھر مشرقی ادب سے استفادہ پر اپنے کو مجبور پائے گا لیکن شاید یہ دن ابھی بہت دور ہے، کیونکہ ہمارا موجودہ رجحان نقالی کا ہے اور ہم تخلیقی قوتوں سے یکسر محروم ہوتے جارہے ہیں۔''

(ادبیات محمود اول، ص 45)

ڈاکٹر محمود حسن مرحوم کی چند تصنیفات اور کچھ مقالات کا اس مختصر سے مضمون میں تذکرہ بطور مثال کیا گیا ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ آپ دنیائے علم و ادب کی ایک ایسی معتبر شخصیت تھے جن کے مقالات و نگارشات ان کے علم و فضل کے گواہ ہیں۔ ان کا مطالعہ بے حد وسیع اور گہرا تھا۔ مرحوم کا اصل میدان علمی و تحقیقی رہا ہے۔ موضوعات میں بھی بے حد تنوع ہے۔ البتہ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''میری تمام تحریریں قرآن Based ہوتی ہیں۔'' بلاشبہ ان کی تمام تصانیف ان کے اس بیان پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہیں۔

ڈاکٹر محمود حسن مرحوم کو ملک کے مختلف علاقوں میں منعقد ہونے والے سیمناروں میں قریب سے دیکھنے سننے اور نیاز حاصل کرنے کا اس حقیر کو بھی موقع ملا ہے اور ان کی ہمنشینی میں مقالہ پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ میں ان سادہ و بے ریا اور منکسر سی شخصیت سے جب بھی ملا، بے حد متاثر ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ جناب محمود حسن مرحوم کی قلندرانہ شخصیت اپنے اندر بڑی جاذبیت رکھتی تھی۔ ان کے مزاج میں جو سنجیدگی، متانت، بردباری، ذہنی کشادگی، وسعت نظریت اور پوری زندگی فقر و درویشی میں گزرنے کے باوجود جو سکون و اطمینان تھا وہ کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے، عسرت میں عشرت کی یہ کیفیت اب کہاں ملتی ہے؟

■

Dr. Shah Rashad Usmani
Head Dept of Urdu
Government Degree College
Karwar - 581301(KS)

'اردو دنیا' میں وفاتیہ تحریریں

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مرحومین کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے فوری طور پر مضامین شائع کیے جاتے رہے ہیں۔ 2016 میں بھی وفات پانے والی اہم علمی اور ادبی شخصیات پر جو تعزیتی تحریریں شائع کی گئی ہیں اس کا ایک اشاریہ پیش ہے—

انتظار حسین کی ناسٹلجیائی حسیت کے اجزا	نثار احمد ڈار	مارچ 2016
آہ عابد سہیل	ریشما پروین	مارچ 2016
اب راہ صحافت کا وہ راہی نہیں رہا	احمد سہیل صدیقی	مارچ 2016
زبیر رضوی کی نظمیں	پریمی رومانی	اپریل 2016
ندا فاضلی	غلام ابن سلطان	اپریل 2016
ندا کا آخری انٹرویو	وقار صدیقی	اپریل 2016
ندا کی منفرد صدا	عارف حسین جونپوری	اپریل 2016
انور سدید: احوال و آثار	چودھری ابن النصیر	مئی 2016
ادب کا رجل رشید: انور سدید	منصور حسن کمال	مئی 2016
فوزیہ چودھری کی آخری ساعتیں	شائستہ یوسف	مئی 2016
فوزیہ چودھری	وصی اللہ بختیاری	مئی 2016
پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی یاد میں	قاضی عبید الرحمن ہاشمی	جون 2016
یادیں پال انکل کی	محمد بشیر مالیرکوٹلوی	جون 2016
جوگندر پال کا تخلیقی کمال	اسلم جمشید پوری	جون 2016
ہندوستانی جمالیات کا استعارہ	شمس کمال انجم	جولائی 2016
کون ہے جس کو کہیں آپ کے جیسا منظور	نجمہ مصرا شوق	جولائی 2016
سیدہ جعفر	شاہنواز فیاض	اگست 2016
کشمیری لال ذاکر: کچھ احوال و اذکار	نند کشور وکرم	اکتوبر 2016
ادب کا آفاقی پیغام	شعیب رضا فاطمی	اکتوبر 2016

جناب محمود حسن مرحوم کی قلندرانہ شخصیت اپنے اندر بڑی جاذبیت رکھتی تھی۔ ان کے مزاج میں جو سنجیدگی، متانت، بردباری، ذھنی کشادگی، وسعت نظریت اور پوری زندگی فقر و درویشی میں گزرنے کے باوجود جو سکون و اطمینان تھا وہ کم لوگو ں کو نصیب ہوتا ہے، عسرت میں عشرت کی یہ کیفیت اب کہاں ملتی ہے؟

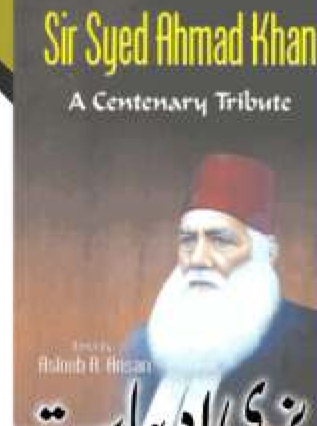

روبینہ رفیق

اردو اور انگریزی ادبیات کا رمز شناس اسلوب احمد انصاری

پروفیسر اسلوب احمد انصاری انگریزی اور اردو کے ممتاز ومنفرد نثر نگار اور نقاد ہیں۔ وہ نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں۔ اسلوب کا تعلق بنیادی طور پر انگریزی زبان وادب سے ہے لیکن انھوں نے اردو شعر وادب کا بھی عمیق مطالعہ کیا اور کافی حد تک عربی اور فارسی زبان سے بھی کسب فیض کیا۔ مختلف زبانوں کی ادبیات عالیہ کے مطالعے نے ان کے ذہن وفکر میں بالیدگی اور جلا بخشی انھوں نے انگریزی ادب میں شیکسپیئر اور بلیک پر بھی مضامین اور کتابیں لکھیں۔ شیکسپیئر ان کے مطالعے کا خاص موضوع ہے۔ بلیک پر ان کی دو کتابیں امریکہ میں شائع ہوئیں اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ورڈس ورتھ، ملٹن، کیٹس، ایلیٹ کو بھی موضوع مطالعہ بنایا۔ اسی لیے ان کو انگریزی اور اردو ادب کا یکساں طور پر نقاد سمجھا جاتا ہے، ان کی تنقیدی بصیرت نے مغربی ادب میں بھی دیر پا اثرات مرتب کیے ہیں۔ ادب کے بڑے بڑے علماء ودانشور نے واضح طور پر آپ کی تنقیدی بصیرت کا اعتراف کیا اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ 'فراق' جیسے بڑے شاعر نے اپنے پہلے شعری مجموعے 'گل نغمہ' میں اسلوب صاحب کے تنقیدی مضمون کو بطور دیباچہ شامل کیا۔ اس کے علاوہ 'خلیل الرحمن اعظمی' کے 'کاغذی پیرہن' کا پیش لفظ بھی اسلوب صاحب کا لکھا ہوا ہے۔

پروفیسر انصاری کو جن دو نامور شعرا نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ 'غالب' اور 'اقبال' ہیں۔ غالب سے متعلق ان کا پہلا مضمون 'کلام غالب کا ایک رخ' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ یہ گویا غالب تنقید کی تاریخ کی طرف پہلا قدم تھا۔ غالب کے متعلق اسلوب صاحب کے مضامین کا پہلا مجموعہ 'نقش غالب' کے نام سے شائع ہوا۔ اسلوب صاحب کا اصل اور پسندیدہ موضوع اقبالیات ہے۔ ان کا شمار محض مطالعہ شاعری یا روایتی طور پر اقبال پر لکھنے والوں میں نہیں ہوتا بلکہ وہ 'عاشقین اقبال' میں تصور کیے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود انھوں نے اقبال کی تفہیم وتعبیر میں کسی تعصب یا جذباتی وفور سے کام نہیں لیا ہے، بلکہ معروضی انداز میں ان کی شاعری کو فن کی کسوٹی پر جانچا اور پرکھا ہے، انھوں نے کھلے دل سے اعتراف کیا ہے کہ اقبال کے یہاں ایسی نظمیں بھی ہیں جن کے وجود پر فن کے اعتبار سے سوالیہ نشان ہے مثلاً 'اسرار خودی' اور 'رموز بے خودی' وغیرہ۔ ان میں صرف بعض خیالات اور نظریات کو مرتب کر دیا گیا ہے۔ کمال عشق کے باوجود یہ ان کی غیر جانبداری کی واضح دلیل ہے جس کے بغیر فن میں ارتقا محض ایک واہمہ تصور کیا جاتا ہے۔ اسلوب احمد انصاری نے علامہ اقبال کی شعری لفظیات، علامات وتلازمات اور نئی نئی تشبیہات واستعارات کی نہ صرف نشاندہی کی ہے بلکہ انھوں نے اقبالی شعور ووجدان کے ساتھ ان کی تفہیم وتشریح کی ہے، جب علامہ لفظ 'شاہین' کا استعمال اپنی شاعری میں کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد

کیا ہوتی ہے۔ شاہین علامہ کی نظر میں زہد وقناعت، صبر واستقامت ہمت وپامردی،اور عزم واستقلال کی علامت ہے:

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ
شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پردم ہے اگر تو،تو نہیں خطرۂ افتاد

اور یہی درویشی اقبال کے تصورات میں مومنانہ زندگی کی علامت ہے۔ جب قاری ان علائم کی اصلی روح تک پہنچ جاتا ہے تو اقبال کی تفہیم وتحسین اوران سے لطف اندوزی میں حد درجہ آسانی ہو جاتی ہے۔

کلی طور سے اقبال فہمی کے لیے علم کا مجمع البحرین یعنی مشرقی ومغربی علوم سے کما حقہٗ آشنائی ضروری ہے اور یہ صفت اسلوب صاحب میں بدرجہ اتم موجود ہے جب وہ اقبال کی خالص اسلامی فکر 'وحدۃ الوجود' اور 'وحدۃ الشہود' پر بحث کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ وہ عالم ادبیات نہیں بلکہ علم کلام اور تصوف کے بحر کے شناور ہیں۔ اقبال خدا کی صفت میں وجودیت اور شہودیت کے بڑے شد ومد سے قائل ہیں۔

اقبال کی شاعری سے متعلق مضامین اسلوب صاحب کی علمی کاوشوں میں مرکزی نقطے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبال پر لکھی دوسری کتابوں کے مقابلے پروفیسر انصاری کی کتابیں زیادہ تجزیاتی، معروضی اور علمی ہیں۔ انھوں نے اقبال کی شاہکار تخلیقات کے سرچشموں یعنی قوت متخیلہ، اساطیر، تمثال آفرینی اور استعارہ سازی کی فنی تدابیر پر روشنی ڈالتے ہوئے انھیں ایک جمالیاتی وحدت کے طور پر پیش کیا ہے۔ کلام اقبال کے تجزیے اور رتبے کے سلسلہ میں) ان کا بنیادی موقف ہے کہ قرآنی تعلیمات اور تعلیمی افکار سے صرف نظر کر کے اقبال کی شاعرانہ عظمت تک نہ تو رسائی ممکن ہے اور نہ ہی ان کے کلام کی پیچیدہ تعمیری ساخت کو پورے طور پر سمجھا جا سکتا ہے اسلوب صاحب نے کلام اقبال میں قرآنی تعلیمات کی مرکزیت کو وسیع پس منظر میں نمایاں کیا ہے۔ اقبال کی سو سالہ جشن تقریبات کے موقع پر انھوں نے اقبال پر مختلف لوگوں کے مضامین کا ایک مجموعہ Iqbal essays and studies کے نام سے بھی شائع کیا ہے۔ اسلوب صاحب اقبال کی شاعری پر جب تبصرہ کرتے ہیں تو اقبال کے تمام نظریوں سے بھی بحث کرتے ہیں۔ وہ ان کی شاعری کے ساتھ ان کا دنیا وآخرت کا نظریہ، ان کا 'میں' اور 'تو' کا فلسفہ، ان کی سیاست، ان کا معاشی نظریہ، پیغام انقلاب، معرفت، وجدان اور تعمیر خودی پر اپنے مزاج کے مطابق نہایت موثر گفتگو کرتے ہیں۔

اسلوب صاحب نے اقبال کی جن نظموں کے تجزیے کیے ہیں ان کے فکری وفنی امتیازات بھی روشن کیے ہیں اور تاثراتی یا تصوراتی گفتگو کرنے کے بجائے متن کی مثالوں سے اقبال کی نظموں کے امتیازات منکشف کیے ہیں۔ اقبال کے تصورات اور فنی محاسن کے محاکے میں اسلوب صاحب نے عمومی نوعیت کے سرسری تبصرے اور روایتی بیانات پر انحصار کرنے کے بجائے متن کے گہرے مطالعے اور دور رس انسلاکات کے تجزیے سے کام لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلوب صاحب کی تحریریں تازہ کار اور منفرد محسوس ہوتی ہیں۔ اقبال کی غزلوں کے تجزیے میں بھی انھوں نے امت مسلمہ کے ملی مسائل اور مابعد الطبیعاتی پہلوؤں کو روشن کر کے اقبال کے تخلیقی ذہن اور ان کی بنیادی تفہیم کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ اردو شاعری میں کلام اقبال کی معنویت کے ضمن میں اسلوب صاحب کا قول ہے کہ

اردو شاعری کے cannon میں اقبال کی غزلیں ایک نہایت اہم اور امتیازی درجہ رکھتی ہیں۔ اپنی اعلی شعری فطانت اور تخلیقیت کے بل بوتے پر انھوں نے غزل کے رنگ وآہنگ میں ایسی نمایاں تبدیلی پیدا کر دی جس کا سان وگمان بھی نہیں ہو سکتا تھا..... ان کی غزل کی شاعری ان کے پرواز تخیل فکری وفور ثروت اور ژرف نگاہی Perspicacity اور شخصیت کے ترنم وتموج کی آفریدہ ہے۔

(ص 23 اقبال جدید تنقیدی تناظرات: اسلوب احمد انصاری)

اسلوب صاحب کا طریقہ کار تجزیاتی ہے۔ متن کا تجزیہ کرنا اور ایسا تجزیہ کرنا جو صرف نقاد کے ذاتی معتقدات یا تعصبات کی ترجمانی نہ کرے بلکہ اس تجزیے کی بنیاد مشاہداتی اور معروضی ہو، ان کی تنقید کا امتیاز ہے ان کی تنقیدی تحریروں میں اسلامی اور مغربی فلسفے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اقبال کے فکر وفن اور ان کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ انھوں نے اپنی مختلف تصانیف میں پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں 'اقبال جدید تنقیدی تناظرات' نہایت اہم ہے۔ افتتاحیہ کے عنوان سے اسلوب صاحب کا مقدمہ خاص طور پر لائق تحسین ہے، جس میں انھوں نے خودی، فکر، انسانی وجود کے اسرار، خدا، ابلیس، خضر، وغیرہ کی استعاراتی معنویت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ 'اقبال کی منتخب نظمیں اور غزلیں'، 'نقش اقبال'، 'غالب اور اقبال'، 'اقبال حرف ومعانی'، 'اقبال اسطور نظمیں' وغیرہ تمام تحریریں اقبال سے اسلوب صاحب کی غیر معمولی دلچسپی کا بین ثبوت ہیں۔ ماہر اقبالیات کی حیثیت سے اسلوب صاحب کا امتیاز یہ ہے کہ اقبال سے جذباتی تعلق کے باوجود ان کے محاکے، تعین قدر میں ان کا رویہ تجزیاتی اور استدلالی ہوتا ہے۔ اسلوب صاحب کی کتابوں سے اقبالیات کے سرمائے میں نہ صرف وقیع اضافہ ہوا بلکہ مطالعات اقبال کی کئی راہیں بھی کھلی ہیں۔

ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں مختلف اعزازات سے نوازا گیا ہے جیسے میر ایوارڈ، غالب ایوارڈ، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ وغیرہ۔ اقبال پر ان کے کام کو تسلیم کرتے ہوئے حکومت پاکستان نے مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ دیا۔ اسلوب صاحب کی ایک بڑی خوبی تسلسل اور یکسوئی کے ساتھ علمی کاموں میں انہماک ہے۔ ان کے خیالات کی گہرائی کا تعلق ان کے وسیع فلسفیانہ مزاج سے ہے۔ اور زبان پر قدرت ان خیالات کی بہترین ادائیگی کا ذریعہ ہے۔ ادبی دنیا میں ان کے کارنامے قابل قدر ہیں۔ ■

کلی طور سے اقبال فہمی کے لیے علم کا مجمع البحرین یعنی مشرقی ومغربی علوم سے کما حقہ آشنائی ضروری ہے اور یہ صفت اسلوب صاحب میں بدرجہ اتم موجود ہے جب وہ اقبال کی خالص اسلامی فکر 'وحدۃالوجود' اور 'وحدۃالشھود' پر بحث کر تے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ وہ عالم ادبیات نہیں بلکہ علم کلام اور تصوف کے بحر کے شناور ہیں۔اقبال خدا کی صفت میں وجودیت اور شھودیت کے بڑے شد ومد سے قائل ہیں۔

ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں مختلف اعزازات سے نوازا گیا ہے جیسے میر ایوارڈ، غالب ایوارڈ، ساھتیہ اکادمی ایوارڈ وغیرہ۔اقبال پر ان کے کام کو تسلیم کرتے ہوئے حکومت پاکستان نے مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ دیا۔

Roobeena Rafique Dept of Urdu, Aligarh Muslim University, Aligarh - 200201 (UP)

محمد آدم

ڈاکٹر انور سدید کا نام اردو ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں، وہ ایک جامع الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے محقق، ناقد، مترجم، مبصر، مورخ، صحافی، مدیر، شاعر، افسانہ نگار، خاکہ نگار، انشائیہ نگار اور کالم نویس کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کی، نیز طنز و مزاح اور سفرنامے کے حوالے سے بھی انھیں شہرت حاصل ہے۔ انھوں نے 80 سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی ادبی وعلمی خدمات کے لیے اردو ادب میں انھیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

انور سدید ایک محنت کش نومسلم کشمیری راجپوت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش 4 دسمبر 1928 کو سرگودھا کی تحصیل بھلوال کے قصبہ میانی میں ہوئی۔ اگرچہ ان کا اصل نام محمد نورالدین تھا لیکن بعض خیر خواہوں کے مشورے سے انھوں نے انور سدید کا قلمی نام اختیار کیا۔ انگریزی میں بی اے کی ڈگری حاصل کی پھر سول انجینئرنگ مکمل کرکے محکمہ آب پاشی پنجاب میں سرکاری ملازم ہوئے۔ سنہ 1988 میں اسی محکمے سے بطور ایگزیکیوٹو انجینئر ریٹائر ہوئے۔ وہ پیشے کے اعتبار سے انجینئر تھے مگر اردو ادب ہی ان کا اوڑھنا اور بچھونا تھا۔

بچپن ہی سے شعر و ادب کا چسکا پڑ گیا تھا۔ شاعری میں اپنے دور کے معروف استاد مولوی محمد بخش کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا، اور ان سے اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے۔ ابھی نویں جماعت میں ہی تھے کہ 'سوتیلی ماں' کے عنوان سے ایک عمدہ ڈرامہ تحریر کیا جو بہت پسند کیا گیا۔ اُسی زمانے میں ایک قلمی رسالہ 'شوق' کے نام سے جاری کیا جس کے تمام مضامین وہ خود لکھتے رہے۔ اپنے ادبی سفر کے آغاز میں وہ افسانہ نگاری کی طرف مائل تھے۔ یہ افسانے ہمایوں، کامران، عالم گیر، نیرنگِ خیال، ساقی، آج کل، اور ماہِ نو جیسے موقر رسائل میں شائع ہوئے۔

1964 میں ان کا تبادلہ ان کے اپنے وطن 'سرگودھا' میں ہو گیا۔ یہاں ان کی ملاقات اردو کے معروف نقاد اور ادیب وزیر آغا سے ہوئی۔ وزیر آغا کی ملاقات ان کے ادبی سفر کے لیے سنگِ میل ثابت ہوئی۔ ان کے فیضِ تربیت سے ان میں کافی تبدیلی رونما ہوئی۔ پہلے وہ جز وقتی ادیب تھے اب ہمہ وقتی ادیب ہو گئے۔

غالباً انھیں کے کہنے پر انور سدید نے ایم اے اردو میں داخلہ لیا اور امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوئے اور گولڈ میڈل سے بھی نوازے گئے۔ اس کے بعد انھوں نے 'اردو ادب کی تحریکیں' کے عنوان پر پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، ان کے نگراں بھی وزیر آغا ہی تھے۔ وزیر آغا بہت پر مذاق شخصیت کے مالک تھے ان کے گھر پر ادبی اور علمی محفلوں کا سلسلہ رہا کرتا تھا۔ انور سدید ان محفلوں میں پابندی سے شریک ہونے لگے۔ اس سے ان کے ادبی شعور کو مزید تقویت اور جلا حاصل ہوئی اور شاید انھیں علمی صحبتوں کا فیضان تھا جس نے انھیں ایک دن اردو ادب کے معماروں کی صف میں لا کھڑا کیا۔

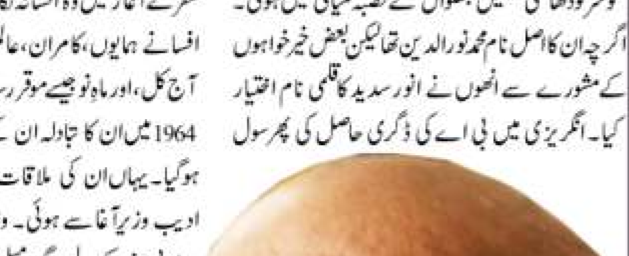

تنقیداور انور سدید

ان کا پہلا تنقیدی مضمون رسالہ 'اوراق' کے پہلے شمارے میں 'مولانا صلاح الدین احمد کا اسلوب' کے عنوان سے شائع ہوا۔ بعدازاں وہ صحافت سے وابستہ ہوئے اور کئی رسالوں کے ادارتی فرائض انجام دیے۔ اسی دوران ان کا میلان انشائیہ نگاری کی طرف ہوا، چنانچہ انشائیے پر ایک جامع حوالہ جاتی کتاب 'انشائیہ اردو ادب میں' کے نام سے لکھی۔ یہ کتاب ان کی تحقیقی وتنقیدی کاوشوں کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ ان کی پہلی تنقیدی کاوش فکر و خیال ہے جو 1971 میں منظرِ عام پر آئی۔ یہ ان کے تنقیدی وتحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کے دو مضامین خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں 'اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش' اور 'اردو ادب کی چند فکری تحریکیں'۔ اس میں سے اول الذکر مقالہ بعد میں ایک مستقل تصنیف کی حیثیت سے منصۂ شہود پر آیا۔

دوسرا مضمون اردو ادب کی چند فکری تحریکیں ان کی تنقید کے ارتقائی سفر کی ایک اہم منزل ہے۔ اگرچہ یہ مقالہ قدرے مختصر ہے لیکن ان کی وسعتِ مطالعہ کا آئینہ دار ہے۔ ولی دکنی سے لے کر وزیر آغا کے عہد تک کے فکری دبستانوں کو اس طرح بیان کرنا کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے سے ممیز نظر آئے کوئی معمولی بات نہیں تھی لیکن

انور سدید ایک محنت کش نومسلم کشمیری راجپوت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش 4 دسمبر 1928 کو سرگودھا کی تحصیل بھلوال کے قصبہ میانی میں ہوئی۔ اگرچہ ان کا اصل نام محمد نورالدین تھا لیکن بعض خیر خواہوں کے مشورے سے انھوں نے انور سدید کا قلمی نام اختیار کیا۔

انھوں نے اس دشوار کام کو بھی بہت اچھی طرح انجام دیا۔ حیرت تو یہ ہے کہ ان کے سامنے کوئی ایسا نمونہ بھی موجود نہ تھا۔ اس کے لیے جس طرح کی ریزہ چینی اور دماغ سوزی کرنی پڑی ہوگی اس کا اندازہ کچھ وہی

ڈاکٹر انور سدید کے فن کی اساس ان کا مطالعہ ہے جس کے لیے انھوں نے زندگی کا بیشتر حصہ صرف کیا اور ان کے تخلیقی اور تنقیدی کام کو غیر معمولی قرار دیا گیا انور سدید کی ایک اورخوبی ان کا رومانوی اندازنگارش(اسلوب) ہے جوہر صنف ادب کے مزاج سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ تخلیقیت کے جوہر سے مملوہے۔

لوگ لگا سکتے ہیں جنھیں اس طرح کے کام کرنے کا اتفاق ہوا ہو۔

تنقید بنیادی طور پر کسی ادب پارے کو پرکھ کر اس کی قدر و قیمت کا تعین ہے۔ سستی جملے بازی، جذباتیت اور محض اپنے افکار ونظریات کی ترویج واشاعت تنقید کے لیے سم قاتل ہے۔ تنقید نگار کا مطالعہ موضوع کی مناسبت سے وقیع اور ہمہ جہت ہونا چاہیے۔ انور سدید کی تحریر کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ ان کی تنقید ان عیوب سے پاک ہے، ان کا لہجہ سپاٹ نہیں بلکہ تخلیقی اور رومانی ہے۔ سجاد نقوی ایک جگہ انور سدید کے فن کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر انور سدید کے فن کی اساس ان کا مطالعہ ہے جس کے لیے انھوں نے زندگی کا بیشتر حصہ صرف کیا اور ان کے تخلیقی اور تنقیدی کام کو غیر معمولی قرار دیا گیا۔ انور سدید کی ایک اور خوبی ان کا رومانوی انداز نگارش (اسلوب) ہے جو ہر صنف ادب کے مزاج سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ تخلیقیت کے جوہر سے مملو ہے۔ ان کی ادبی جہات کثیر ہیں اور اتنی جہات اُردو کے بہت کم ادیبوں میں مجتمع نظر آتی ہیں''۔

(دیباچہ، ص 11 'پاکستانی ادب کے معمار انور سدید شخصیت اور فن' پروفیسر سجاد نقوی اکادمی ادبیات پاکستان 2010)

انور سدید نے جہاں علامہ اقبال پر 'اقبال کے کلاسیکی نقوش' اور 'اقبال شناسی' جیسی اہم کتابیں تحریر کی ہیں وہیں 'اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش' ان کی بہت ہی اہم کتاب ہے جو افسانوی ادب میں دیہی زندگی کی عکاسی کو ایک نئے زاویے سے متعارف کراتی ہے اور اس کے نئے دریچے وا کرتی ہے۔

اس کے علاوہ 'انشائیہ اردو ادب میں'، اردو ادب میں سفرنامہ، اردو ادب کی تحریکیں، اردو ادب کی مختصر تاریخ، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ ان کی تاریخ نویسی اور تحریری و تحقیقی صلاحیت کی غماز ہے۔ ان کی کتاب 'اردو ادب کی تحریکیں' سے تو تقریباً پوری اردو دنیا واقف ہے۔ ان کی دوسری ایک اور اہم کتاب 'اردو ادب کی مختصر تاریخ' خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ اس مختصر سی کتاب میں جتنی جہات اور موضوعات کو شامل کیا گیا ہے شاید ہی کسی اردو کی تاریخ میں اتنی جہات اور موضوعات کا تعارف کرایا گیا ہوگا۔

انور سدید خود ایک کہنہ مشق شاعر تھے ان کو مرثیہ سے خاص لگاؤ تھا یہی وجہ ہے کہ انھوں نے میر انیس کی اقلیم سخن، میر انیس کی قلم رو لکھ کر مرثیہ سے اپنے لگاؤ اور مرثیہ کی عظمت کو واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اس کے علاوہ غالب کا جہاں اور اردو شاعری کا دیا، اردو نظم کے ارباب اربعہ، غزل کے رنگ وغیرہ جیسی تالیفات ان کی شعر فہمی اور کلاسکی ادب پر ان کی عمیق نظری کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں۔

اردو نثر میں اپنی تحریروں کے قوس وقزح بکھیرنے والے انور سدید نے اردو نثر کے حوالے سے بھی کئی اہم اور یادگار کام کیے جن میں شمع اردو کا سفر، نئے ادبی جائزے، برسبیل تنقید، اردو افسانے کی کروٹیں، اردو نثر کے آفاق، وزیر آغا ایک مطالعہ، غالب کے نئے خطوط، (طنزومزاح)، دلاور فگاریاں (سوانح) جیسی کتابیں شامل ہیں۔

ان کی کتابوں کی فہرست پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی اندازہ ہوجاتا ہے کہ ان کی تنقیدی روش کس قدر مستحکم اور ان کی جہات کتنی مختلف النوع ہیں۔

انور سدید اور تحقیق

ادبی تحقیق تخلیقات میں نئے زاویے، اصناف کی نئی تفہیم اور اس کے ارتقائی مراحل کی نئی حالتوں کا بیان ہے۔ تحقیق وتخلیق ایک ایسا عمل ہے جو دنیا کے مختلف گوشوں میں جاری وساری ہے۔ ان سب کو تلاش کر اکٹھا کرنا بھی ادبی تحقیق کا حصہ ہے۔ ساتھ ہی ادب کی نئی سمتوں کے تعین کا عمل بھی محقق ہی ناقد کی صورت میں انجام دیتا ہے۔ ورنہ بنیادی طور پر تحقیق ادب میں صرف دریافت تک محدود ہے!۔

''اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش'' انور سدید کی پہلی تحقیقی کاوش ہے۔ اس کے علاوہ نہوں نے اردو ادب میں انشائیہ، اردو ادب میں سفرنامہ جیسی اہم تحقیقی خدمات انجام دیں۔ اردو ادب میں انشائیہ یوں تو دس ابواب پر مشتمل ہے، اور یہ کتاب اردو انشائیہ کی تفہیم میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اس کتاب کے آٹھویں باب میں انور سدید نے: جس طرح اُردو کے گمشدہ انشائیہ نگاروں کی بازیافت کی ہے، اور ان کو متعارف کرایا ہے یہ ایک کارنامہ ہے۔

ان کی کتاب 'اردو ادب میں سفرنامہ' تقریباً ساڑھے سات سو صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب سفرنامے کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ انور سدید اس جہاں دیدہ شخصیت کا نام ہے جو ہر سال ایک ایسا مضمون لکھا کرتے تھے جس میں دنیا بھر میں اردو ادب کے تحقیقی اور تنقیدی کاموں کا لیکھا جوکھا ہوا کرتا تھا جو نہایت معلوماتی ہوا کرتا تھا۔ جو اہل تحقیق کے لیے ایک بیش قیمت تحفہ تھا۔

اس کے علاوہ ان کے مقالے ہوں یا ان کے وہ مضامین جس میں وہ دنیا بھر میں خصوصاً برصغیر میں ہونے والی تحقیقات کا جائزہ لیا کرتے تھے۔ ان کی تاریخ نویسی بھی تحقیق کا عمدہ نمونہ ہے۔ جائزے نئے ادبی جائزے 1988، جائزہ اردو ادب 1998 تا 2008 اس طرح کے ان کے مضامین اردو تحقیق کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

انشائیہ نگاری

ڈاکٹر سدید نے اردو انشائیہ کو متعارف کروانے اور اس کی شناخت کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، اگرچہ وہ بنیادی طور پر ناقد تھے لیکن انھوں نے سفرنامے، انشائیے اور افسانے بھی تحریر کیے۔ ان کی کتاب 'انشائیہ اردو ادب میں' ان کی تنقیدی اور تحقیقی صلاحیتوں کی عکاسی کرتی ہے۔ دسمبر، مچھر کی مدافعت میں، مونچھیں، شور، غلطی کرنا، تاروں بھری رات اور ذکر اس پری وش کا 'ان کے انشائیہ کے عمدہ نمونے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں کہیں شاعرانہ احساس تو کہیں افسانوی اور ڈرامائی رنگ کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح کے عمدہ نمونے

انور سدید اس جہاں دیدہ شخصیت کا نام ہے جوہر سال ایک ایسا مضمون لکھا کرتے تھے جس میں دنیا بھرمیں اردوادب کے تحقیقی اور تنقیدی کاموں کا لیکھا جوکھا ہوا کرتا تھا جو نہایت معلوماتی ہوا کرتاتھا جو اہل تحقیق کے لیے ایک بیش قیمت تحفہ تھا

جا بجا نظر آتے ہیں۔ آسمان میں پتنگیں، ذکر اس پری وش کا انور سدید کے انشائیوں کے مجموعے ہیں۔

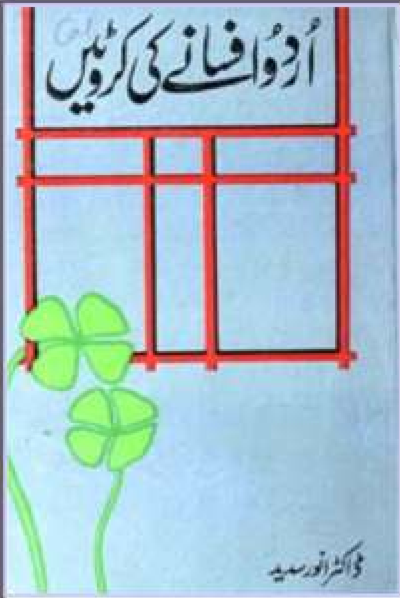

بحثیت افسانہ نگار

انور سدید ایک اچھے افسانہ نگار بھی ہیں اور اس حیثیت سے بھی کسی حد تک انھوں نے شہرت پائی۔ ان کا ادبی سفر افسانے سے ہی شروع ہوا تھا۔ ان کا پہلا افسانہ 'مجبوری' تھا۔ جس افسانے نے انور سدید کو شہرت دی وہ 'مایوس آنکھیں' تھا جو ماہنامہ 'مشہور' کے انعامی مقابلے میں شامل ہوا اور اول انعام کے لیے منتخب ہوا۔ انور سدید نے اس کے علاوہ کئی اچھے افسانے تخلیق کیے جن میں وکٹوریہ کراس، لاوارث، ستاروں کے موتی، نیل کنٹھ، دلِ ناتواں، شیش محل، پوپھٹے، کچی مٹی کا بند اور سجدہ سہو، وغیرہ ہیں۔ چونکہ انور سدید نے افسانے کو بہت کم منہ لگایا اس لیے کوئی لافانی افسانہ ان کے نوکِ قلم سے قاری تک نہیں پہنچا۔ البتہ جو بھی افسانے انھوں نے تحریر کیے اس میں ایک ادبی شان بہرحال دیکھی جا سکتی ہے اور ان کے افسانوں اور کردار میں فطرت کی عکاسی اور دیہی زندگی کا اچھا بیان نظر آتا ہے۔

بحیثت شاعر

غزل، نظم، قطعہ اور حمد و نعت انور سدید کی شعری کائنات کے کواکب ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز 1968 سے کیا، ان کی بیاض میں اتنے کلام ہیں جن سے کئی مجموعے ترتیب دیے جا سکتے ہیں لیکن اس جانب ان کی رغبت ذرا کم ہی ہوئی۔ ان کے اشعار میں بلا کی روانی شوخی اور ندرت پائی جاتی ہے۔ حمد کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے خدا کربِ نا صبوری دے
درد بھی دے تو لاشعوری دے
ربِ کعبہ مری گذارش ہے
مجھ کو دیدارِ آنحضوریؐ دے
مجھ کو کچھ خواہشِ دوام نہیں
زندگی دے مگر ادھوری دے
یہ ہے انور سدید کی عرضی
اس کو منظوریِ ضروری دے

چند اشعار دیکھیں:

ڈھونڈ اپنا آشیانہ آسمانوں سے پرے
یہ زمیں تو ہوگئی نامہرباں انور سدید
جب بھی گزرا ہوں اس شہر کی گلیوں سے سدید
آنکھ ہنستی ہے تو دل آبلہ پا ہوتا ہے
انور سدید یہ بھی ہے فطرت کا معجزہ
پھل پھول لگ رہے ہیں جو سوکھے درخت کو

ان چند اشعار کو پڑھ کر جو انور سدید کی شاعری کا تصور ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے کلام میں گہرائی و گیرائی کے ساتھ ساتھ ترنم جدید اسلوب اظہار، ایمائیت اور روایتی بوباس بھی ملتی ہے۔ غزلوں کے علاوہ انھوں نے بہت اچھی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ پتھر، نروان، زمیں، استنباط، پورے سیب کی تلاش، شب خون، خزاں، سناٹے کی سرگوشی وغیرہ ان کی عمدہ نظموں میں شمار کی جا سکتی ہیں، جن میں نئی لفظیات کے ساتھ کلاسیکل راگوں کی گھن گرج صاف سنائی پڑتی ہے۔ انھوں نے شاعری کی دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے مثلاً ہائیکو اور دوہے وغیرہ بھی لکھے ہیں۔

بحیثیت صحافی اور کالم نویس

کسی بھی اخبار کی انفرادیت اس میں لکھے جانے والے کالم سے ہی قائم ہوتی ہے۔ اس کی پالیسی اور نظریات کو سلیقے سے کالم نگار ہی کے توسط سے قاری تک پہنچایا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر کالم نویسی صحافت ہی کی ضرورت ہے۔ انور سدید اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں کالم لکھا کرتے تھے۔ وہ مدۃ العمر نوائے وقت، حریت، جسارت، خبریں جیسے روزناموں اور پورٹل کے لیے کالم نویسی کرتے۔ انھوں نے ادبی اور غیر ادبی دونوں قسم کے کالم لکھے۔

انھوں نے بہت سے کالم اپنا نام بدل کر فرضی ناموں سے لکھے مثلاً زود اندیش، قلم بردار، تُلسی داس گریب، ڈاکٹر فرنویس جیسے قلمی ناموں سے بھی انھوں نے کالم تحریر کیے۔ وہ اپنے کالموں میں سیاسی، سماجی، ثقافتی، ادبی اور عالمی منظرنامے پر بے باکی سے اظہار خیال کیا کرتے تھے۔ عوام میں انھیں کافی مقبولیت حاصل تھی اور لوگ ان کے کالموں کو دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے اور اس کے لیے اخبار کی آمد کے منتظر رہا کرتے تھے۔ اگر ان کے کالموں کو یکجا کیا جائے تو اس زمانے کی سیاسی، تاریخی، ثقافتی اور ادبی دستاویز مرتب کی جا سکتی ہے۔

انور سدید پر ہونے والے تحقیقی کام

برِصغیر کے بہت سارے رسائل نے انور سدید پر گوشے شائع کیے جن میں اوراق، تخلیق، ارتکاز، جدید ادب، کوہسار جرنل، چارسو اور روشنائی وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی شخصیت اور فن کے تعلق سے کئی کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ ان پر لکھی گئی کتابوں میں پروفیسر سجاد نقوی کی کتاب گرم دم جستجو اور پاکستانی ادب کے معمار انور سدید شخصیت اور فن بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ اس کے علاوہ ملک اور بیرون ملک کی کئی جامعات سے ان پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کے کام انجام پا چکے ہیں اور بہت سے مقالے لکھے جا رہے ہیں۔

مشاہیر ادب کی نظروں میں

انور سدید مشاہیر کی نظروں میں ایک ادبی دبستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو کے اکثر نقادوں اور انشا پردازوں نے ان کی ادبی حیثیت کو تسلیم کیا ہے اور اپنی نگارشات میں ان کی جی کھول کر تعریف کی ہے۔ ان لوگوں میں موجودہ منظرنامے کے تقریباً سبھی اہم نام مثلاً شمس الرحمان فاروقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، مشفق خواجہ، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر سہیل بخاری، مرزا ادیب، غلام الثقلین نقوی، حنیف باوا، جوگندر پال، بلراج کومل، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر ناصر عباس نیر جیسی جہاں دیدہ اور نابغۂ روزگار شخصیات شامل ہیں۔ اس طرح ان کے چاہنے والوں اور ان کے قدردانوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔

ادب کے محنت کش، محسنِ اردو اور دبستانِ سرگودھا کے ترجمان انور سدید زندگی بھر کسی بھی ادبی ادارے سے وابستہ نہیں رہے۔ اپنی حیات کے کسی لمحے کو ضائع نہ ہونے دیا۔ اس قدر سنجیدہ شخصیت کے مالک تھے کہ درویش منش سمجھے جاتے تھے۔

اردو کے نامور نقاد بابائے ادب ڈاکٹر انور سدید ایک ایسے ادیب گذرے ہیں جنھوں نے ادب کی اکثر و بیشتر اصناف میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے اور کسی بھی صنف ادب کو محض تفریح طبع کی خاطر مس نہیں کیا بلکہ جس میدان میں بھی قدم رکھا اس میں اپنی مُہر ثبت کر دی۔ 20 مارچ 2016 کو انھوں نے آخری سانسیں لیں۔ زندگی کی 88 بہاریں دیکھنے والے اس مردِ ادب نے آخری لمحات تک قلم کو اپنے ہاتھوں سے چھوٹنے نہ دیا: ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

■

Dr. Mohd Adam, Guest Faculty, Dept of Urdu,
Jamia Millia Islami, New Delhi - 110025
Mob.:9871716440

اردو کا خاموش خدمت گزار
احسن سلیم

شاہ نواز فیاض

اکیسویں صدی کے دوسرے عشرے کے دوسرے حصے کا ابتدائی سال (2016) اردو کے شیدائیوں کے لیے بہت تکلیف دہ رہا۔ جنوری 2016 سے اب تک نہ جانے اردو کے کتنے شاعر و ادیب، ناقد و محقق دنیا سے چلے گئے۔ اگر سرسری طور پر نگاہ ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ پوری بستی اجڑ گئی ہے۔ ملک زادہ منظور چلے گئے، انتظار حسین، جوگیندر پال، اسلم فرخی، عابد سہیل، زبیر رضوی، ندا فاضلی، اسلوب احمد انصاری، شکیل الرحمٰن، سیدہ جعفر، احسن سلیم اور اب پیغام آفاقی بھی اپنے آفاقی پیغام کو چھوڑ کر اس دنیا سے چلے گئے۔ ایسا لگتا ہے کہ کوئی آندھی چلی، اور بہت سارے لوگوں کو اپنے ساتھ اڑا لے گئی۔ مذکورہ بالا اسما پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ احسن سلیم کو ابھی سے لوگوں نے بھلانا شروع کر دیا ہے۔ البتہ یہ خوش آئین خبر ہے کہ 'اجرا' کا کوئی خاص شمارہ ان کی خدمات کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ بنیادی طور پر احسن سلیم ایک شاعر تھے، لیکن ادب کے متعلق ان کا جو نظریہ تھا، وہ معروف سہ ماہی رسالہ 'اجرا' کی ابتدا سے ہوتا ہے۔ اس رسالے میں انھوں نے 'ادب برائے تبدیلی' کے متعلق جس بحث کا آغاز کیا تھا، وہ بہت دنوں تک یاد کیا جائے گا۔ اس بحث میں کئی بڑے ناموں نے بھی حصہ لیا۔

احسن سلیم (1949 تا 25/جون 2016) کا اصلی نام محمد سلیم قائم خانی تھا۔ انھوں نے حیدرآباد سٹی کالج سے گریجویشن کیا اور سندھ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے پاس کیا۔ 1973 سے بینک میں ملازمت کرنے لگے۔ انھیں بچپن ہی سے کہانیاں سنانے کا شوق تھا۔ احسن سلیم نے نثری نظم اور غزل میں طبع آزمائی کی۔ اجرا جیسے رسالے کی کامیاب ادارت کی۔ ادب سے ان کی محبت بے لوث اور منفعت سے عاری تھی۔ وہ نہ صرف ایک ادبی جریدے کے مدیر اور سرپرست تھے، بلکہ کتنے نئے اور تازہ اذہان کے پاسبان اور رفیق تھے۔ احسن سلیم سہ ماہی 'اجرا' سے پہلے 'سخن زار' سے وابستہ تھے۔ ادارت کا سلسلہ ملازمت کی سبکدوشی کے بعد شروع ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک محنتی انسان تھے۔ اس کا ثبوت انھوں نے سہ ماہی 'اجرا' کو سامنے لا کر دیا۔ یہ سہ ماہی رسالہ کراچی (پاکستان) سے احسن سلیم کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ دراصل یہ سہ ماہی کتابی سلسلہ تھا۔ اس کا پہلا شمارہ جنوری تا مارچ 2010 میں منظر عام پر آیا۔ غالباً اس کا آخری شمارہ جولائی تا ستمبر 2015 میں آیا۔ اس اعتبار سے کل تیئس شمارے منظر عام پر آئے۔ جب تک احسن سلیم کی صحت ٹھیک تھی، اس وقت تک یہ رسالہ تسلسل کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔ اجرا کے ابتدائی شماروں کے سرورق پر لکھا ہوتا تھا:

''منتخب عالمی اور علاقائی ادب کے ساتھ ساتھ پاکستان، ہندوستان اور دنیا بھر کے منفرد اور مقبول لکھاریوں کے مضامین، کہانیاں، شاعری اور دیگر فن پاروں پر محیط سہ ماہی کتابی سلسلہ۔''

اس سے واضح ہوتا ہے کہ احسن سلیم نے اس کام کو بڑے منصوبے کے ساتھ شروع کیا تھا۔ یہ ان کی ادب کے تئیں دلچسپی کی انتہا ہے؛ ورنہ بینک میں ملازمت سے سبکدوشی کے بعد، وہ اپنے آپ کو کہیں مصروف کر سکتے تھے، لیکن انھوں نے ادب کی خدمت کو ہی اپنا فریضہ سمجھا۔ دوران ملازمت لوگ انھیں سخن سنج اور سخن فہم کی حیثیت سے ہی جانتے تھے، لیکن انھوں نے اپنا دوسرا رخ سہ ماہی 'اجرا' سے شروع کیا۔ اگر ان کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا جائے تو صرف اور صرف اس رسالے کی وجہ سے ان پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ اجرا میں ایک کالم 'خیابان خیال' کے عنوان سے تھا۔ اس کالم کے تحت احسن سلیم الگ الگ موضوعات پر اداریہ لکھا کرتے تھے۔ اس اداریے سے ان کا تنقیدی رویہ بھی سامنے آیا۔

احسن سلیم اچھے اور معیاری ادب کے دلدادہ تھے۔ وہ ہمیشہ اچھے ادب کی تخلیق پر زور دیتے تھے۔ یہ ان کا ادب کے تئیں محتاط رویہ ہی کہا جائے گا، جو انھوں نے اجرا کے تیئسویں شمارہ (جولائی تا ستمبر 2015) میں 'ادب آزاد ہے!' کے موضوع پر لکھتے ہوئے کہا تھا کہ:

''ہمارے مین اسٹریم کے دانشور ایک ایک کر کے اٹھتے جا رہے ہیں۔ حسن عسکری اور فیض احمد فیض سے قمر جمیل تک اہم ادبی دانشور اب ہم میں نہیں ہیں... بعض نقاد ایسے بھی ہیں جو تیسرے چوتھے درجے کے شاعروں کی شان میں قصیدے لکھ لکھ کر انھیں فیض اور راشد سے بھی بڑا شاعر بنانے پر تلے بیٹھے ہیں۔

غیر تخلیقی ادب کی حوصلہ افزائی کے رویوں کو ترک کر دینا چاہیے۔ بگاڑ اور خرابی کی جڑ یہی 'حوصلہ افزائی' ہے۔''

(اجرا۔ کراچی، پاکستان۔ جولائی تا ستمبر 2015، ص 12)

احسن سلیم کے درج بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ادب کے معیار کو باقی رکھنے کے لیے وہ کس قدر محتاط ہیں۔ یہ سچ بات ہے کہ ہم ادب کی بات کرتے ہیں، لیکن اس میں مقصدیت اس طرح غالب ہے کہ بسا اوقات اس کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔ بعض نعروں نے ادب کو بہت نقصان پہنچایا؛ جیسے 'ادب برائے ادب' اور 'ادب برائے زندگی'۔ ذکر بالا اداریے میں احسن سلیم نے اسی آزادی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ دراصل یہ پورا اداریہ سوسن سون ٹیگ کی اس تقریر سے ماخوذ ہے، جو انھوں نے فرائیڈن اسپریس (Frieden Spries) ایوارڈ کے موقع پر 2003 میں کی تھی۔ سوسن سون ٹیگ نے اپنی تقریر میں ادب کی اسی آزادی کا مدعا اٹھایا تھا۔ اردو قارئین کے سامنے احسن سلیم نے اسے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ اسی طرح سے احسن سلیم نے اجرا کے اکیسویں شمارے (جنوری تا مارچ 2015) میں 'ادبی و فکری اقدار کی صورت گری' کے عنوان سے جو اداریہ لکھا وہ بھی کئی اعتبار سے کافی اہم ہے۔ اسی میں انھوں نے اعلان کیا تھا کہ اجرا اور عالمی تحریک ادب کے زیر اہتمام اگست 2015

میں 'ادب برائے تبدیلی' کے حوالے سے ایک بین الاقوامی ادبی کانفرنس کا انعقاد کرے گی۔لیکن جن لوگوں نے تعاون کرنے کا وعدہ کیا تھا، وہ بوجوہ پیچھے ہٹ گئے۔اور اس پروگرام کو اس سطح پر عملی جامہ نہیں پہنایا جاسکا، جیسا وہ چاہتے تھے،اس کا انھیں بہت ملال بھی تھا۔لیکن اس بحث کو اجرا میں انھوں نے اٹھایا، اور کئی اہم لکھنے والوں (محمد ناصر شمسی، پروفیسر عتیق احمد جیلانی، ریاض تسنیم) نے حصہ لیا؛ اور کئی کئی قسطوں میں اپنی بات قارئین کے سامنے پیش کیں۔

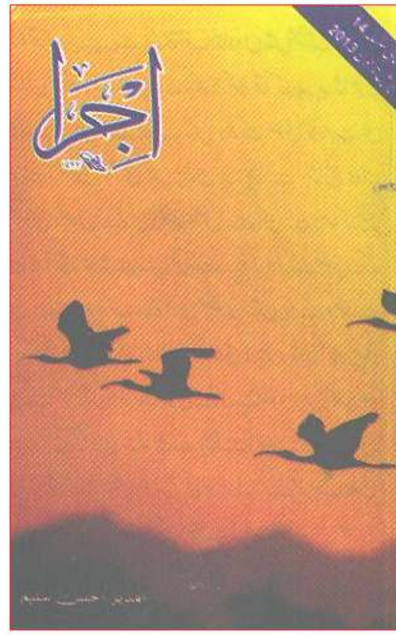

احسن سلیم کے دوسرے اداریے جیسے 'آنسوؤں کا بہتا ہوا دریا' (اکتوبر تا دسمبر 2014)، خالی جیب اور خالی ہاتھ، جمہوری طرز احساس اور شکر گزاری کے جذبات (شمارہ 18)، باطنی تسکین، کے علاوہ ان کے دوسرے اداریے، اسی طرح سے ادب کے کسی نا کسی مسئلے پر ہوتے تھے۔ان کے اداریے، نہ صرف کسی مسئلے پر لکھے جاتے تھے، بلکہ وہ تاریخی اور علمی اعتبار سے بھی کافی اہم ہوتے تھے کہ انھوں نے اپنے اداریے سے اردو قارئین کو متعصب ذہنوں سے آزادی دلانے کی بھر پور کوشش کی ہے۔ادب کو تعلقات کی عینک سے نہ دیکھا جائے، بلکہ فن پارے کو فن کی کسوٹی پر پرکھا جائے؛ ممکن ہے کہ نقاد کے سخت جملے سے کسی کو دکھ پہنچے، لیکن ادب کی تعمیر وترقی میں ایسا کرنا ناگزیر ہے۔قاضی عبدالودود نے تعلقات سے بہت اوپر اٹھ کر اپنے تبصرے لکھے،ان کے تبصرے بلاشبہ سخت ترین ہوتے تھے، لیکن محققین نے احتیاط سے کام لینا شروع کیا۔ضرورت اس بات کی ہے کہ پھر سے کوئی قاضی عبدالودود بنے، پھر سے کوئی احسن سلیم بن کر 'خیابان خیال' لکھے۔اس سے ادب میں پختگی ہی آئے گی۔آنے والی نسلوں کو اگر کچھ دینے کا ارادہ ہے تو سخت لہجہ ہونا ہی پڑے گا۔معیاری ادب کی تخلیق پر ہی احسن سلیم نے زور دیا ہے، ادب کی بقا کے لیے معیار ہی سب سے موثر ذریعہ ہے۔

احسن سلیم بنیادی طور پر شاعر تھے۔ان کی نظمیں اور غزلیں اور بطور خاص نثری نظمیں ہی ان کے اردو ادب میں تعارف کا ذریعہ بنیں۔نثری نظم کی تحریک جو قمر جمیل، رئیس فروغ، ضمیر علی اور دیگر سینئر حضرات نے شروع کی تھی، احسن سلیم بھی اس کے ہراول دستے میں شامل تھے۔ احسن سلیم نے بے شمار نثری نظمیں کہی ہیں، ان میں کچھ تو بے مثال ہیں، جیسے وراثت، آسمانی جنون وغیرہ۔

احسن سلیم کی جو کتابیں شائع ہوئی ہیں، وہ 'ست رنگی آنکھیں'، 'منجمد پیاس'، 'جوئے میں جیتی ہوئی آنکھیں'، 'آسمانی جنون'، 'وراثت' کے علاوہ خطوط کا ایک مجموعہ 'پتوں میں پوشیدہ آگ' ہیں۔لیکن احسن سلیم کے تعلق سے پڑھتے ہوئے اس بات کا اندازہ ہوا کہ 'اجرا' کی اشاعت نے انھیں ایک الگ پہچان دی۔ادب کے تعلق سے ان کے نظریات 'اجرا' ہی کے ذریعے لوگوں کے سامنے آئے۔اس کے علاوہ احسن سلیم نئے لوگوں کے لیے 'اجرا تخلیقی مکالمہ' کے تحت ہر پندرہ دن کے بعد ایک اجلاس منعقد کرتے تھے، جس میں شہر کے بہت سے افراد شریک ہوتے تھے۔ان جلسوں میں مضامین، افسانے اور شاعری پڑھی جاتی تھی اور پھر اس پر مکالمہ ہوتا تھا۔اس کی پذیرائی کراچی کے ادبی حلقوں میں بھی کی گئی۔اس سے واضح طور یہ بات سامنے آتی ہے کہ احسن سلیم نے ادب کے حسن کو نکھارنے اور معیاری بنانے میں اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کی۔وہ اسی کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ گردانتے تھے۔

'اجرا' کی اشاعت نے انهیں ایک الگ پہچان دی۔ ادب کے تعلق سے ان کے نظریات 'اجرا' ہی کے ذریعے لوگوں کے سامنے آئے۔اس کے علاوہ احسن سلیم نئے لوگوں کے لیے 'اجرا تخلیقی مکالمہ' کے تحت ہر پندرہ دن کے بعد ایک اجلاس منعقد کرتے تھے، جس میں شہر کے بہت سے افراد شریک ہوتے تھے۔ ان جلسوں میں مضامین، افسانے اور شاعری پڑھی جاتی تھی اور پھر اس پر مکالمہ ہوتا تھا۔اس کی پذیرائی کراچی کے ادبی حلقوں میں بھی کی گئی۔

احسن سلیم کا شمار نظم کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ان کی نثری نظم کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا اسلوب بہت جداگانہ ہے۔بلند خیال، نئی لفظیات، پرقوت آہنگ۔لیکن ایک چیز کا احساس ضرور ہوتا ہے کہ انھوں نے کچھ عدم توجہی برتی، اور ایسا بھی لگتا ہے کہ کچھ اپنوں نے بھی غفلت کا مظاہرہ کیا؛ کیونکہ ان کی کتابیں صحیح معنوں میں قارئین تک پہنچ ہی نہیں سکیں۔اس سمت بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ ان کے ادبی سرمایے کو عام قارئین تک پہنچایا جائے۔اس کا ایک بنیادی فائدہ ضرور ہوگا کہ جو لوگ احسن سلیم سے واقف ہیں، وہ ان کے سرمایے سے انھیں جانیں گے۔اور چند لوگوں تک محدود ہونے کے بجائے ایک بڑے حلقے تک ان کا سرمایہ پہنچ جائے گا۔چیزیں ضائع ہونے سے بچ جائیں گی۔

احسن سلیم نے عام طور پر نظمیں ہی کہی ہیں، لیکن ان کی غزلیں، وہ تعداد میں چاہے جتنی بھی ہوں، ان میں نہ صرف روانی ہے، بلکہ ان کے پڑھنے سے عجیب وغریب سی نغمگی کا احساس ہوتا ہے۔انھوں نے اپنی غزلوں میں جس احساس کے سہارے اپنی بات کو غزل کے سانچے میں ڈھالا ہے، اس میں زندگی کے بہت سے ٹوٹے ہوئے رشتوں کی یاد سمٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ وہاں (پاکستان) جا کر بھی اپنے آبائی وطن راجستھان (ہندوستان) کو کسی طور بھی بھول نہیں سکے۔احسن سلیم کے یہاں احساس دراصل زندگی کی علامت ہے، وہ انھیں میں چلتی پھرتی دنیا دیکھتے ہیں۔غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

میں سمت غیب سے قدموں کی چاپ سنتا ہوں
مدیرِ وقت ہوں صدیوں کی چاپ سنتا ہوں
نجانے کون ہے؟ کس کا کلام ہے لیکن!
میں گوش دہر ہوں صدموں کی چاپ سنتا ہوں
ہوا جو قتل وہ صدیوں کا نور تھا شاید
کنارِ آب، میں نوحوں کی چاپ سنتا ہوں
گھروں میں جاگتا رہتا ہے خواب کا منظر!
مگر میں نیند میں بوٹوں کی چاپ سنتا ہوں

احسن سلیم انجام کی پرواہ کیے بغیر اپنی بات کہتے تھے۔پاکستان میں جب دہشت گردوں نے اسکولی بچوں کو اپنی درندگی کا شکار بنایا تھا تو اس وقت احسن سلیم نے 'اجرا' کا

> احسن سلیم نے قلم کا سودا نہیں کیا۔انھوں نے وہ لکھا، لکھا جانا چاہیے تھا۔احسن سلیم کا یہ شعر 'ہوا جو قتل وہ صدیوں کا نور تھاشاید، کنار آب، میں نوحوں کی چاپ سنتا ہوں' یا ان جیسے اشعار، ان کے بلند حوصلے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔احسن سلیم زندگی جینے کے نئے نئے امکانات تلاشتے تھے۔ایک طرف قتل تو دوسری طرف کنار آب اور نوحوں کی چاپ، اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ وہ حالات سے لڑنے میں یقین رکھتے تھے اور ایسا اس لیے تھا، کیونکہ انھیں خود پر بھروسا تھا۔

جو اداریہ لکھا تھا، وہ ان کی بے باکی کا کھلا اظہار ہے۔ انھوں نے جہاں ہتھیاروں کی مذمت کی ہے، وہیں حکومت پاکستان کے رویے پر سوال بھی اٹھایا تھا۔انھوں نے لکھا تھا:

''دنیا کی تاریخ میں معصوم طالب علموں پر، دہشت گردوں کا ایسا بہیمانہ حملہ، علمی درسگاہ میں موت کا ابلیسی رقص، دراصل اکیسویں صدی کے بطن سے پیدا ہوتی ہوئی انسانیت اور عالمی کلچر کے رخسار پر دہشت گردی کا ایسا طمانچہ ہے جس کی انگلیوں کے نشان مدتوں انسانیت کو شرمندہ کرتے رہیں گے۔ ہمارے وطن میں دہشت گردی کی سفاکانہ کارروائیاں گزشتہ چار دہائیوں سے جاری ہیں۔ان دہشت گردوں کے خلاف ہماری حکومتوں کے بے فیض اور لایعنی اقدامات محض خانہ پری کرنے کی عادت کا تسلسل ہیں۔''

(اجرا، کراچی، پاکستان، شمارہ20، اکتوبر تا دسمبر 2014، ص، 12)

اس طرح کی عبارت وہی لکھ سکتا ہے، جس میں قوت ہوگی۔احسن سلیم نے قلم کا سودا نہیں کیا۔انھوں نے وہ لکھا، لکھا جانا چاہیے تھا۔احسن سلیم کا یہ شعر 'ہوا جو قتل وہ صدیوں کا نور تھا شاید، کنار آب، میں نوحوں کی چاپ سنتا ہوں' یا ان جیسے اشعار، ان کے بلند حوصلے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔احسن سلیم زندگی جینے کے نئے نئے امکانات تلاشتے تھے۔ایک طرف قتل تو دوسری طرف کنار آب اور نوحوں کی چاپ، اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ وہ حالات سے لڑنے میں یقین رکھتے تھے اور ایسا اس لیے تھا، کیونکہ انھیں خود پر بھروسا تھا۔پچھلی دو دہائیوں میں عالمی سطح پر جو کچھ ہو رہا ہے، وہ یقیناً بہت خوفناک ہے۔ایسے میں کچھ لوگ وہ ہیں جو خاموشی پر یقین رکھتے ہیں، سب کچھ دیکھنے کے باوجود اظہار کرنے کی قوت نہیں رکھتے، اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو اظہار کی قوت رکھتے ہیں، اور اپنی بات مختلف پیرائے میں، کبھی نثر میں تو کبھی نظم کی صورت میں عام لوگوں تک پہنچاتے ہیں، ایسے ہی لوگوں میں احسن سلیم کا شمار ہوتا ہے۔ان کی ذاتی زندگی سے عام لوگوں کو سروکار نہیں ہونا چاہیے، ہمیں غور اس بات پر کرنا چاہیے کہ انھوں نے ایسا کون سا کام کیا ہے، جو سماج کے لیے اور ادب کے لیے موثر ثابت ہوا۔اس سے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہیے۔احسن سلیم کے ایسے بہت سے کام ہیں جو آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوں گے۔

احسن سلیم نے نثری نظم میں خوب طبع آزمائی کی، اور ان میں سے کچھ شاہکار بھی مانی جاتی ہیں۔سہ ماہی 'سمت' جو کہ اعجاز عبید کی ادارت میں نکلنے والا آن لائن رسالہ ہے۔اس رسالے میں 'یادِ رفتگاں' کے تحت احسن سلیم کی نظم 'وراثت' کو شائع کیا گیا ہے۔یہ نظم تقریباً بیس صفحات پر محیط ہے۔اس نظم کے کچھ حصے ملاحظہ ہوں:

آؤ ہم
اپنے بوسیدہ کپڑوں کی باسی خوشبو
سورج کے منھ پر الٹ دیں
اور ہرے بھرے جنگلوں سے
نئی خوشبو سمیٹ لائیں
تلخی کا ایک گھونٹ
کئی ہزار شیروں کو جنم دے سکتا ہے
آؤ ہم
بھوسے کے ڈھیر میں
شیروں کے بیج بودیں
ورنہ...
یہ ریشمی سانپ
تمھاری چھاتیاں پی جائیں گے
اور ہماری آگ کا دھڑکتا پھول
وقت سے پہلے یتیم ہو جائے گا

(رسالہ سمت۔شمارہ31جولائی تا دسمبر 2016 ص، 83-82)

احسن سلیم کی نظم کے ذکر بالا حصے پر غور کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کس طرح سے نئی نئی چیزوں کو نئے خیالات کو اپنے انداز میں قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ ایک طرف باسی خوشبو کو سورج کے منھ پر انڈیلنے کی بات کرتے ہیں تو دوسری طرف ہرے بھرے جنگلوں سے نئی خوشبو سمیٹ لانے کی بات۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ احسن سلیم زندگی کے خراب حصے کو اپنے سے دور کرنے اور نئی نئی چیزوں کی تلاش کر کے زندگی کو از سر نو خوش حال بنانے کی جدوجہد کرتے ہیں۔اس کے طریقے کیا ہو سکتے ہیں، اس کی تلاش از خود کرنی ہوگی۔لیکن احسن سلیم نے اشارہ ضرور کیا ہے۔دانا کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔احسن سلیم کی ایک اور مشہور نظم 'آسمانی جنون' ہے۔ اس نظم کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:

شاعری
ایک آسمانی جنون ہے
جڑواں گھروں کے درمیان
ایک پرانا مکالمہ دہرایا گیا
ہمارے خواب
آئندہ میں سفر کرنے کے قابل نہیں رہے
خیال کی لہروں کے ساتھ
ہمارا
ناتواں ارتکاز
گندے نالوں میں بہادیا گیا
دھول سے اٹے ہوئے
عام آدمی کے خواب
راستوں میں دھر لیے گئے
عدم آگہی کی چادر تان دی گئی
ہمارے کھیتوں میں
سربریدہ فصلوں کی پاسبانی کے لیے
بے لباس آنکھوں میں
ننگے خواب اتار دیے گئے

(اجرا، کراچی، پاکستان۔ جولائی تا ستمبر 2015، ص، 144)

بحیثیت مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ احسن سلیم نے نثری نظم کے فروغ میں غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔انھوں نے جو کچھ بھی تخلیق کیا، اسے اس طرح سے پذیرائی حاصل نہیں، جس کی وہ مستحق ہیں۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ احسن سلیم نے عدم توجہی برتی، ان کی کتابیں محدود دائرے ہی تک پہنچ سکیں۔دوسرے یہ کہ انھوں نے جب سے اجرا کی اشاعت شروع کی، اور چیزوں کی طرف اس طرح سے توجہ نہیں کی، جس طرح کرنا چاہیے تھا۔اس لیے بھی ان کی شخصیت بحیثیت تخلیق کار گمنامی کا شکار ہوگئی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا جائے۔تاکہ ادب میں ان کو وہ مقام مل سکے جس کے وہ مستحق ہیں۔

■

Dr. Shahnewaz Faiyaz H.No. 1262 Zubaida Building Near Aoliya Masjid Ghaibi Nagar, Bhiwandi, Thane - 421302 (MH)

جوگندر پال

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

ظہیر انور

یہ حوصلہ، یہ توفیق مجھ جیسے ناکارہ و نابکار کو کہاں کہ میں اردو زبان کے نہایت معتبر افسانہ نگار، دانشور، ایک مخصوص دلنشیں، قابل اعتماد لہجے کے Conversationalist، مفکر اور درد مند انسان جوگندر پال کے کمالات فن اور فکشن کے مختلف گوشوں پر کلام کروں لیکن آج مجھے اپنے بابا کی یاد بہت آ رہی ہے۔ ان کی یاد، ان کا مخصوص اور رواں لہجہ، علمیت سے بھرپور باتیں اور باتوں کے درمیان ان کا باطنی اضطراب اور کبھی کبھی ٹھہرے ٹھہرے انداز میں اپنی مخصوص آواز میں ہم کلام ہونے کے وہ بیش قیمتی لمحات، ان کی شفقت آمیز صحبت، میری تخلیق اور ذاتی زندگی کا ناگزیر حصہ ہیں۔ وہ اپنے بابا کو بھائیا جی کہا کرتے تھے اور میں انھیں بابا جی کہتا آیا ہوں، دل چاہ رہا ہے کہ بس انھیں یاد کرتا جاؤں کہ ان کو گزرے ہوئے آج کئی مہینے ہو گئے ہیں۔

ہمارے رشتے از خود قائم ہو گئے تھے، بنائے نہیں گئے تھے۔ وہ سارے یادگار لمحے، دہلی اور کلکتہ میں جوان کی لازوال صحبت میں گزرے، سرعت کے ساتھ میرے ذہن کے پردے پر گزرتے جا رہے ہیں۔ کاش کوئی لمحہ پھر سے لوٹ آئے، کاش وہ پھر سے ایک بار لوٹ آئیں، اُن یادگار لمحوں میں، میں نے انھیں نہ صرف علم و فن، فکشن، تنقید پر گفتگو کرتے ہوئے سنا ہے بلکہ انسانی رشتے اور ذاتی زندگی پر نہایت سنجیدگی اور روانی سے کلام کرتے ہوئے بھی پایا ہے اور لوگوں کو ان کی بے مثال شخصیت کے آبشار میں شرابور ہوتے دیکھا ہے۔ ان سے ملاقات کے بعد ہم سب کس قدر پرسکون ہوتے جیسے کہ کوئی جہاں مل گیا ہو۔ ان کی زبان سے نکلے ہوئے بیشتر جملے ستاروں کی طرح زمین پر تادیر چمکتے رہے۔ ان کی فکر، ان کی روشن خیالی اور علمی بحثیں، بلکہ خاص طور پر فکشن کی تفہیم پر ان کی غیر معمولی گرفت لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتی۔ ان کی باتوں میں اس قدر خلوص اور تفہیم و تعبیر میں استدلال کی ایسی کیفیت تھی کہ اس کی گونج دیر تک ذہنوں میں رہتی۔ میرا تو سارا وجود ہی ان کی محبت، درد مندی اور افسانوی جہت کی خوشبو میں رچا بسا رہتا۔ یہ انھیں کی گداز، فکری سطح پر فعال شخصیت اور محبت سے بھرے دل کا اثر ہے کہ میرے اندر بھی کوئی لہر زندگی اور ادب کی جاگتی رہی۔ جی: یہ باتیں جوگندر پال یعنی میرے بابا کے سلسلے میں بے ساختہ بلکہ 'بے اصطلاح' نکل رہی ہیں۔ ان کے افسانوں، ان کے ناول، ان کے مضامین، ان کا تخلیقی سرچشمہ، ان کا شعور نقد اور افسانوں کے رموز اور افہام و تفہیم کے طریقہ کار نے ہمیشہ مجھے حیران کیا۔ وہ اپنی طبعی عمر کو پہنچ کر ہم سب سے جدا ہوئے تاہم اس گھنے سایہ دار درخت کی کمی تو محسوس ہوتی ہے۔ انھوں نے خود ہی برسوں پہلے اپنا 'خود وفاتیہ' لکھ دیا تھا، اور تخلیقی سطح پر اس بات کا نہایت باشعور لہجے میں اقرار بھی کر لیا تھا کہ وہ نصف صدی سے زیادہ وہ کہانیاں لکھ رہے ہیں اور ان کہانیوں کو لکھتے ہوئے اپنے سوا ساری کائنات کو جیتے رہے ہیں۔ اور یہ کہ مرے مرے جو، ان پر بیتی، وہ بیت گئی۔ یہی نہیں بلکہ تقسیم ملک کے بعد جو زمین ان کے قدموں سے پھسل گئی تھی اس کی روداد لکھتے لکھتے انھوں نے انسانی قتل و غارت گری اور ظلم و جور کے پہلو بہ پہلو انسانی بے بسی اور درد مندی کا جو نقشہ کھینچا، اپنے افسانوں اور ناولوں میں، جس قدر محبت اور درد مندی سے کہانیوں کی شکل میں جو لازوال تحفہ پوری دنیا کے لوگوں کو دیا اس کا احساس ہر قاری کو رہے گا۔

ایسے شخص اور فکشن کے اس قدر معتبر نام کے بارے میں، میں کیا لکھ سکتا ہوں اور بعد از مرگ لکھوں بھی تو کیا لکھوں۔ وہ تو اپنی Obituary لکھ چکے، لیکن میرے ذہن و دل میں وہ آج بھی اسی طرح زندہ اور روشن ہیں جس طرح کوئی دمکتا ہوا ستارہ جس کی روشنی میں میرے ساتھ اور بھی بہت سے لوگ بھیگ رہے ہیں اور جس کی روشنی کبھی ماند نہیں پڑتی، وہ جس طرح اپنی کہانیوں، اپنے ناولوں اور اپنے مختصر افسانوں کے صفحوں سے اتر کر قاری کے ذہن میں اپنا سفر جاری رکھتے ہیں یا جس طرح ان کے خلق کیے ہوئے کردار پڑھنے والوں کی سانسوں میں گھل کر اپنی تکمیل کرتے ہیں بالکل اسی طرح پوری شفقت، درد مندی اور انکساری کے ان کا سفر میرے اندر جاری ہے۔ ان کی محبت سے بھرا چہرہ، ان کی آواز، ان کا دلنشیں لہجہ، نرمی اور اپنائیت سے لبریز ان کی Benign ہنسی، ان کے وہ گہرے ارتکاز سے ابھرتے ہوئے اور ایک طویل عمر کے تجربے سے بکھرے ہوئے جملے جو Quoteable

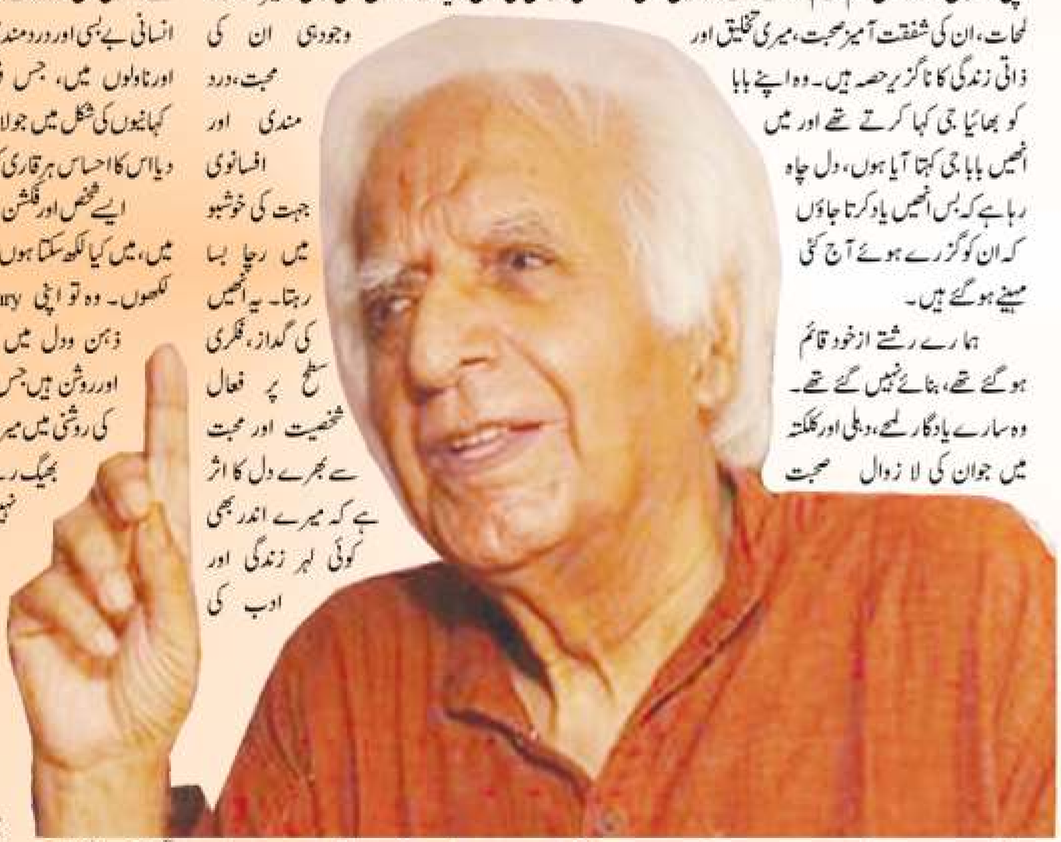

Quotes کا حکم رکھتے ہوں اور مختلف لوگوں کو مختلف صورتوں میں یاد رہ جاتے، ہمارے لیے اس زندگی کا ایک لازوال تحفہ ہیں۔ جانے کون سی مبارک گھڑی تھی جب میری ملاقات میرے فرشتہ صفت بابا سے ہوئی۔ سرتاپا سادگی، نہ موقع شناسی نہ اقربا پروری، نہ خود پرستی نہ خود پروری، نہ خود تشہیری بس ایک گوشہ نشینی، اپنی اس گوشہ نشینی میں اپنی گفتگو، اپنی محبت اور خلوص سے دل جیتا اور اپنے فن سے داد حاصل کی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں ان کے گھر مندا کنی انکلیو گیا تھا۔ دہلی میں وہ چمکتا سا دن تھا۔ اپنے دوست خالد سہیل، جاوید دانش اور ارتضیٰ کریم کے ساتھ ان کے گھر گیا تھا۔ 204 مندا کنی انکلیو، ایک مستقل پتے کی طرح آج بھی ہمارے ذہن میں نقش ہے۔ یہ چار دیواری کا گھر نہیں بلکہ محبت اور شفقت کا ایسا مندر نظر آیا جس کے اندر داخل ہوتے ہی کوئی شے روشن ہو جاتی اور جہاں بابا تو بابا، ماں جی بھی ہمارے دلوں کو چھولیا کرتیں۔ ان کی دبنگ آواز گونجی:

اوئے کرشنا ظہیر آیا ہے کلکتہ سے، ایک اچھا سا Lunch بناؤ،

اور پھر

بھائی اکیلے کیوں آئے ہو؟ غزالہ کو ساتھ لانا تھا، دو ایک دن ٹھہرنا تھا، خیر چلو اوپر کمرے میں، وہیں بات کرتے ہیں۔

گھر کی پہلی منزل پر ان کا وہ کمرہ یا Study Room جو آج بھی میرے ذہن میں آباد ہے اور رہ رہ کر ذہن کے دریچوں سے جھانکتا ہے۔ بعد میں وہ گراؤنڈ فلور پر ہی اپنی کتابوں کے ساتھ آ گئے تھے جہاں دو تین سال پہلے شائد میں نے ان سے آخری انٹرویو لیا تھا اور جو میرے پاس کہیں محفوظ ہے۔ اسی دو کمروں میں میں نے ان کے ساتھ بہت سا وقت گزارا، انھوں نے بہت ساری کتابیں مجھے اور میرے دوستوں کے لیے دیں، میرے ذاتی مسائل میں دلچسپی لی، میرے بچوں کے سلسلے میں رہبری کی۔ گنگا جمنی تہذیب کی اس آخری نشانی نے ہمارے اندر ادب اور زندگی کی للک بڑھادی تھی۔ پہلی بار جب اپنے دستخط کے ساتھ انھوں نے ہمیں اور ہمارے دوستوں کو اپنی کتاب پیش کی تو لگا کہ ہمیں سب سے قیمتی کتاب ہاتھ لگ گئی ہے اور پھر ہم اور خالد سہیل نے بس کے سفر میں ہی 'کھو دو بابا کا مقبرہ' پڑھ لیا اور دیر تک خاموش رہے، پھر حیران ہوئے اور آخر آخر کتنا خوش ہوئے تھے، اس مختصر سے کمرے کو کوشش کر کے بھی بھول نہیں پاتا ہوں جہاں ان کی شفقت، ان کی بیکراں کشادگی، ان کی فکری جہت، ان کے تاریخی، فلسفیانہ اور تنقیدی شعور سے مسلسل ہمارا رابطہ رہا ہے اور ہمارے دلوں اور ذہنوں میں کیسے کیسے چراغ جل اٹھے تھے۔ ہر شے میں، ہر لفظ میں ان کے حرکات و سکنات میں، ان کی نظروں اور آوازوں میں ایک نوع کی داخلی خوبصورتی تھی، ایک لازوال اور گہرا حسن جسے ہم سب نے اپنے اپنے طور پر محسوس کیا اور اس Thinking young man پر کس قدر پیار آیا تھا۔ اس دن وہ کس قدر تپاک سے ملے تھے، کتنی گرم جوشی تھی ان کی باتوں میں، انتظار حسین سے لے کر محمد علی صدیقی تک اور فاروقی سے لے کر وزیر آغا تک، جانے بحثوں میں ہم کہاں سے کہاں گزر گئے، وہ بغل گیر ہوئے تو ہمیں تکملیت کا احساس ہوا، ارتضیٰ کریم نے اس پہلے دن کی ملاقات کے بعد کہا تھا کہ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، ان سے جو ملے لے لینا چاہیے۔ حقیقتاً ان سے ہر ملاقات Learning Process اور انسانی ہمدردی کے نئے مقامات تھے۔ اس کے بعد تو جب جب ہم ملے، کہانی کار اور کہانی کی پوری کائنات سے رشتہ جڑتا گیا۔ ہر ملاقات کے بعد جیسے زندگی کو نئی سمت ملی، کوئی نئی روشنی، اس دن سے جو رشتہ آپ ہی آپ قائم ہوا وہ آج تک ہمارے لیے جینے کا حوصلہ فراہم کرتا ہے۔ اتنا کچھ ہونے کے بعد اور ایک طویل عرصہ گزرنے کے بعد مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسا بے نام سا رشتہ ہے جہاں ان کی ذات، ان کی فکر، ان کی کہانیوں اور ناولوں کے کردار کی ضوفشانیوں اور ترویج و ارتقا نے کس طرح مجھے اسیر کیا ہے۔

یوں تو کتنے ہی لوگ بشمول شاعر و ادیب سے زندگی میں ملاقات رہی، کتنے ہی مقامی، قومی اور بین الاقوامی شخصیات اور Intellectuals سے سامنا ہوا لیکن پال صاحب کی آنکھوں میں جو شفقت اپنے عزیزوں کے لیے دیکھی، ان کی گفتگو اور مباحثے میں جو گہرائی اور اپنائیت تھی وہ فی زمانہ ناپید ہوتی جارہی ہے۔ ان کی شخصیت میں ایک طرح کی مقناطیسی قوت تھی جو ان سے ملنے والوں کے دلوں میں گھر کر لیا کرتی تھی۔ افسانے اور ناولوں میں جو کردار اور کردار کے ہمراہ Situations کی آبادکاری کا جو کام جوگندر پال نے جس قدر شدت، سرعت اور تعقل کے ساتھ انجام دیا، اسی طرح ان کی شخصیت کا سحر میرے اور مجھ جیسے جانے کتنے لوگوں کے دلوں میں رچ بس گیا۔ میں تو ان کے حصار محبت سے کبھی نہ نکل سکا، ان کے خطوط ادبی کے ساتھ ساتھ اس قدر ذاتی ہوا کرتے اور ہماری خبر نہ ملنے پر وہ ایسی بے چینی کا اظہار کرتے کہ بس پوچھیے مت، دھیرے دھیرے وہ میرے وجود اور میری روح کا ناگزیر حصہ بن گئے۔ ان کے اندر ایک حساس دل تھا جو آن کی آن میں اپنا سارا کچھ اپنے عزیزوں پر وار دینے کے درپے ہوتا، جیسے کہ سب اسی کا ہو، ان کی پوری زندگی، جس کو ان کے کچھ برگزیدہ ہم عصروں اور بعد کے آنے والوں کو خبر بھی نہ ہوئی اور اگر ہوئی بھی تو انھوں نے خاص مقصد کے تحت درخور اعتنا نہ سمجھا، میرے لیے اور میرے جیسے بہت سے لوگوں کے لیے ایک مثالی زندگی تھی۔ انھیں مرتے تو دیکھا نہیں، ان کے آخری لمحات کی مجھے خبر بھی نہ ہوئی، میں زندگی کے اُدھیڑ بن میں ان سے کہیں کچھ دور جا پڑا تھا، پھر بھی یہ میرے لیے اس قدر اتنا اہم نہیں جتنی کہ ان کی زندگی جو انھوں نے ہمارے سامنے گزاری، محفلوں میں تقریر کی، گفتگو کیا، وہی تو اصل ہے۔ انھوں نے اپنی گزاری ہوئی زندگی میں جو کچھ دیا وہی تو حقیقت ہے۔ موت تو پل دو پل کا درد انگیز لمحہ ہے لیکن زندگی تو ہمارا مشترکہ اثاثہ ہے، ان کی صحبت میں گزرے ہوئے دن اور راتیں ہمارے اپنے ہیں، وہ لازوال صحبت تو ہمارے دلوں میں تادم آخر مہکتی رہے گی۔ بقول شاعر:

بعد از وفات تربت ما در زمیں مجو
در سینہ ہائے مردم عارف مزار ماست

کیسی سچی اور اچھی بات ہے، ہمارے سینے میں ان کی یاد ہی اصل حقیقت ہے۔

میں نے جب بھی دلی شہر کی سڑکوں پر قدم رکھا، پہلا خیال بابا یعنی جوگندر پال کا ہی آیا۔ انسان دوستی کی ایسی مثال اس سفاک شہر میں میں نے کم کم دیکھی ہے۔ ایسا کبھی شاید نہ ہوا ہو کہ پچھلے بیس پچیس سال میں دلی گیا اور ان کے گھر پر حاضری نہ دی ہو۔ بابا اور ماں مجھے دونوں عزیز رکھتے، مجھ سے ہوتے ہوئے انھوں نے میری بیوی بچوں کے دلوں کو بھی چھو لیا تھا۔ کئی سال پہلے منالی کے چیر کار میں ان کا فون آیا، بیوی کی خبر بھی پوچھی اور پہاڑوں کی ان بلندیوں پر ہم دونوں کو یوں محسوس ہوا کہ ان پہاڑوں کی بلندی سے پرے بھی کوئی ہمیں دعائیں دے رہا ہے۔ یوں لگا کہ ان کا قد پہاڑوں کی بلندیوں سے بھی مزید بلند ہے اور پہاڑوں کی چوٹیاں معمولی نظر آرہی ہیں۔ اسی طرح ان کے گھر کے دروازے بھی سبھوں کے لیے ہمیشہ کھلے رہتے۔ وہ اپنے مال و متاع، اپنی پونجی، اپنی کتابیں یوں رہ رہ کر دوسروں پر لٹاتے اور چیزیں دے دے کر یوں خوش رہا کرتے کہ مجھے اکثر لگتا کہ بابا جیسے بے مثال فنکار اور نہایت دلنشیں شخص دنیا سے دھیرے دھیرے اٹھتے جا رہے ہیں۔ Last of the vanishing breed ----- مجھے انھوں

نے بہت سے مختصر اور طویل خطوط لکھے، کبھی میری خیریت پوچھنے کے لیے، کبھی عمر کی اس سرحد پر جہاں تھے اپنا موقف سمجھانے کے لیے تاکہ میں ان کی فکر کے تازہ منظر نامے اور افسانے کی تفہیم سے واقف رہوں، کبھی میری کسی تحریر پر کسی پوسٹ کارڈ پر اپنی رائے لکھ دیتے۔ میری معمولی تحریروں پر بھی انھوں نے مجھے ہمیشہ یہ حوصلہ دیا کہ مسلسل فکر اور لکھتے رہنے کی عادت کبھی کبھی کوئی اہم چیز کی تخلیق میں معاون و مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اکثر اپنی گفتگو میں یہ مشورہ دیتے کہ جب تک موضوع ذاتی واردات کی سطح پر محسوس نہ ہو تو پھر لکھنے کا جواز نہیں ہوتا۔ کہانی کی طرح وہ تحریر پستی نہیں ہے۔ مسلسل مطالعہ تحریر اور اظہار خیال کی طرف اکساتا ہے، البذا پڑھتے رہنا کس قدر ضروری ہے۔ بنگال کے افسانہ نگاروں پر ان کے ساتھ اکثر تبادلہ خیال ہوا۔ میں ظفر اوگانوی، انیس رفیع، فیروز عابد، سجاد نظر، صدیق عالم، ف س اعجاز اور دوسرے افسانہ نگاروں کے دفاع میں اپنی بات رکھتا تو وہ سراہتے، خاموشی سے، پلک جھپکا جھپکا کر سنتے، مختلف اور مخالف خطوط پر بحث کو پوری مستعدی سے سنتے اور پھر نہایت دلنشیں انداز میں کہتے کہ اچھا لکھتے ہیں لیکن پوری کی پوری کہانی اپنے سیاق سے ابھر کر قاری کے ذہن میں اپنا سفر جاری نہ رکھے تو بات بنتی نہیں۔ مختصر کہانیوں کے حوالے سے بھی یہ کہا کرتے کہ وہ اپنے اندر ایک نوع کی ایسی کشادگی اور وسعت رکھتی ہیں جو لفظوں کے زرخیز استعمال کے باوصف اس طرح بھرپور ہوتی ہیں کہ کہانی پڑھنے والوں کے ذہن میں اپنا سفر مکمل کرتی ہیں۔ ان کی ایک منی کہانی ایک زمانے سے بڑی مشہور ہوئی تھی:

آج بھی میرے ساتھ وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا

آج بھی میرے ساتھ کچھ نہیں ہوا

جاپانی ہائیکو کی طرح یہ منی کہانی اپنی الگ شناخت رکھتی ہے۔ 'رحمٰن بابو' میں ایسی بے شمار کہانیاں ہیں جو اپنے اختصار کے باوجود اپنی تہہ داری، وسعت اور تخلیقیت میں اس قدر بھرپور ہیں کہ از خود ایک بڑی کہانی کا جواز رکھتی ہیں۔ مذکورہ بالا کہانی پر 'فن کار' کے نام سے میں نے ایک مختصر ڈراما لکھا جو پہلے پاکستان میں شائع ہوا اور پھر ذرا سی تبدیلی کے ساتھ "انشاء" کے مختصر تخلیقات نمبر میں بھی شائع ہوا۔ شافع قدوائی نے لکھا کہ اس ڈرامے میں اختصار کے باوجود Meta Play یا Meta Story کا احساس قائم رہتا ہے۔ اصل میں کہانی کے اس ڈرامائی Adaptation کا یہ حسن نہیں ہے بلکہ جوگندر پال کی کہانی میں موجود تہہ داری کا اثبات ہے۔ ان کے افسانوں کا فکری التباس، ان کی زرخیز، جاندار اور Unique زبان اور ان کے فنی برتاؤ نے ان کے افسانوں اور ناولوں کو ارفع مقام عطا کیا ہے۔ جتنے بڑے وہ افسانہ نگار/ فنکار تھے اس سے کہیں بڑے وہ انسان تھے جو فی زمانہ بس خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ ان کے بڑے پن کی ایک مثال آج بھی یاد کرکے میری آنکھیں بھر جاتی ہیں۔ وہ کلکتہ کی نیشنل لائبریری میں ایک سیمینار میں شریک ہونے کے لیے آئے تھے اور یہاں آ کر انھوں نے میری عیادت کو مقدم جانا۔ ان دنوں میں دل کے عارضے میں مبتلا تھا۔ انھوں نے مجھے بے حد حوصلہ دیا اور اپنی جوانی میں اس طرح کے عارضے کا ذکر کیا۔ میں خود سے کہہ اٹھتا ہوں کہ کبھی نہ کہنا بابا گزر گئے، وہ تو اپنا سب کچھ تج کر، اپنی کہانی، اپنے ناول اور اپنا سارا سرمایہ ہمیں سونپ کر صرف آنکھوں سے اوجھل ہوگئے ہیں۔ زندگی سے شدید محبت کرنے والے جو بھی ہیں، وہ سبھی کے ہوگئے۔ اپنی کہانیوں، اپنے ناولوں اور اپنے کرداروں کے عقب سے نکل کر تمام تر اختصار تہہ داری اور طوالت کے ساتھ ہماری زندگی اور ہماری سانسوں میں گھل مل گئے ہیں۔

آج جب وہ نہیں ہیں تو کتنی یادیں، کتنی کہانیاں، ان کے ناول کے اہم مقامات، ناول کے کردار اور کیسی کیسی فلسفیانہ باتیں میرا پیچھا کر رہی ہیں۔ وہ دن آج بھی یاد ہے جب وہ ہماری کتاب 'ایک عرض تمنا' کی رسم اجرا کے سلسلے میں کلکتہ تشریف لائے تھے اور اپنی نہایت بامعنی اور خوبصورت تقریر سے لوگوں کے دلوں میں ایک عرصے تک آباد ہوگئے تھے۔ ان کی تقریر کو ریکارڈ نہیں کیا گیا تھا جس کا افسوس مجھے ہمیشہ رہے گا، تاہم کلکتہ کے سامعین میں سے اکثر لوگوں کے ذہنوں میں ان کے مختلف جملے یاد رہ گئے تھے اور وہ بڑے دنوں تک ان جملوں کو اس طرح دہرایا کرتے کہ جیسے زندگی کی شاہراہ پر ان کے لیے جینے کا سامان فراہم ہوگیا ہو۔ ان کے افسانے کی تعریف میں کسی نے زمین و آسمان کے قلابے ملائے تو گہرے اطمینان کے ساتھ کہا کہ جب کوئی میری اس طرح تعریف یا توصیف کرتا ہے تو یوں لگتا ہے کہ مجھے دھیرے دھیرے قتل کیا جا رہا ہے، نقیب جلسہ شکیل احمد نے انھیں دعوت سخن دیتے ہوئے ان کی پیرانہ سالی کا ذکر کیا تو کہا کہ اتنے دنوں بعد تو چاندنی اُگی ہے۔ اسی طرح بقول راوی تخلیق کے کرب اور تخلیق کار کے کرب کا اس قدر جامع الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا کہ لوگوں نے جانا کہ گویا انھی کے دل کی بات ہے۔ ساتھ ہی ساتھ فن کار کی تذلیل اور رسوا ہونے کا بھی خوبصورت تذکرہ کیا کہ جس کے بغیر فنکار کی تکمیل نہیں ہوتی اور نہ اس کے فن پر وہ نکھار آتا ہے۔ انھوں نے میری تخلیق کے مطالق بھی کئی اہم نکات پیش کیے۔ ان کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ذہنوں میں دیر تک دمکتے رہے اور سامعین کو منفرد لطف سے دوچار کیا۔ جب کلکتہ سے جانے لگے تو ہمارے اسکول کے غریب بچوں کے بارے میں استفسار کیا اور جب انھیں پتہ چلا کہ بیشتر بچے غریبی کی ریکھا سے نیچے کی زندگی گزارتے ہیں اور مشکل سے تعلیم مکمل کرتے ہیں تو دہلی اردو اکادمی کے ملے انعام سے دس ہزار کی رقم پریسیڈنسی مسلم ہائی اسکول کو بطور عطیہ دیا تاکہ اس رقم سے کم از کم ایک بچے کی تعلیم مکمل ہو جو محنتی ہو اور جس کا ایک پرچہ اردو ہو۔ فیصلے کا حق انھوں نے راقم الحروف کو دیا جو اس وقت مدرس اعلیٰ کے عہدے پر تھا۔ اس پیسے سے فیض اٹھا کر آج بھی طالب علم، علم کی روشنی حاصل کر رہے ہیں۔

میری کتابوں پر اکثر کچھ ایسی رائے دیتے کہ پھر تازہ دم ہو کر مجھے لکھنے پڑھنے کا حوصلہ ملتا رہا۔ انھوں نے جانے کتنے خطوط مجھے لکھے۔ انھیں میری فکر تھی۔ آخر آخر 'بلیک سنڈے' (ڈراموں کا مجموعہ) کو پڑھ کر ایک پوسٹ کارڈ روانہ کیا تھا جو کسی صورت کتابوں کے درمیان سے میرے ہاتھ لگا ہے۔ انھوں نے بڑی شفقت سے خط لکھا تھا:

پیارے ظہیر انور؛ خوش رہو

اب پھر کارڈ ہاتھ لگا ہے اور تاخیر کے ڈر سے اسی پر لکھنے لگا ہوں۔ ٹیلی فون پر یہ معلوم کرکے افسوس ہوا کہ میری پہلی چٹھی ڈاک کی نذر ہوگئی ہے۔ اس میں بھی 'بلیک سنڈے' پر اپنی رائے لکھ بھیجی تھی: تمھارے یہ ڈرامے سے اس لیے بھی خاص طور پر مسرت ہوئی کہ تم نے اسٹیج سٹیگ اور مکالموں میں زبان و بیان کے انتخاب میں یہ امر برابر ملحوظ رکھا ہے کہ اسٹیج کی چست پیشکش پر حرف نہ آئے۔ ہمارے بیشتر ڈرامے اکثر کتابی مطالعے میں کھو جاتے ہیں۔ موضوعات کے برتاؤ میں تم نے کچھ اس مانند عوام کی بالواسطہ اسٹیج ایجوکیشن کا اہتمام روا رکھا ہے کہ کہانی بھی جوں کی توں دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ تمھارے یہاں انسانی قدریں کہانی میں عین رچی بسی رہتی ہیں جس کے باعث تماشائی انجانے میں اپنے ضمیر کے اور قریب سرک کر خود کو سبک محسوس کرنے لگتا ہے۔ میری دعا ہے کہ تمھاری یہ ڈرامائی دلچسپیاں اسی طرح تمھاری نت نئی دریافتوں کا اسباب کرتی رہیں۔

غزالہ اور بچوں کو بھی ہماری دعائیں دو۔

اس چٹھی کے پہنچنے کی اطلاع ضرور دینا تاکہ اطمینان ہوجائے۔

محبت!

تمھارا، بابا۔

ایسی ہی ہوتی ہیں فقید المثال شخصیتیں، جن کی دعائیں ہمارے ساتھ زندگی کے سفر میں شریک رہتی ہیں۔ علمیت، تاریخی مطالعات، نفسیاتی اور فلسفیانہ فضا سے متصف ایسے فنکار کی زبان و بیان بھی منفرد ہوتی ہے اور تخلیق کی ارفع سطح پر متمکن ہوتی ہیں لیکن ان کی شفقتیں نئی نسل کے لیے ہمیشہ جاری رہا کرتی ہیں۔ یہ ہمارے لیے کسی سرمایہ سے کم نہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ سب انھی کے اور ان جیسے نابغۂ روزگار کی دعاؤں اور Inspirations کا طفیل ہے۔ میں اکثر ان کی تخلیقی انفرادیت، ان کی زبان اور منفرد اسلوب، ان کی کہانی کے تار پود، ان کے گہرے مطالعے اور ان کی انگریزی تحریروں کا ذکر کرتا ہوں لیکن مجھے یہ یقین ہے کہ وہ اپنے موضوع سے بے حد مجبور ہو کر کہانیوں کے تخلیقی سفر میں روانہ ہوئے تھے، پھر تو ان کی واردات ان کی اپنی نہیں رہتی، کہانی کے برتاؤ میں جو حسن ہوتا ہے وہ قاری سے پوشیدہ نہیں رہتا۔ ادب اور فکشن ان کے لیے اپنی پوری توانائی کے ساتھ وارد ہوتے۔ انھوں نے کہیں یہ کہا ہے:

" I become what i percieve"

یعنی ادب جو وہ تخلیق کرتے، جس کردار کو بھی آنکتے، اسی میں ڈھل جاتے، راوی اور کردار آپس میں گلے بھی ملتے اور اپنی دوری بنائے رکھتے، پورے منظر نامے میں ان کی شمولیت اتنی ہی ہوتی جتنی کہانی کے ٹریٹ منٹ کا تقاضا ہوتا۔ وہی ان کی اصلی شناخت بن جاتی۔ خواب رو کے دیوانے مولوی صاحب، کھودو بابا، پار پرے کی دنیا، پورٹ بلیر کی زندگی اور اس کے مختلف کردار، تمنا کا دوسرا قدم کا کستوری لعل، عقب'' کا مرکزی کردار اور اس کا احتساب 'مارکٹ ایکو نومی' کا لالہ سادھورام یا پھر 'نادید' میں اندھوں کی دنیا، یہ سارا کچھ جس قدر سماجی حقیقت پسندی سے عبارت ہے، اسی قدر معنی کی تکثیریت کا متقاضی ہے۔ ایسی بہت سی کہانیاں جو بابا کے قلم سے نکلیں، سماج کی تصویر کے ساتھ ساتھ ثقافتی بوقلمونی، زمانے کی صارفیت اور تہذیبی حوالے کی بھی تصویریں ہیں۔ ان کا خالق اپنے کردار میں بہ حیثیت راوی پوشیدہ طور پر نظر آتا ہے اور جو وہ خلق کرتا ہے وہی بن جاتا ہے۔ انھوں نے سچ ہی کہا تھا کہ ایک ادیب کی حیثیت سے میں بے شناخت ہوں۔ ان کی اصل شناخت تو ان کہانیوں اور ناولوں میں تلاشی جاسکتی ہیں۔ وہ افسانے اور ناول کی ایک ایسی محسوساتی سطح پر خود کو ظاہر کرتے ہیں کہ معنی خیزی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ بیانیہ میں جہاں جس عنصر کی جتنی ضرورت ہوتی ہے، بیان کنندہ اسی قدر

بیان کرتا جاتا ہے۔ ناول 'پار پرے' کو ایک عرصے تک انھوں نے اپنے اندر سموئے رکھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ یہ کہانی میرے اندر کسی پھانس کی طرح اگی پڑی ہے، جب تک میں اسے لکھ نہ لوں، موت بھی مجھ کو نہیں آسکتی۔

ہندو پاک کے افسانوی منظر نامے پر ان کی گہری نظر ہوتی۔ اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں کی تخلیقات کو بھی پورے ارتکاز کے ساتھ پڑھا کرتے۔ پبلشرز ان سے اچھی اور اہم کہانیوں کے بارے میں استفسار کرتے اور ان کے انتخاب پر بھروسہ کرتے ہوئے اس کے انگریزی ترجمے بھی شائع کرتے۔ نئے افسانہ نگاروں کی تخلیقات پر گفتگو ہوتی تو ان کے حسن و قبح پر کھل کر تبصرہ کرتے۔ اپنے معاصرین پر بھی بے لاگ اظہار خیال کرتے۔ وہ انتظار حسین، قرۃالعین حیدر، وزیر آغا، محمد علوی، شمس الرحمٰن فاروقی اور دیگر لوگوں کے ادب اور تنقید پر بے جھجک اپنی رائے کا اظہار کرتے لیکن کہیں بھی کسی طرح کی نرگسیت کا شکار نہ ہوتے اور نہ ہی کبھی کسی طرح کا شکوہ لب پر لاتے۔ ان کا ذہن بدستور سفر کرتا، نئی باتیں سوچتا، نئی کہانیوں کی تڑپ محسوس کرتا۔ نئے لکھنے والوں اور نئی نسل کی نمائندہ خدمات کو سراہتا۔ صدیق عالم، ساجد رشید، سید محمد اشرف وغیرہ کی کہانیوں پر ان کی نظر رہتی، وہ زندگی میں پیچھے مڑ کر بھی دیکھتے، خاص طور پر جب اورنگ آباد کے زمانے کا ذکر کرتے تو ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک جاگ اٹھتی۔ شاید اورنگ آباد کے دوستوں نے انھیں بے حد پیار دیا تھا۔ ان کے بیان میں اورنگ آباد تو ستاروں سے سجا ایسا جہاں نظر آتا جس کی روشنی کبھی ماند نہ پڑتی۔ اس شہر کا ذکر آتے ہی ان کی آنکھوں میں بے شمار یادوں کے چراغ ٹمٹما اٹھتے۔ اسی طرح دلی میں بسنے والوں کی بے دلی سے ان کا گہرا تعارف تھا پر کبھی شکوہ نہ کیا۔ اگر چہ ان کی خدمات کا مزید اعتراف ہونا چاہیے تھا لیکن بباطن وہ ہمیشہ شاداں اور انتہائی contented رہے۔

مجھ جیسے نئے لوگوں کے لیے تو وہ Friend, philospher and guide تھے۔ ان کے یہاں ہر آنے والے کو یہ محسوس ہوتا کہ بس اسی کے آنے سے ان کی آنکھوں میں خوشیاں رقص کرتی ہیں، ان کے اندر محبت کا جذبہ ہی اتنا لامتناہی تھا کہ ہر انسان کے لیے ایک گوہر نایاب تھا۔ ابھی کچھ دن پہلے ڈاکٹر خالد سہیل کی ایک کتاب پر کچھ لکھتے ہوئے میں نے بابا کے مندرجہ ذیل جملے نقل کیے تھے:

After all these years of involvement in creative writing, i have come to believe formally that the relevance and survival of literature and of the literary artist depends primarly on his capacity to love and to suffer in fellowship,not on,as some writes appear to believe,patch work of clever and callous writing done in self-celebration".

یہ جو محبت اور دردمندی کے وفور کا ذکر ہے اور یہ جو ایک دوسرے کے دکھ سکھ جھیلنے کا تذکرہ ہے۔ یہ Capacity of Love اور To Suffer in fellowship کا مخصوص تصور ہے، وہ خود اس کی روشن مثال تھے۔ انھوں نے بلاوجہ نہیں کہا تھا کہ پورا کتھا نگر ان کے ذہن میں بسا ہوا ہے۔ ان کی ہمیشہ یہی خواہش رہی کہ یہ کتھا نگر ان کے ذہن سے نکل کر ان کے ''خارج میں آباد'' ہو جائے۔ ان کی کہانیوں میں بسا شہر ان کے کردار، ان کے موضوعات، کردار کی نفسیات کی آباد کاری کے ساتھ ساتھ ہمارے دل کے شہر میں ہمارے بابا رچ بس گئے ہیں اور اپنی بیکراں وسعتوں کی تدبیر کر رہے ہیں:

'ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے'

محمد علی صدیقی یاد آرہے ہیں، انھوں نے سچ ہی کہا تھا کہ لوگ اردو اس لیے بھی پڑھیں گے کہ جوگندر پال اس زبان میں لکھتا ہے۔ وہ خود بھی ایک افسانوی کردار سے کم نہیں، بقول شاعر:

وضع داری کی بہت قدر کرو ایسے لوگ
آج کل صرف کہانی میں نظر آتے ہیں

وہ آخری دم تک ہمارے ساتھ رہیں گے، اپنوں کے جانے سے تو خلا کا احساس ہوتا ہی ہے، گھڑی بھر کے لیے یہ دنیا ویران ہو جاتی ہے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اس ویرانی اور اندھیرے سے اپنوں کا مسکراتا چہرہ دھیرے دھیرے ابھرنے لگتا ہے، بابا، یعنی جوگندر پال تو اپنے عہد کی نہایت توانا آواز تھے۔ ان کے قدموں کے نشان کیسے مٹ سکتے ہیں، بس ان کے نہ رہنے کا زخم ہرا رہے گا:

"The Unkindest Cut of them all"

■

Zahir Anwar, 11, Ahiri Pukur 1st Lane
Kolkata - 700019 (West Bengal)
Mob.:9831260504

یاد رفتگاں

نگار عظیم

'یہ کس مقام پہ تنہائی سونپتے ہو مجھے' کا خالق

اقبال مہدی

2016 اردو دنیا کے لیے بہت خسارے کا سال رہا۔ اف! کیسی کیسی نامور، دانشور اور فعال ہستیاں ایک کے بعد ایک رخصت ہوتی چلی گئیں۔ انتظار حسین، زبیر رضوی، عابد سہیل، ندا فاضلی، جوگندر پال، شکیل الرحمٰن.. پوری ستاروں کی ایک کہکشاں آسمان کی وسعتوں میں کہیں کھوگئی۔ گزرنے اور بچھڑنے کا یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوا۔ چپکے سے اگلی نسل کی طرف منتقل ہوگیا۔ اپنے بزرگوں کے چلے جانے پر جس یتیمی کے احساس سے دوچار ہونا پڑا وہ ناقابل بیان ہے۔ بزرگوں کے بعد ہمعصروں کے جانے کی ابتدا اسی طرح اتنی تیزی سے ہوگی وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ پیغام آفاقی دیکھتے ہی دیکھتے ایک تارہ بن کر کہیں گم ہوگئے اور سب ہکا بکا رہ گئے اور اب اقبال مہدی.. زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے... اقبال مہدی کا پورا نام زبان پر آتے ہی خاموش متین، مسکین، ہم نوا، غم نوا، سنجیدگی کا پیکر ایک ایسا چہرہ ابھر کر سامنے آتا ہے جسے دیکھ کر احساس ہوتا کہ زمانے بھر کا درد وغم ان کے انگ انگ سے رس رہا ہو۔ معلوم نہیں ایسا کیوں تھا ان کی مسکراہٹ بھی سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہوتی تھی۔ میرے دل کی بے چینی ایک دن زبان بن گئی ''لگتا ہے صغریٰ آپا کے رعب دبدبے اور خوف نے آپ کو کھلنے ہی نہیں دیا۔'' ایک لمحہ کو چہرہ کھلا، مسکراہٹ نمودار ہوئی اور دوسرے ہی پل اندر کہیں وجود کی گہرائیوں میں اتر گئی۔ تپاک سے بولے جس پر پڑتی ہے بس وہی جان سکتا ہے یہ تو خیر ایک مذاق تھا لیکن یہ ضرور ہے کہ اقبال مہدی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بہت دیر سے پہچانے اور وہ بھی صغریٰ آپا کی بدولت۔

> **1999 میں پہلا افسانوی مجموعہ 'درد آتا ہے دبے پاؤں' منظر عام پر آتا ہے تو بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ اقبال مہدی کے چہرے پر درد کی لکیریں یوں ہی نظر نہیں آتی تھیں۔ اقبال مہدی قلمکاروں کے اس قبیل سے تعلق رکھتے ہیں جہاں قلمکار غم کھاتا ہے، درد سہتا ہے اور زہر پیتا ہے۔**

ادبی خانوادے کے دو بڑے نام صالحہ عابد حسین اور صغریٰ مہدی کے بعد تیسرا نام اقبال مہدی کا آتا ہے۔ 1999 میں پہلا افسانوی مجموعہ 'درد آتا ہے دبے پاؤں' منظر عام پر آتا ہے تو بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ اقبال مہدی کے چہرے پر درد کی لکیریں یوں ہی نظر نہیں آتی تھیں۔ اقبال مہدی قلمکاروں کے اس قبیل سے تعلق رکھتے ہیں جہاں قلمکار غم کھاتا ہے، درد سہتا ہے اور زہر پیتا ہے۔

بائیوکیمسٹری میں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد اپنے کام اور فیلڈ میں ماسٹر ہونے کے بعد کوئی کیونکر آرٹسٹ اور رائٹر بن جاتا ہے؟ ظاہر ہے سماجی سیاسی اقتصادی

ناہمواریاں جب ناقابل برداشت ہوجائیں اور دل پارہ پارہ ہونے لگے تو اظہار کے وسیلے تلاش کرنا انسان کی ضرورت بھی ہے، فطرت بھی اور کمزوری بھی۔ اقبال مہدی آرٹسٹ بھی بنے اور قلمکار بھی۔ انسانی رشتوں کی کچی ہوتی ٹوٹتی ڈور، بدلتی تہذیب میں اخلاقیات کا پیچھے چھوٹنا، مشترکہ خاندانوں کا بکھراؤ اور سیاست کا مکروہ چہرہ زمیندارانہ نظام کے اثرات جب حساس ذہن کو گرفت میں لے لیتے ہیں تو اقبال مہدی جیسے افسانہ نگار قلم اٹھانے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ گھر کے ملازم سے لے کر عالمی سیاست تک اقبال مہدی کی رسائی ہے۔ تقریباً تین دہائی کی قلیل مدت میں چار افسانوی مجموعے اردو دنیا کو دیے یہ معمولی بات نہیں۔ 'درد آتا ہے دبے پاؤں' کے بعد 'تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے' اور پھر 'تم نے جفا بھی کی تو صنم مدتوں کے بعد' ان کا آخری مجموعہ 'یہ کس مقام پر تنہائی سونپتے ہو مجھے' 2013 میں منظر عام پر آیا۔ یہ آخری مجموعہ ان کے پچھلے تینوں افسانوی مجموعوں سے ذرا منفرد اور زیادہ حساس ہے۔ دو اہم مشہور فکشن نگار قرۃ العین حیدر اور صغریٰ مہدی کے قلمی چہرے افسانوی انداز میں پیش کیے تو مجھے منٹو کے 'گنجے فرشتے' یاد آگئے۔ کیونکہ انھوں نے منٹو کی ہی طرح دونوں شخصیات کا بڑے سلیقے سے موٹذن کیا ہے۔ یہ دونوں مضمون اقبال مہدی کا فن عروج ہیں۔

اقبال مہدی کی افسانوی کائنات بھی بڑی منفرد ہے۔ افسانوی مجموعوں کے عنوانات ہی اس قدر فکر انگیز ہیں کہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اور پھر مجموعوں میں شامل افسانوں کے عنوان بھی توجہ طلب ہیں۔ یہاں ان کے افسانوں کے موضوعات پر یا کرداروں پر تبصرہ و تنقید کی گنجائش نہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ان جیسے لب و لہجے کی، زبان اور محاوروں کی نثر اب لکھنے والا کوئی نہیں... کوئی بھی نہیں۔ ایک طرف چاشنی ہے تو دوسری طرف تیر و طنز، شگفتگی اور احتجاج... موقع محل کے حساب سے وہ اپنی زبان دانی کے ہنر کو خوب کام میں لائے ہیں۔ افسانہ قرأت کرنے کا انداز بھی بڑا موثر منفرد اور واضح ہوتا تھا۔ اسی طرح انھوں نے رنگوں کے کھیل سے بھی جادو جگایا ہے۔ شاید بہت کم حضرات واقف ہوں گے کہ اقبال مہدی ایک اچھے آرٹسٹ بھی تھے ان کے آرٹ کے کئی بہترین نمونے ان کے گھر کی زینت ہیں۔ باغبانی کے انتہائی شوقین جب بھی گھر جایئے خالی اوقات میں ذہن کو تازہ کرنے کے لیے وہ کھرپی کا استعمال قلم کی ہی طرح کرتے تھے— اس کے نتائج بھی ان کے سرسبز و شاداب پیڑ پودوں اور پھولوں میں نظر آتے ہیں۔ یادیں باتیں اور ملاقات... آہ... بس انتظار ہی بنی رہی—

اقبال مہدی کا اردو ادب کے لیے جو بھی سرمایہ ہے وہ یقینا قیمتی سرمایے میں شامل ہوگا اور ان کے فن اور شخصیت پر مزید گفتگو ہوتی رہے گی۔ محروم تو ہم ہوئے ہیں نہ ہم نوالہ رہا نہ ہم پیالہ.. ہم ایک ایسے انسان سے محروم ہوئے ہیں جس کا لفظ مخاطب بھنّو اور بی بی ہوتا تھا.. زندگی میں قدم قدم پر ساتھ نبھانے والی ان کی شریک حیات 'شمع قبلہ' کو خدا ہمیشہ روشن رکھے کہ اب وہی ان کی دو پیاری بیٹیو ںکے مستقبل کا چراغ ہیں—

افسانوی مجموعوں کے عنوانات ہی اس قدر فکر انگیز ہیں کہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اور پھر مجموعوں میں شامل افسانوں کے عنوان بھی توجہ طلب ہیں۔ یہاں ان کے افسانوں کے موضوعات پر یا کرداروں پر تبصرہ و تنقید کی گنجائش نہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ان جیسے لب و لہجے کی، زبان اور محاوروں کی نثر اب لکھنے والا کوئی نہیں.. کوئی بھی نہیں۔ ایک طرف چاشنی ہے تو دوسری طرف تیر و طنز، شگفتگی اور احتجاج.. موقع محل کے حساب سے وہ اپنی زبان دانی کے ہنر کو خوب کام میں لائے ہیں۔

پیڑ پودوں پھولوں قدرت اور مخلوق سے محبت کرنے والے انسان بہت نرم دل حساس اور حددرجہ خوددار ہوتے ہیں۔ یہی نرم گفتاری اور خودداری اقبال مہدی کا خاصہ تھی، جو مجھ جیسے ان کے بہت سے دوستوں کو

ملاقاتیں تو بہت ہیں لیکن آخری دو ملاقاتیں ذہن کے پردے سے ہٹتی ہی نہیں۔ میرے غریب خانے پر میرے ساتھ فرش پر بیٹھ کر حلیم کھاتے ہوئے کچھ اس طرح مخاطب ہوئے "بالکل آپا کی طرح ڈانٹ کر کھلاتی ہیں آپ اور وہ بھی حلیم جو مجھے اور انھیں بہت پسند تھا" یہ کہہ کر وہ آبدیدہ ہوگئے تھے اور مجھے بھی کردیا تھا۔ ہم دونوں ہی اپنے آنسو پی گئے تھے یقیناً اس میں صغریٰ آپا کی یاد اور میرے لیے محبت شامل تھی۔ دوسری ملاقات اس کے تقریباً کچھ ماہ بعد اور انتقال سے ڈیڑھ دو سال قبل بٹلہ ہاؤس قبرستان کے پاس وہ بھی کچھ خریداری کررہے تھے اور میں بھی۔ لیکن ہم دونوں بیمار تھے۔ ہم حکیم کی طرح وہ مجھے ہدایتیں دے رہے تھے اور میں انھیں۔ اگلی ملاقات کا وعدہ کرکے ہم دونوں رخصت ہوئے تھے لیکن وہ اگلی یاد آتی رہے گی۔ وقت اپنی رفتار سے آگے بڑھے گا ادب اور تنقید اپنی رفتار سے۔ اقبال مہدی کا اردو ادب کے لیے جو بھی سرمایہ ہے وہ یقیناً قیمتی سرمایے میں شامل ہوگا اور ان کے فن اور شخصیت پر مزید گفتگو ہوتی رہے گی.. محروم تو ہم ہوئے ہیں نہ ہم نوالہ رہا نہ ہم پیالہ... ہم ایک ایسے انسان سے محروم ہوئے ہیں جس کا لفظ مخاطب بھنّو اور بی بی ہوتا تھا... زندگی میں قدم قدم پر ساتھ نبھانے والی ان کی شریک حیات 'شمع قبلہ' کو خدا ہمیشہ روشن رکھے کہ اب وہی ان کی دو پیاری بیٹیوں کے مستقبل کا چراغ ہیں— بھلے ہی وہ ان کو ایسے وقت تنہائی سونپ گئے جب انھیں ان کی بے حد ضرورت تھی—

■

Nigar Azeem H-3, Batla House, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025

ف س اعجاز

ایک عیسیٰ نفس خاتون کہانی کار
ساوتری گوسوامی

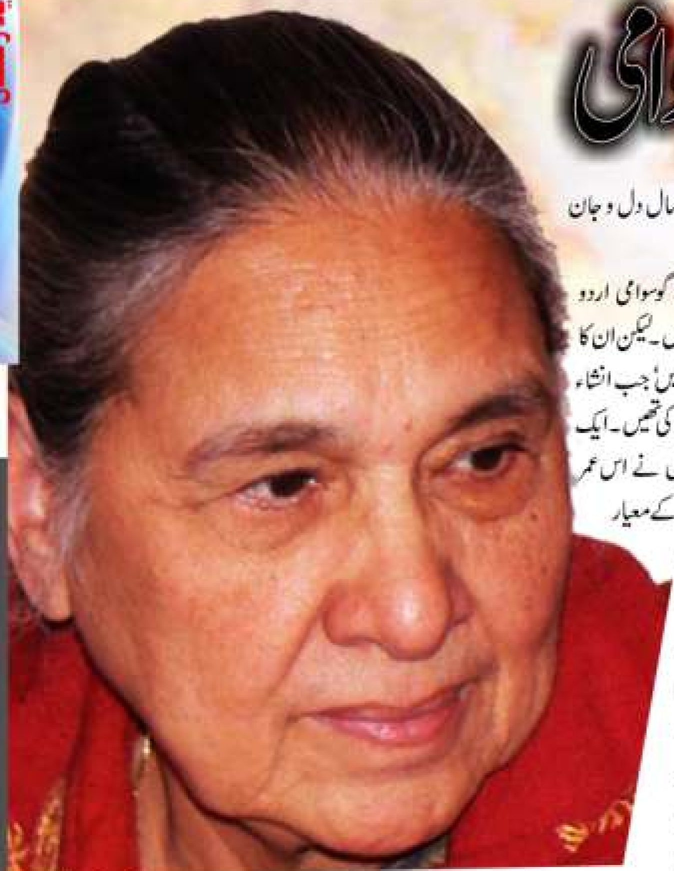

آسٹریلیا کے شہر پرتھ میں مقیم افسانہ نگار ساوتری گوسوامی کا جمعرات 25 اگست 2016 کو تقریباً 85 سال کی عمر میں نیم شب کے بعد ان کے گھر میں انتقال ہوگیا۔ یہ اطلاع مجھے ان کی بیٹی سمیتا چینگئی نے فون پر دی تھی۔ مرحومہ کے پسماندگان میں دو بیٹیاں سمیتا اور مدھو (مقیم آسٹریلیا) اور ایک بیٹا رَبی شنکر (مقیم امریکہ) ہیں۔ اُن کے شوہر ڈاکٹر آنند لال گوسوامی کا انتقال چند سال قبل پرتھ میں ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب بنگالی ہندو برہمن تھے لیکن طویل عرصے تک لکھنؤ اور گورکھپور میں مقیم رہنے کے سبب سے بہت اچھی اور صاف اردو بول لیتے تھے۔ غالباً

> ”بچپن سے ہی ساوتری گوسوامی اردو پڑھتی اور اسی زبان میں لکھتی تھیں۔ لیکن ان کا پہلا افسانہ طوفان کی بانہوں میں جب انشاء میں چھپا تب وہ تقریباً 65 سال کی تھیں۔“

1992 کے آس پاس وہ کھڑگپور بنگال میں انڈین ریلویز کے ڈائرکٹر جنرل ہیلتھ کے عہدے سے رٹائر ہوکر اپنے کنبہ سمیت کلکتہ منتقل ہوگئے تھے اور آسٹریلیا جانے سے قبل یہاں سالٹ لیک میں اپنا مکان تعمیر کر گئے تھے۔

جب ڈاکٹر صاحب کھڑگپور میں تھے بنگال کے معروف اردو شاعر عین رشید آئی پی ایس کی وہاں پوسٹنگ تھی۔ اور دونوں خاندانوں میں بڑا میل تھا۔

ساوتری گوسوامی کے والدین گجرانوالہ کے سکھوں میں سے تھے اور عیسائی ہوگئے تھے۔ ساوتری جی نے مہیلا کالج لکھنؤ سے انٹر پاس کیا۔ وہ 11 سال کی ہوئیں تو ان کی ماں روز لین بڈن کا انتقال ہوا۔ ہندوستان کا بٹوارہ ہوا تو سڑکوں پر انھوں نے قتل عام دیکھا۔ آئی ٹی کالج لکھنؤ میں داخلہ کرایا گیا تو انھوں نے وہاں جانے سے انکار کر دیا اور نرس بن کر تیرہ سال دل و جان سے مریضوں کی خدمت کی۔

بچپن سے ہی ساوتری گوسوامی اردو پڑھتی اور اسی زبان میں لکھتی تھیں۔ لیکن ان کا پہلا افسانہ 'طوفان کی بانہوں میں' جب انشاء میں چھپا تب وہ تقریباً 65 سال کی تھیں۔ ایک افسانہ نگار بننے کے لیے انھوں نے اس عمر میں جتنی محنت کی اور خود کو انشاء کے معیار تک لانے کے لیے ہر ہر کہانی کو بار بار لکھا وہ مجھے یاد ہے۔ بہت جلد وہ ہماری فیملی ممبر بن گئیں۔ انشاء کے بعد ان کی کہانیاں باجی، بیسویں صدی، اور دیگر رسائل میں بھی چھپنے لگیں۔ روزنامہ 'آزاد ہند' کلکتہ میں بھی ایک دو کہانیاں شائع ہوئیں۔ پھر آکاش وانی کلکتہ اور دوردرشن دہلی اور دیگر چینلز سے انٹرویو نشر ہوئے۔ ان کی شخصیت باوقار تھی۔ آسٹریلیا گئیں تو آہستہ آہستہ وہاں کے کئی ادب نواز ان کے مداح بن گئے۔ 2000 میں ان کی کتاب 'ساوتری گوسوامی کے افسانے' انشا پبلی کیشنز سے شائع ہوئی۔ کتاب واقعی بہت مقبول ہوئی۔ دو تین کہانیوں پر ٹیلی سیریل بنانے کے کچھ آفر بھی انھیں ملے لیکن وہ توجہ نہ دے سکیں۔ بعد میں ہندی میں بھی ان کی کتاب چھپ گئی۔ ساحر کلچرل اکیڈمی سے ساحر ایوارڈ حاصل ہوا۔

لکھنے کی رفتار کا یہ عالم تھا کہ ایک بار میں نے کہا ''عید آنے والی ہے۔ عید نمبر کے لیے ایک افسانہ لکھیں''۔ شاید دو ہفتوں میں ہی انھوں نے دو چار نئے طویل افسانے بھیجے جن میں ایک افسانہ تھا 'چاندنی کی پہلی عید کا انعام' وہ ایک دلچسپ رومانی فیملی کہانی تھی۔ میں نے اہتمام سے عید نمبر میں چھاپ دی۔

اُنس ایسا ہوا کہ ہزاروں میل دور جا کر بھی کبھی میرے گھر فون کر کے سب کی خیریت معلوم کیا کرتی تھیں۔ جبکہ خود برسوں سے شدید بیمار تھیں۔ کلکتہ والوں کو یاد ہوگا کلکتہ میں انشاء کی سہ روزہ سلور جبلی تقریبات کے آخری دن 5 دسمبر کو وہ چھڑی کے سہارے اپنی بیٹی مدھو کا ہاتھ تھامے ICCR کے اسٹیج پر تشریف لائی تھیں۔ انھیں دو ماہ بعد آنا تھا لیکن میرے کہنے سے اس تقریب میں شرکت کے لیے اپنا پروگرام ازسرِنو مرتب کیا۔ کہانیوں کا سیشن تھا۔ اسٹیج پر پروفیسر گوپی چند نارنگ بھی تھے۔ پروگرام کے مطابق گلزار صاحب، صدیق عالم اور مجھے کہانیاں سنانا تھیں۔ سفر کی تھکاوٹ نے ان کے ضعف میں اضافہ کر دیا تھا۔ کہانی سنانے سے پہلے انھوں نے دس منٹ اپنی آمد اور میری تعریف کے بیان میں صرف کر دیے۔ سامعین نے ان کی کہانی خوب پسند کی۔ لیکن پھر وقت کی تنگی کی وجہ سے ہوا یہ کہ اپنے ہی یادگار پروگرام

میں میں نے اپنی کہانی نہیں پڑھی۔ انھوں نے جو کہانی پڑھی اب اس کے بارے میں سن لیجیے۔

جیسا کہ میں نے اوپر لکھا کہ جب ڈاکٹر آنند لال گوسوامی کھڑگپور میں تھے تب سے عین رشید اور ان کے درمیان گھریلو مراسم تھے۔ لہٰذا کلکتہ میں بھی ساوتری جی کا عین رشید کے گھر آنا جانا تھا۔ سب جانتے ہیں عین رشید نظموں کے کتنے اچھے شاعر تھے۔ ستیہ جیت رے اور جیوتی باسو کے دلارے تھے۔ لیکن رندِ بلانوش تھے۔ ساوتری جی نسیم بھابھی اور ان کی دو معصوم بیٹیوں کی محبت میں عین رشید کو پیار سے تلقین فرماتیں ''مسٹر خان یہ علت چھوڑ دو''۔ عین رشید کبھی کبھی لقاں کہہ کر ان کے زانو پر سر رکھ دیتے اور رو پڑتے تھے۔ ساوتری جی میری بیوی سے کہتیں ''کیا کروں گلنار نسیم کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔''

ایک دن دو چار نئی کہانیاں لے کر میرے دفتر پہنچیں۔ میں نے کہا ''آپ ہمیشہ زیادہ طویل کہانیاں لکھتی ہی ہیں۔ اب ایک کہانی لکھیے دس منٹ کی۔ جسے ریڈیو یا کہیں اور آرام سے سنا سکیں۔ تھوڑے دنوں بعد ایک افسانہ اپنے ڈرائیور سے بھیجا۔ عنوان تھا 'شرابی کی بیوی'۔ میں نے اسے انشاء کے خصوصی شمارہ 'کلکتہ کے ۹ ہمعصر افسانہ نگار نمبر' میں شامل کیا۔ وہ ریڈیو سے بھی نشر ہوگیا۔ افسانہ کامیاب رہا۔ انھوں نے بتایا ''یہ افسانہ عین رشید اور نسیم خان کے کرداروں کو لے کر گھڑا تھا۔ لیکن یہ بات میں رشید خان سے تو نہیں کہہ سکتی، نہ ڈاکٹر آنند کہہ سکتے ہیں۔ وہ مجھے ماں کہتا ہے — مگر نسیم کی بہت فکر ہے مجھے۔ آپ نے کہا تھا میں ایک دس منٹ کی کہانی لکھوں—''

چنانچہ انشاء کے سلور جبلی پروگرام میں میں نے اپنے دس منٹ ساوتری گوسوامی کو دے دیے کہ انھوں نے آسٹریلیا سے آنے کی زحمت گوارہ کی ہے۔ لہٰذا اپنی کہانی سنا کر سامعین سے داد وصول کریں۔ مجھے یہ بھی یاد ہے جب ان کی دو کہانی میں نے منظور کی تو ان سے کہا تھا یہ کہانی آپ کی تب چھپے گی جب آپ ایک اور اتنی ہی چھوٹی کہانی لکھ لیں گی۔ مجھے کیا معلوم تھا وہ دس پندرہ دنوں میں ایک اور چھوٹی کہانی 'سہارے' کے عنوان سے لکھ ڈالیں گی!

ساوتری کے یہاں اخذ و قبول (Adoption) کا جذبہ حیرت انگیز طور پر انسان نواز، وسیع اور طاقتور ہے جو ان کی تقریباً ہر کہانی سے ظاہر ہے۔ ان کے والد ایک عیسائی راہب تھے۔ عفو و درگزر یقیناً ان کا شعار تھا اور مخلوق کو محبت کی نصیحت اور سبھوں کے ساتھ اپنائیت اور بہتری کے سلوک کا پیغام ان کے دینی فرائض میں شامل تھا۔ ان کہانیوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ساوتری گوسوامی میں یہ خوبیاں موروثی ہیں۔ وہ دس گیارہ سال نرس کی حیثیت سے بھی بندگانِ خدا کی خدمت انجام دے چکی ہیں۔ چنانچہ مریضوں کی جسمانی اور ذہنی اذیتوں کا مشاہدہ انھوں نے بہت قریب سے اور بچشم خود کیا۔ حب انسانیت میں وہ یوں تحلیل ہوگئی ہیں کہ کارزار زندگی میں نفرت یا انتقام کا جذبہ ان سے کوسوں دور کھڑا معلوم ہوتا ہے۔ ترک اور تیاگ کے لیے ساوتری گوسوامی کا جو نظریہ زندگی نے تیار کیا ہے اس کا انجام الم نہیں بلکہ مسرت ہے۔ جدائی نہیں بلکہ وصال ہے۔ مایوسی نہیں، امید ہے۔

'مٹی کا گھروندہ' میں ساگر سے اس کی محبوبہ کومل جو بیوہ ہوچکی ہے کا بیاہ کروا دیا گیا ہے۔ حالانکہ کومل کا باپ بیوہ بیٹی کی شادی کرانے کو راضی نہیں لیکن ساگر کی ماں فرسودہ سماجی رسم کو ترک کردینے پر ہر طرح آمادہ ہے۔ وہ چودھری سے کہتی ہے:

''... تمھاری ضد اور ہمارا سماج چکی کے دو پاٹ ہیں۔ ان بچوں کو میں چکی کے ان دو پاٹوں کے بیچ پسنے نہیں دوں گی۔ ان کی خوشیوں کے لیے میں سارے سماج سے مقابلہ کروں گی۔ ماں کی شکتی کے سامنے تو بھگوان بھی جھک جاتے ہیں۔''

حالات کا جرأت سے مقابلہ کرنے کے بعد ساگر اور کومل کو وصال کی گھڑیاں نصیب ہوتی ہیں۔

'دو مہربان آنکھیں' ایک عمدہ کہانی ہے۔ اس میں رتن نامی ایک زمیندار فوجی ایک چھوٹی ذات کی تنہا اور بے سہارا لڑکی جو سیلاب کی تباہ کاری کا شکار ہوچکی ہے، پر نظر کرم کرتا ہے۔ رتن کی دو مہربان آنکھیں دیوکی پر یوں اٹھیں کہ وہ اس کی ہمیشہ کی غمخوار بن گئیں اور دیوکی ہر لمحہ ان کی بندگی کرنے لگی۔ دیوکی کہتی ہے:

''مجھ جیسے تنہا اور بے بس لوگوں کے غم جب برداشت سے باہر ہوجاتے ہیں تو ہم خود کو تسلیاں دیتے ہیں۔ یتیموں اور غریبوں کا دکھ بانٹنے والا کوئی بھی نہیں ہوتا۔ ہم غریب تو اپنے غموں کی صلیب تلے ہی دب کر مرجاتے ہیں لیکن میں نے دنیا کا مقابلہ کرنا سیکھ لیا ہے۔ اکیلے جینا سیکھ لیا ہے۔ بس اب میری زندگی کا ایک ہی مقصد ہے.. میری خواہش ہے کہ اپنے جیسے غریب لوگوں کے لیے کچھ کروں۔''

دیوکی کے احساسِ کمتری اور پس و پیش کو دور کرنے کے لیے رتن اس سے کہتا ہے ''فوجی کے قدم ہمیشہ آگے بڑھتے ہیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھنا میں نے نہیں سیکھا۔ ہم دونوں مل کر سب کچھ بنا سکتے ہیں۔ میں ذات کو نہیں مانتا۔ میری نظر میں تو انسان کی دو ہی ذات ہوتی ہے۔ نیک یا بد.. انسان اپنے اعمال سے پہچانا جاتا ہے۔''

دیوکی اور رتن کی شادی ہوجاتی ہے۔ ایک بچی اندرا ان سے جنم لیتی ہے۔ بعدہٗ فوجی رتن کی ایک ٹانگ جنگ میں ضائع ہوجاتی ہے۔ اندرا جو کالج میں لکچرر ہے، پر ایک فوجی، روشن نامی، فریفتہ ہوجاتا ہے لیکن جنگ میں اس کا چہرہ مسخ ہوجاتا ہے اور آنکھیں ناکارہ ہوجاتی ہیں۔ وہ اندرا سے کہتا ہے کہ وہ اس سے شادی کا خواب چھوڑ دے لیکن محبوبہ اندرا کا ایثار اور صبر و انتظار کام آتا ہے۔ روشن کی بینائی بالآخر لوٹ آتی ہے۔ اس کہانی کا انجام بھی صبر و آزمائش کے بعد پرمسرت ملاپ ہے اور قدم قدم پر اس کے کردار محبت کا درس دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ساوتری کی کہانیوں کے زیادہ سے زیادہ کردار لوگوں کے لیے قابل قبول ہوتے ہیں۔ ان کی بعض کہانیوں کے کردار لذتِ معصیت چکھنے کے بعد توبہ اور راستی کی راہ اختیار کرلیتے ہیں۔

'ہائی سوسائٹی کا تحفہ' کی میگھا اپنی ساس کے روایتی تحکمانہ انداز اور روایتی طنزیہ لب و لہجے سے بری طرح متاثر ہوکر خود کو سسرال اور شوہر وشال پر حاوی کرنے کے لیے ارادتاً گمراہ ہوجاتی ہے۔ ایسی بھٹک جانے والی عورتوں کے لیے مسز گوسوامی کی کہانیاں عبرتناک اور نصیحت آموز ہیں۔ دیکھیے، میگھا کہانی کا مرکزی کردار ہے لیکن اس پر مصنفہ کس طرح تنقید کرتی ہے اور اسے نیک ہدایت سے بھی نوازتی ہے۔ مصنفہ بیان کررہی ہے:

''میگھا اپنی تنہائیوں میں اپنے گناہوں کی فہرست

بنا رہی تھی۔ کنال کا خیال آتے ہی آنسو بہہ نکلے۔ اب تو جوان ہو گیا ہوگا میرا بیٹا۔ دل پر اداسی چھا گئی۔ انسان کا ضمیر خدا کا چراغ ہے۔ ضمیر مرجائے تو چراغ گل ہو جاتا ہے۔ اس کا ضمیر تو کب کا مرچکا تھا۔ اس کی زندگی کا چراغ تو اسی دن گل ہو گیا تھا جس دن اس نے وشال کا ساتھ چھوڑا تھا۔ اپنا بیٹا چھوڑا تھا۔ اس وقت ساس کی دو باتیں برداشت کرلیتی تو کون سی قیامت آجاتی۔ قسمت والیوں کو وشال جیسے شوہر ملتے ہیں اور سسرال کی غلامی نصیب ہوتی ہے۔"

ہندوستانی نقطۂ نگاہ سے ساوتری گوسوامی نے خواتین پر ایک کرم کیا ہے۔ انھیں بھٹکایا نہیں ہے۔ ہمارے عصری ادب اور فلموں کے ذریعے نئی عورت کو آزادیٔ نسواں کا نام لے کر مرد اور سسرال کے خلاف اکثر و بیشتر جس انداز سے ورغلایا جا رہا ہے اس سے خاندانوں کی سالمیت اور اکائی کا برقرار رہنا دشوار ہوتا جا رہا ہے۔ ساوتری نے نوعمر بیاہتاؤں کو سسرال اور شوہر کے مظالم کے خلاف جس قوتِ ارادی کے ساتھ ڈٹے رہنے کی تلقین کی ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ اس سلسلے میں مذکورہ کہانی 'ہائی سوسائٹی کا تحفہ' اس مفروضے کو لے کر لکھی گئی ہے کہ اگر ایک عورت یا بہو خاندان کی فلاح سے ہٹ کر اپنے لیے مخصوص انداز کی ہمدردیاں اور آسائشیں تلاش کرنے کے درپے ہو جائے تو اس سے اولاد اور کنبے کو کیسے کیسے مضر ذہنی نتائج جھیلنا پڑ سکتے ہیں۔ 'شرابی کی بیوی' میں ایک رندِ بلانوش کی عورت کو روایتی مشکلات کا سامنا ہے۔ اس کا مرد گرچہ ایک موڈرن آدمی تھا لیکن شراب کی لت نے اسے برباد کر رکھا تھا۔ ایک جگہ شرابی کی بیوی شالنی جو چار یتیم بچوں کی ماں اور خیر سے ڈاکٹر ہے اپنی ایک مطلقہ سہیلی سے کہتی ہے:

"ہمارے سماج میں مرد تیز طرار عورت کو پسند نہیں کرتے۔ یہاں عورت جتنی موڈرن ہوتی جائے گی اس کا حال اتنا ہی برا ہوتا جائے گا۔ یہ موڈرن مرد صرف اوپر سے بدلے نظر آتے ہیں۔ اندر سے بالکل ویسے ہی ہیں جیسے صدیوں پہلے تھے۔ عورت کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں۔ پڑھی لکھی تھی اس لیے زندگی بسر کرنے کی صلاحیت آگئی تھی۔ قوتِ برداشت بڑھ گئی تھی سوچنے سمجھنے کا ڈھنگ بدل گیا تھا۔ خوشگوار زندگی کے خواب تو سب ہی دیکھتے ہیں۔ خوشیاں کتنوں کو نصیب ہوتی ہیں۔ زندگی جیسی بھی ہو ہر حال میں گزارنی تو ہوتی ہے۔ وہ میرے بچوں کا باپ تھا۔"

اس عبارت میں ایک مسئلہ مقصدی اور معروضی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ جب اس کی سہیلی پوچھتی ہے کہ تم نے ایسے مرد سے طلاق کیوں نہیں لے لیا تو شالنی جواباً کہتی ہے:

"میری زندگی تو اس برے وقت کے دائرے میں قید ہوگئی تھی۔ کچھ یادیں میرا پوشیدہ خزانہ ہیں۔ بس شراب کے نشے میں وہ سب کچھ بھول جاتا تھا۔ وہ بچوں کو بہت پیار کرتا تھا۔ بچوں کے روشن مستقبل کے لیے خاندان میں سلامتی بہت ضروری ہوتی ہے۔ انسان تو مٹی کا پتلا ہے۔ خامیوں اور خوبیوں سے بھرا ہوا۔ یہ کہاں لکھا

ساوتری گوسوامی کا پیرایۂ اسلوب اس قدر دلکش اور زبان ایسی رواں ہے کہ ان کی کہانیوں کا قبولِ عام کی سند حاصل کرنا یقینی ہے۔ ان کے افسانوں میں گناہ و ثواب کی کشمکش سے عورت ایک انوکھی اخلاقی قوت لے کر نمودار ہوئی ہے جس سے اس کی آبرومندانہ جاذبیت میں اضافہ ہوا ہے۔ تمام کہانیوں کے حوالے سے بات کرنا یہاں ممکن نہیں لیکن مجھے امید ہے کہ گھریلو ماحول کی ان کہانیوں کا استقبال کیا جائے گا کیونکہ نوجوان لڑکے لڑکیوں کے لیے یہ دلچسپ بھی ہیں اور نصیحت آموز بھی۔

ہے کہ اس شوہر کے ساتھ گزارہ کرو جو خوبیوں سے بھرپور ہے۔ اس کی خامیوں کی وجہ سے اس سے کنارہ کرلو۔"

شالنی کا یہ کہنا "یہ کہاں لکھا ہے کہ اس شوہر کے ساتھ گزارہ کرو جو خوبیوں سے بھرپور ہے۔ اس کی خامیوں کی وجہ سے اس سے کنارہ کرلو" ایک خاتون کی نیک چلنی اور تعمیری ذہن کا پتہ دیتا ہے۔ جس نے اپنی سیرت اور صحت مند افکار کو حالات سے لڑنے کا ہتھیار بنا رکھا ہے اور اسی وجہ سے اپنے خاندان کو ایک جٹ رکھنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اسی طرح 'سائبان' کی بدقسمت شالنی چودہ برس کی عمر میں جب وہ بے حد معصوم تھی ایک کمپاؤنڈر کی ہوس کا شکار بن جاتی ہے۔ یہ کمپاؤنڈر ایک خسیس اور بدخصلت آدمی تھا۔ لیکن اپنی اصلیت چھپا کر سرکاری دواخانے میں نقلی ڈگری کے بل پر ڈاکٹر کا عہدہ حاصل کیے ہوئے تھا۔ لڑکیوں کو اس طرح برباد کرنا اس کا شغل تھا۔ شالنی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے بعد وہ اس سے مزید لطف اندوز ہونے کے لیے اسے جبراً مندر لے جا کر شادی کر لیتا ہے اور اسے اپنی پہلی بیوی اور بچوں کے درمیان لے آتا ہے۔ قدم قدم پر شالنی آلام و مصائب سے دوچار ہوتی رہتی ہے اور ارادے کے باوجود وہ اپنے شوہر کرشن کی جان نہیں لے پاتی۔ کیونکہ وہ اس کی بچی کی ماں بن گئی ہے۔ تب وہ اس سے انتقام لینے کے لیے (خود اچھی ذات کی ہونے کے باوجود) اسی دواخانے میں بھنگن کا کام کرنے لگتی ہے تاکہ اس کے شوہر کو یہ سب دیکھ کر ذلت اور صدمہ سہنا پڑے۔ کہانی حالات کے فطری بہاؤ کے ساتھ انجام کو پہنچتی ہے۔ وہ فطری انصاف کے نتیجے میں ایک حادثے میں مر جاتا ہے۔ شالنی کی اپسرا جیسی خوبصورت بیٹی کو ایک ظالم کا نیک دل بیٹا پسند کر لیتا ہے اور اس سے بیاہ کر لیتا ہے اور شالنی اپنے مرحوم باپ کے چھوڑے ہوئے مکان کو اپنی جیسی ٹھکرائی ہوئی بے گناہ لڑکیوں کا سائبان بنا دیتی ہے۔ کہانی کا مثبت خیال یہ ہے کہ جو سولی پر لٹکتے ہیں وہی مسیحا ہوتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ عورت کو بد سے بدتر حالات میں بھی اپنا گھر نہ چھوڑنے کی ایسی ہدایت آج کا کون افسانہ نگار دے رہا ہے جیسی مسز گوسوامی نے دی ہے۔ صاف اور دوٹوک الفاظ میں۔ قوت اور شفقت سے بھرپور۔

'ایک چھوٹی سی بھول' اور بعض دیگر کہانیاں ایک جیسے تھیم سے مربوط کیے گئے الگ الگ مسرت اور الم کے واقعات پر مبنی ہیں جن میں نوعمر اور سن رسیدہ قارئین یکساں دلچسپی لے سکتے ہیں۔ ساوتری گوسوامی کا پیرایۂ اسلوب اس قدر دلکش اور زبان ایسی رواں ہے کہ ان کی کہانیوں کا قبولِ عام کی سند حاصل کرنا یقینی ہے۔ ان کے افسانوں میں گناہ و ثواب کی کشمکش سے عورت ایک انوکھی اخلاقی قوت لے کر نمودار ہوئی ہے جس سے اس کی آبرومندانہ جاذبیت میں اضافہ ہوا ہے۔ تمام کہانیوں کے حوالے سے بات کرنا یہاں ممکن نہیں لیکن مجھے امید ہے کہ گھریلو ماحول کی ان کہانیوں کا استقبال کیا جائے گا کیونکہ نوجوان لڑکے لڑکیوں کے لیے یہ دلچسپ بھی ہیں اور نصیحت آموز بھی۔ ادبِ عالیہ میں ان کا شمار بھلے نہ ہو لیکن ادبِ اوسط کو مثبت اور تعمیری رجحان دینے میں یہ کہانیاں اہم کردار ادا کریں گی۔ فروغِ سیکولرزم کے نکتۂ نگاہ سے ان کی وقعت مزید بڑھ گئی ہے۔ دراصل ساوتری گوسوامی ایک عیسیٰ نفس خاتون ہیں اور ان کی کئی کہانیاں ان کے قلم کی مسیحائی کا جیتا جاگتا ثبوت پیش کرتی ہیں۔

■

Fe Seen Ejaz, Editor 'Insha' 25-B, Zakaria Street, Kolkata - 700073 (Kolkata)

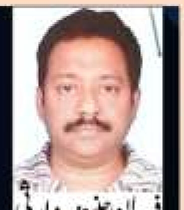

فرحان حنیف وارثی

م ناگ

کتاب جو چھپٹی رہ گئی

م ناگ کو میں پچھلے بائیس تیئس برسوں سے جانتا تھا۔ ان کی کہانیاں مجھے پسند تھیں۔ محض اس لیے نہیں کہ ان کا طرزِ تحریر اوروں سے ایک حد تک جداگانہ تھا بلکہ اس لیے بھی کہ وہ عورت اور اس کے جسمانی حسن کو اتنی ہنرمندی سے لفظوں کے ساتھ گوندھتے تھے کہ قاری کہانیاں پڑھتے وقت اپنے اندرون میں ایک مقناطیسی کشش کا احساس کرتا تھا۔ گویا الٹے توے پر کوئی روٹی پکا رہا ہو۔ ڈاکو طے کریں گے، غلط پتہ اور 'چوتھی سیٹ کا مسافر' میں ایسی کئی کہانیاں قاری کو پڑھنے کے لیے مل جاتی ہیں۔ م ناگ نے گفتگو کے دوران ایک بار مجھ سے کہا تھا ''یہ قاری کے اپنے تاثرات ہیں، ورنہ میرا موضوع سیکس نہیں ہے۔ یعنی میں ڈائریکٹ سیکس کی بات نہیں کرتا۔ میں انسان کے بدلتے رشتوں پر لکھتا ہوں اور اس بنت کے دوران سیکس میرے اسلوب میں خود بخود شامل ہوجاتا ہے۔ میں نے دانستہ طور سے سیکس کو اپنی کہانی کا حصہ بنانے کی کبھی سعی نہیں کی۔ میری جن کہانیوں میں سیکس نہیں ہے وہاں شاید اس کی ضرورت نہیں رہی ہوگی۔''

م ناگ نے ایک دفعہ اپنے خاندانی پس منظر اور تعلیم و تربیت کے بارے میں بتایا تھا ''ناگپور میں میرے والد صاحب پولیس انسپکٹر تھے۔ اسماعیل علی نام تھا ان کا۔ میں نے میونسپل کارپوریشن کے ایک اسکول میں چوتھی اور لشکری باغ کے قدوائی ہائی اسکول سے آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ بعدازاں صدر نامی علاقے کے انجمن اسلام ہائی اسکول سے میٹرک (گیارھویں) کیا۔ مارلیس کالج سے بی اے پارٹ ون تک ہی پڑھ سکا اور بدلتے وقت نے مجھے چھوٹی موٹی ملازمت کے لیے مجبور کردیا۔ ہمارا گھر پولیس لائن کے پاس پانچ باؤلی میں تھا۔ میں گھر میں سب سے چھوٹا ہوں اور سب سے ناکام بھی کیونکہ اس دنیا میں وہی کامیاب کہلاتا ہے جس کے پاس پیسہ ہوتا ہے۔ میرے پاس تو افسانے ہیں، مضامین ہیں، خبریں ہیں، انھیں بیچ کر آج میں پیسے کی بجائے صرف روٹی کما رہا ہوں اور وہ بھی صرف آدھی۔''

م ناگ کے گھر کا ماحول ادبی نہ تھا۔ والد صاحب نے غالب اور اقبال کو پڑھا تھا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ ادب کیا ہوتا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ ان کی حوصلہ افزائی کی۔ بالکل دوست کی طرح بے تکلف تھے۔ م ناگ کا پہلا افسانہ 'بابا کی چھبیسویں' تھا۔ یہ افسانہ کامٹی کے 'تاج' نامی ہفت روزہ میں شائع ہوا تھا۔ م ناگ افسانے کی اشاعت پر بے حد خوش تھے اور اپنے دوستوں کو اخبار کی کاپی دکھاتے پھر رہے تھے۔ ان کے والد صاحب نے بھی یہ افسانہ پڑھا اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔ میٹرک تک آتے آتے م ناگ کی کہانیاں ہفت روزہ تاج، شاخیں، مورچہ، برگ آوارہ، آب و رنگ، شمع، روبی اور بیسویں صدی میں شائع ہوچکی تھیں۔ م ناگ نے مجھ سے کہا تھا ''مجھے یاد ہے کہ لکھنؤ کے 'کتاب' نامی میگزین میں میری کہانی 'بارود' چھپی تھی لیکن میرے پاس اس دور کی کہانیوں کی فائل موجود نہیں ہے۔ میں ایک افسانہ نگار بننے کے مراحل سے گزر رہا تھا اور دوسری طرف روزی روٹی کے جگاڑ میں پریشان تھا۔ والد صاحب ریٹائرڈ ہوچکے تھے اور کچھ سال بابا تاج الدین اولیاؒ کی عرس کمیٹی کے رکن بھی رہ چکے تھے۔ انھوں نے جہاں میرے تمام بھائیوں اور جان پہچان والوں کے بچوں کو ذریعہ معاش سے جوڑنے میں کامیابی حاصل کی تھی وہیں وہ مجھے روزگار سے وابستہ کرنے میں ناکام رہے تھے۔ انھیں اس ناکامی کا زندگی بھر ملال رہا۔''

م ناگ نے ممبئی آنے سے پہلے کپڑے کی مل میں ملازمت کی۔ پانی کے ٹینکر میں بحیثیت کلینر وقت گزارا۔ کھاپر کھیڑا کے پاور ہاؤس میں کام کیا۔ وہاں پانی کا ڈریم بن رہا تھا اور ان کی ذمے داری ٹرک کے پھیروں کا ریکارڈ رکھنا تھی۔ اسی دوران ان کی فیملی ناگپور سے گوندیا منتقل ہوگئی۔ انھوں نے ایک روز والد صاحب سے ممبئی جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ پہلے تو والد صاحب نے مخالفت کی، پھر راضی ہوگئے۔ اس طرح 34 روپے کا ٹکٹ اور آنکھوں میں خواب لے کر وہ ناگپور سے دادر آگئے۔

م ناگ نے مجھ سے کہا تھا ''یہ شہر میرے لیے اجنبی

تھا۔ صرف سلام بن رزاق سے خط و کتابت تھی۔ کسی رسالے میں میری اور ان کی کہانی ساتھ میں چھپی تھی اور اس طرح ایک تعلق بن گیا تھا۔ چمبور ناکہ پر ایک بیگرس ہوم تھا جہاں پولیس بھیک مانگنے والوں کو لاکر بند کر دیتی تھی۔ ناگپور میں میرا ایک دوست تھا جس کا بہنوئی وہاں ملازم تھا۔ میں نے مہینے بھر اس بیگرس ہوم میں ان کے یہاں قیام کیا۔ انھوں نے آگے بتایا تھا ''یہ 1975 کی بات ہے۔ مجھے ورانڈے میں سونے کی جگہ مل گئی تھی۔

> بالکل۔ پیسے نہ ہوں تو ادھار مانگنے کی ہمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ادھار مانگنے کی لت پڑتی ہے تو آدمی ڈھیٹ بن جاتا ہے۔ ایک بار اورنگ آباد میں پیسے ختم ہوگئے۔ میں نے دوست سے پوچھا ''سنا ہے جوگندر پال یہاں کسی کالج میں پرنسپل ہیں'' وہ بولا ''ہاں! تو کیا تم ان سے پیسے مانگو گے؟'' میں نے کہا ''کیوں نہیں، ادھار مانگیں گے، وہ پرنسپل ہیں اور اوپر سے افسانہ نگار، ایک افسانہ نگار کو کیا دوسرا افسانہ نگار اُدھار نہیں دے گا۔

وہیں سوتا اور ان کے راشن میں مفت میں حصہ داری کرتا۔ دوست کے جیجا جی لیبر افسر تھے اور ان کی بیوی بالکل سائرہ بانو کی طرح تھی۔ وہ آکاش وانی پر مراٹھی سگم سنگیت گاتی تھی۔ ویسے ہر ہفتے سائرہ بانو مجھے علامتی انداز میں آٹے اور دال کے خالی ڈبے دکھایا کرتی تھی۔ میں سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی چپ تھا کیونکہ ٹھونک بجا کر دیکھ چکا تھا کہ ناگپور کے سارے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ میں ورانڈے میں سوتا، رات بھر دنیا جہاں کی سیر کرتا لیکن صبح الجھتا ورانڈے سے۔ ورانڈے سے لگا ہوا ان کا بیڈ روم تھا۔ وہ لوگ کھڑکی بھی بند نہیں کرتے تھے۔ دونوں میاں بیوی دو بچوں کو لے کر مچھر دانی میں سو جاتے اور ان کی ننگی آوازیں مچھر مارتے ہوئے میں سنتا رہتا۔ چٹ چٹ، گھپ گھپ، چک چک، ہنسی، کھینچا تانی، دھک دھک، بوس و کنار، آوازوں کی بارش مجھ پر ہوتی اور میں اندر باہر سے بھیگتا رہتا۔ مچھر مجھے تنگ کرتے، لیکن میں بھاگا نہیں، کفن باندھ کر آیا تھا، صرف سر پر نہیں، ہر جگہ کفن۔''

م ناگ روزانہ چمبور سے کرلا جاتے اور اسٹیشن کے پاس سنسار ہوٹل میں سلام بن رزاق، ابراہیم نذیر، مقدر حمید اور شعلہ صاحب کے ساتھ بیٹھے رہتے۔ کبھی کبھار ندا فاضلی بھی آجاتے۔ ادب پر گفتگو ہوتی۔ انھوں نے بتایا تھا ''اس دوران ایک بار میاں بیوی نے مجھ سے کہا کہ ہم جیجوری کے کھنڈوبا کے درشن کو جارہے ہیں۔ میں نے سوچا یہ مجھے بھگانے کا داؤ ہے۔ میں نے کہا جائیے۔ دو دن مجھے فٹ پاتھ پر اخبار بچھا کر سونا پڑا۔ کتا میرا منھ چاٹ کر گیا، میں کیا کرتا۔'' سگریٹ سلگاتے ہوئے انھوں نے آگے بتایا تھا ''کرلا گیا تو یہ واقعہ سلام بن رزاق سے بتایا۔ انھوں نے تقریباً دو ہفتوں بعد اپنے دوست انور قمر سے ملایا۔ انور قمر نے کہا ''' کچھ نہ کچھ ہوجائے گا۔ میں نے اطمینان کی سانس لی اور اپنے خدا کا شکریہ ادا کیا۔ لگاتار چمبور سے سنسار ہوٹل (کرلا) جاتا رہا۔ سنسار ہوٹل میں دھوئیں کے مرغولے میں چائے پیتا رہتا اور چائے والا کھڑ کھڑ کی آواز سے سا سر بجاتا رہتا۔ پیسے تیزی سے ختم ہو رہے تھے۔'' م ناگ نے آگے کہا تھا ''بالکل۔ پیسے نہ ہوں تو ادھار مانگنے کی ہمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ادھار مانگنے کی لت پڑتی ہے تو آدمی ڈھیٹ بن جاتا ہے۔ ایک بار اورنگ آباد میں پیسے ختم ہوگئے۔ میں نے دوست سے پوچھا ''سنا ہے جوگندر پال یہاں کسی کالج میں پرنسپل ہیں'' وہ بولا ''ہاں! تو کیا تم ان سے پیسے مانگو گے؟'' میں نے کہا ''کیوں نہیں، ادھار مانگیں گے، وہ پرنسپل ہیں اور اوپر سے افسانہ نگار، ایک افسانہ نگار کو کیا دوسرا افسانہ نگار اُدھار نہیں دے گا۔''

م ناگ کبھی مختار ناگپوری ہوا کرتے تھے، پھر چند دنوں کے لیے مختار سید بن گئے۔ مختار سید کے نام سے چند کہانیاں شائع ہو چکی تھیں۔ ناگپور کی سرزمین پر 1966 میں پہلی مرتبہ جدید شاعروں کا ایک مشاعرہ برپا کیا گیا تھا جس میں ممتاز راشد، ندا فاضلی، صادق، عتیق اللہ، شاہد کبیر، عبدالرحیم نشتر، مدحت الاختر، ظفر کلیم اور ضیاء انصاری وغیرہ نے شرکت کی تھی۔ اس وقت کچھ ایسے رائٹرز رسائل میں چھپ رہے تھے جن کے نام کچھ ہٹ کے تھے۔ گلبرگہ کے بشیر باگ اور میسور کے اکرام باگ۔ م ناگ کو دوستوں نے مشورہ دیا کہ تم بھی اپنا نام تبدیل کرلو، کیونکہ تمھارے لکھنے کا انداز بھی دوسروں سے مختلف ہے لہٰذا نام بھی منفرد ہونا چاہیے۔ سب نے اپنے اپنے طور سے نام سجھائے اور آخرکار مختار کے 'م' اور ناگپوری کے 'ناگ' کو مخفف کر کے انھیں م ناگ بنا دیا گیا۔

م ناگ میں 'میم' اور 'ناگ' والی خوبیاں تلاش کرنے پر بھی نہیں ملتی تھیں۔ وہ زیادہ تر چپ رہتے تھے لیکن چشمے کے کواڑوں سے ان کی بڑی بڑی آنکھیں سب کچھ بھانپ لیتی تھیں۔ ہر ناانصافی برداشت کر لیتے تھے اور سگریٹ کے دھوئیں میں غموں کو اڑا دیتے تھے۔ کسی کو ڈستے بھی نہیں۔ البتہ دوسروں نے انھیں ضرور ڈسا تھا۔ م ناگ کے دوسرے مجموعے 'غلط پتہ' میں ساجد رشید نے لکھا تھا ''م ناگ مجھے اپنے معاصر افسانہ نگاروں میں کئی معنوں میں مختلف نظر آتے ہیں، اتنے مختلف کہ ان کے افسانوی اسلوب کا موازنہ ان کے کسی ہمعصر سے تو کجا ان کے کسی پیش رو سے بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے باوجود وہ نظرانداز کیے گئے۔ یہ حیران کن واقعہ ہے اور افسوس ناک بھی۔ اس کی دو بڑی وجہیں ہیں۔ پہلی تو یہ کہ انھوں نے تواتر سے افسانے نہیں لکھے، دوسری وجہ ان کا قلندرانہ مزاج ہے جس میں ان کی بے ترتیب زندگی اور لاپرواہی کا بڑا دخل ہے۔ انھیں اپنے ہونے کا کبھی احساس بھی

> م ناگ میں 'میم' اور 'ناگ' والی خوبیاں تلاش کرنے پر بھی نہیں ملتی تھیں۔ وہ زیادہ تر چپ رہتے تھے لیکن چشمے کے کواڑوں سے ان کی بڑی بڑی آنکھیں سب کچھ بھانپ لیتی تھیں۔ ہر ناانصافی برداشت کر لیتے تھے اور سگریٹ کے دھوئیں میں غموں کو اڑا دیتے تھے۔ کسی کو ڈستے بھی نہیں۔ البتہ دوسروں نے انھیں ضرور ڈسا تھا۔

نہیں رہا۔'' یہ ایک سچائی ہے جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں م ناگ کی اس بے نیازی کے قصوروار وہ نام نہاد نقاد اور مضمون نگار ہیں جو اپنے پسندیدہ افسانہ نگاروں کی فہرست کسی افسانہ نگار کے فن اور طرزِ تحریر کی بجائے چھپ

گیری سے خوش ہو کر تیار کرتے ہیں۔ م ناگ نے گوا میں قیام کے دوران نظمیں بھی کہی تھیں۔ ان کی کہانیوں کی طرح ان کی نظموں میں بھی جنس کی خوشبو موجود تھی۔ انھوں نے کئی نظمیں مجھے سنائی تھیں جس میں ایک نظم 'ایش ٹرے' بھی تھی۔ کرشن چندر، منٹو اور بیدی ان کے من پسند افسانہ نگار تھے۔ ممبئی کے افسانہ نویسوں میں انھیں سلام بن رزاق، انور قمر، ساجد رشید اور علی امام نقوی پسند تھے جبکہ نئے افسانہ نگاروں میں انھیں مظہر سلیم، اشتیاق سعید اور رحمان عباس کے یہاں اسپارک نظر آتا تھا۔ کچھ ٹھہر کے انھوں نے کہا تھا ''دوستوں میں مجھے عارف خورشید اور نورالحسنین بھی پسند ہیں۔''

م ناگ کی شخصیت اور ان کی کتابوں کی روشنی میں ندا فاضلی نے لکھا تھا ''اردو کے افسانہ نگاروں میں م ناگ کا نام اس لیے اہم ہے کہ وہ موضوعات کے انتخاب کے ساتھ اپنی لفظیات سے بھی قارئین میں پہچانے جاتے ہیں۔'' سلام بن رزاق نے ایک جگہ لکھا تھا ''سیکس پر لکھنا پل صراط سے گزرنے کے مترادف ہے۔ ذرا چوکے اور فحاشی کے دلدل میں گرے، مگر م ناگ اس راستے سے خراماں خراماں یوں گزر جاتے ہیں جیسے کسی باغ کی روش سے گزر رہے ہوں۔'' انور خان نے ان کے بارے میں لکھا تھا ''م ناگ کے افسانے میں طنز تو ہوتا ہی ہے اور ان کا ٹریٹ بھی بہت عمدہ ہے۔'' میرے پوچھنے پر انھوں نے کہا تھا ''فنی اعتبار سے کسی تبدیلی کا اندازہ ناقد ہی لگا سکتے ہیں جہاں تک میری بات ہے میں نے کسی طرح کی تبدیلی محسوس نہیں کی۔ جنس کا موضوع میری پہلی کتاب میں بھی تھا اور اس کتاب میں بھی ہے۔'' انھوں نے ایک بار مجھ سے کہا تھا ''پریم چند آخر تک یہ کہتے رہے کہ ابھی میری شاہکار کہانی تخلیق نہیں ہوئی۔ اس طرح میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ابھی جو لکھ رہا ہوں آگے اس سے بہتر لکھوں گا یا نہیں۔'' وہ کرشن چندر کو جادوئی اسٹائل کے کہانی کار سمجھتے تھے۔ انھوں نے کہا تھا ''ان کے واقعات سننے کا ڈھنگ مجھے بھاتا تھا۔ منٹو کے یہاں جو جنسی لفظیات اور سفاک حقیقت ملتی ہے اس کا جواب نہیں۔''

م ناگ نے ابن صفی کے ناول پڑھ کر اردو سیکھی تھی۔ موصوف کے مطابق ''میں نے ابن صفی کے ناول پڑھ کر اردو سیکھی۔ یہ سیکھا کہ اردو کی نثر کس طرح لکھنا چاہیے۔ ناگپور مومن پورہ میں ایک لائبریری تھی جہاں میں نے کئی نایاب کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ آج کل لائبریری دکھائی نہیں دیتی اور اگر کہیں لائبریری ہے تو پڑھنے والے نہیں ہیں۔ بہرحال لائبریری کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔'' م ناگ طویل صحافتی تجربہ بھی رکھتے تھے۔ انھوں نے دور بھ نامہ، روزنامہ اردو ٹائمز، روزنامہ صحافت، روزنامہ راشٹریہ سہارا، روزنامہ (تعمیر (بیڑ) کے علاوہ ہندی اخبار 'جن ستہ' کے لیے بھی کام کیا تھا۔ روزنامہ ہندوستان ہفت روزہ بلٹز، ہفت روزہ مسلم ٹائمز، روزنامہ انقلاب اور کئی دیگر اخبارات سے بھی کسی نہ کسی طور وابستگی رہی۔ وہ ایک بہترین مترجم بھی تھے۔

م ناگ نے ایک طویل انٹرویو کے دوران مجھ سے کہا تھا ''جہاں تک میرا خیال ہے، میں سمجھتا ہوں، تخلیق کار کے اندر سادگی، یقین، صداقت اور صبر کا مادہ ہی اس کی نجات کا راستہ ہے۔ زندگی میری استاد رہی ہے اور افسانہ میرے لیے ڈھال بنا ہے۔ زندگی میں جو کچھ بھی ختم ہوتا جا رہا ہے ادب اس کی آخری پناہ گاہ ہے اور میرا یقین ہے کہ زندگی کے اسرار و رموز اور بھول بھلیوں کو سمجھنے کے لیے ادب سے بڑی کوئی کلید نہیں ہے۔'' انھوں نے 'غلط

> شام ساڑھے چار بجے جس وقت ان کی روح جسم کا ساتھ چھوڑ رہی تھی ٹھیک اسی وقت اطہر عزیز ان کا افسانہ پڑھ رہے تھے۔ گویا افسانہ موت کے وقت بھی ان کے ساتھ رہا اور ساتھ ہی گیا۔ اپنے تیسرے مجموعے 'چوتھی سیٹ کا مسافر' کی طرح وہ ساری زندگی چوتھی سیٹ پر بیٹھے رہے۔ نہ تیسرا مسافر اٹھا اور نہ ہی انھیں بیٹھنے کے لیے پوری سیٹ ملی۔ ادبی رسالہ 'نیا ورق' میں ان کا سوانحی ناول 'دکھی من میرے' قسط وار شائع ہو رہا تھا جواب نامکمل رہ گیا۔ انھوں نے افسانوں کے چوتھے مجموعے کا ٹائٹل 'پھٹی کتاب' طے کیا تھا۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ ان کی یہ کتاب بھی پھٹی رہ گئی۔

پیٹ' کے بیک فلیپ پر لکھا تھا ''ممبئی ایک چوباداں ہے جس میں روٹی کا ٹکڑا پھنسا ہے۔ یہ شہر للچاتا ہے۔ رات میں خواب دکھاتا ہے اور صبح اپنی راہیں تعبیریں ڈھونڈنے کے

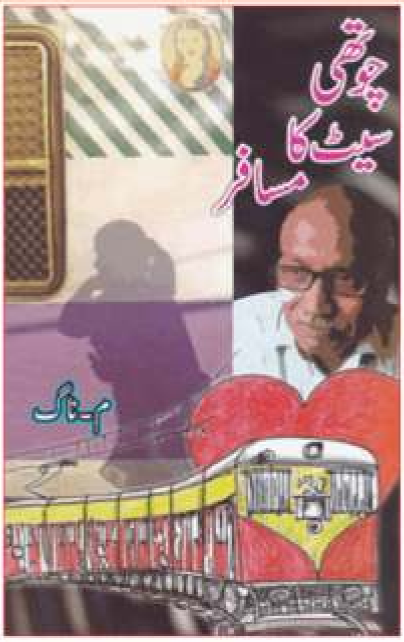

لیے کھول دیتا ہے۔ میں بھی للچایا، مگر جیسے ہی روٹی پانے اندر گیا، ساری دنیا باہر رہ گئی۔ بس پھر کیا تھا، تیسری گھنٹی بجی، پردہ اٹھا اور کھیل شروع ہو گیا۔ ممبئی سے پھر کہیں جانا ممکن نہ تھا، کیونکہ سڑک واپس نہیں جاتی تھی۔''

م ناگ نے اس شہر کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ یکم جولائی 1950 کو ناگپور میں جنم لینے والے اردو کے اس منفرد افسانہ نگار نے 21 اکتوبر 2016 کی شام بوریولی میں واقع اپنی کٹیا نما رہائش گاہ میں آخری سانس لی۔ افسوس کہ یہ گھر بھی ان کا اپنا نہیں تھا۔ ان کی موت نے ہر کس و ناکس کو غمزدہ کر دیا۔ اسی شام انھیں ہندوستانی پرچار سبھا میں افسانہ سنانا تھا اور علالت کی وجہ سے انھوں نے اطہر عزیز کو اپنا افسانہ بھیج دیا تھا۔ شام ساڑھے چار بجے جس وقت ان کی روح جسم کا ساتھ چھوڑ رہی تھی ٹھیک اسی وقت اطہر عزیز ان کا افسانہ پڑھ رہے تھے۔ گویا افسانہ موت کے وقت بھی ان کے ساتھ رہا اور ساتھ ہی گیا۔ اپنے تیسرے مجموعے 'چوتھی سیٹ کا مسافر' کی طرح وہ ساری زندگی چوتھی سیٹ پر بیٹھے رہے۔ نہ تیسرا مسافر اٹھا اور نہ ہی انھیں بیٹھنے کے لیے پوری سیٹ ملی۔ ادبی رسالہ 'نیا ورق' میں ان کا سوانحی ناول 'دکھی من میرے' قسط وار شائع ہو رہا تھا جواب نامکمل رہ گیا۔ انھوں نے افسانوں کے چوتھے مجموعے کا ٹائٹل 'پھٹی کتاب' طے کیا تھا۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ ان کی یہ کتاب بھی پھٹی رہ گئی۔

■

Farhan Hanif Warsi
Post Box No.: 4546, Mumbai Central Post Office
Mumbai - 400008 (MS)

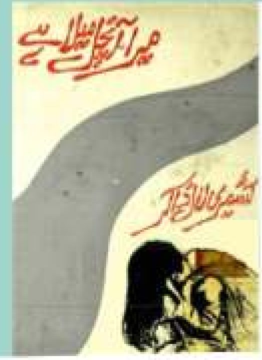

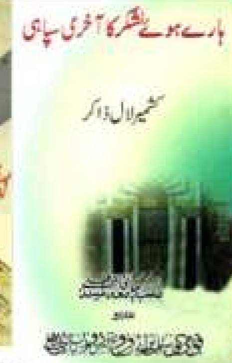

محمد مستمر

خوشبوؤں میں بسا ذہن
کشمیری لال ذاکر

ابھی عابد سہیل اور جوگندر پال کا غم تازہ ہی تھا کہ کشمیری لال ذاکر بھی 31 اگست 2016 کو صبح آٹھ بجے داغ مفارقت دے گئے۔ یوں تو دنیا میں جتنے بھی انسان آئے ہیں سب کو ایک دن جانا ہی ہے مگر کچھ نابغہ ہستیاں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ ان کے چلے جانے کے بعد جو خلا پیدا ہوتا ہے وہ پُر ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔

کشمیری لال ذاکر 7 اپریل 1919 کو بیگاں بانیاں ضلع گجرات (پاکستان) میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام گورداس رام اور والدہ کا نام پرمیشوری دیوی تھا۔ ان کا پورا نام کشمیری لال موہن تھا لیکن ادبی دنیا میں بہ متخلص ذاکر مقبول و معروف ہوئے۔ انھوں نے جموں کے پرنس آف ویلز کالج میں تعلیم حاصل کی۔ ذاکر صاحب نے انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔ تعلیم بالغاں اور سوشل ایجوکیشن میں خصوصی تربیت لی۔ ان کے بچپن کا زیادہ تر حصہ کشمیر میں گزرا کیونکہ ان کے والد جموں کشمیر کی پونچھ ریاست کے راجا کے یہاں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ انھوں نے تیس سال تک پنجاب ہریانہ کے محکمۂ تعلیم میں خدمات انجام دیں اور بعد ازاں ہریانہ کے قیام کے بعد حکومتِ ہریانہ کے محکمۂ تعلیمِ بالغاں سے بطور سربراہ سبکدوش ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد 1977 سے 1984 تک پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ میں سنٹر فار کانٹی نیوئنگ ایجوکیشن کے ڈائرکٹر اور ریجنل وسائل مرکز میں ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ انھی امور کے ساتھ وزارت ترقی انسانی وسائل حکومتِ ہند کے ادارہ شلپشن سنستھان چنڈی گڑھ کے کم وبیش پندرہ برس تک چیئرمین رہے اور 1987 سے 2000 تک اور 2004 سے 2011 تک ہریانہ اردو اکادمی کے سکریٹری کے عہدے کو زینت بخشتے رہے۔ انھیں مختلف اداروں، تنظیموں اور اکادمیوں سے بہت سے انعامات و اعزازات سے سرفراز کیا گیا، جن میں مجموعی ادبی خدمات کے لیے 1969 میں ہریانہ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، 1986 میں صدر جمہوریہ ہند کے دستِ مبارک سے اردو فکشن کے لیے قومی سطح کا غالب ایوارڈ، 8 ستمبر 1991 کو نائب صدر جمہوریہ ہند کے دستِ مبارک سے تعلیمِ بالغان کے لیے نیشنل لٹریسی ایوارڈ، 1993 میں گورنر اتر پردیش لکھنؤ میں اردو ہندی ساہتیہ کمیٹی کی جانب سے اردو فکشن ایوارڈ، 1994 میں مجموعی ادبی خدمات کے لیے پاکستان کا نیشنل نقوش ایوارڈ اور پچاس سالہ ادبی خدمات پر مہدی نظمی ایوارڈ، 2005 میں عالمی پنجابی کانفرنس لاہور سے مجموعی خدمات پر ایوارڈ، 29 مارچ 2006 کو صدر جمہوریہ ہند نے پدم شری سے نوازا، یکم نومبر 2006 میں پنجاب سرکار سے شرومنی ساہتیہ ایوارڈ، 7 ستمبر 2007 کو صدر جمہوریہ ہند شریمتی پرتبھا پاٹل نے وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند کا یونیسکو ایوارڈ وغیرہ شمولیت کے حامل ہیں۔

ذاکر صاحب کے اندر کام کرنے کا ایک جذبہ تھا بلکہ ان کے کام کرنے کے جذبے کو جنون سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جہاں وہ ایک بڑے فکشن نگار تھے وہیں ایک بہترین منتظم بھی تھے۔ چاہے کتنے ہی بجٹ کا پروگرام ہو لیکن اس بندے کے اندر خدا نے وہ اوصاف اور صلاحیتیں ودیعت کی تھیں کہ وہ مشکل سے مشکل کام کو بھی آسانی سے کرگزرتے تھے۔ خواہ انھیں کچھ بھی جتن کرنے پڑے مگر وہ بڑے سے بڑے بجٹ کی فائل کو بھی سی ایم لیول سے منظور کرا کر لے آتے تھے۔ بعد کے سکریٹری حضرات یا درمیان میں ایک دو جو آئے ان میں ایسا دم خم نہیں دیکھا کہ انھوں نے بڑے بجٹ کے پروگرام کیے ہوں۔

پاکستان کے ساتھ حالات کچھ بھی رہے ہوں لیکن اگر ذاکر صاحب نے ٹھان لی کہ انڈو پاک مشاعرہ کرانا ہے تو کرا کر ہی چھوڑا خواہ انھیں اس کے لیے کتنی ہی سیاسی تگ و دو کرنی پڑی لیکن جن شعرائے کرام کو پاکستان سے بلانا ہوتا تھا وہ بلا کر ہی دم لیتے تھے۔ کئی بار ویزا کے مسائل بھی در پیش آئے لیکن ویزا لگوانے میں بھی انھوں نے کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ بہت سے حضرات نے ان کے کام کرنے کے جذبے کو 'چاپلوسی' پر بھی محمول کیا اور یہ بھی کہا کہ یہ پروگرام وروگرام کچھ نہیں کراتا بلکہ اس کے اپنے ایجنڈے ہوتے ہیں، یہ تو اپنے کو ہائی لائٹ کرانا چاہتا ہے۔ لیکن جب ذاکر صاحب سکریٹری نہیں رہے تب لوگوں کو اپنے جملوں کا احساس ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ان کے اپنے ایجنڈے بھی تھے تاہم اکادمی کا ہی فائدہ ہوتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب تک وہ اکادمی میں رہے اکادمی کی ایک شناخت تھی اور اکادمی فعال و متحرک تھی۔

تقریباً پون صدی تک اردو کا یہ مرد مجاہد اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت کرتا رہا۔ مشہور محقق و قلم کار فاروق ارگلی نے تو انھیں ایک جزیرے سے تعبیر کیا تھا۔ ذاکر صاحب کی پہلی کہانی اکتوبر 1943 میں رسالہ 'ہمایوں' (لاہور) میں بعنوان 'الگ الگ راستے' شائع ہوئی اور پہلی غزل رسالہ 'ادبی دنیا' (لاہور) میں 1943 میں ہی زیور طبع سے آراستہ و پیراستہ ہوئی۔ اس طرح ذاکر صاحب نثر و نظم دونوں میدان میں ایک ساتھ نمودار ہوئے۔ ذاکر صاحب نے کم و بیش سو سے زائد کتابیں رقم کی ہیں۔ وہ اردو کے ساتھ ساتھ ہندی، پنجابی اور انگریزی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ ان کی کئی کتابیں ہندی اور پنجابی میں بھی بے حد مقبول ہوئیں۔ کچھ ایسی تصانیف بھی ہیں جو انھوں نے پہلے اردو میں لکھیں اور بعد میں ہندی اور پنجابی زبان میں ترجمہ کیں۔ کشمیری لال ذاکر کو ایک زود نویس فنکار بھی کہہ سکتے ہیں۔ انھوں نے اس بات کا اعتراف افتخار امام صدیقی کو دیے گئے انٹرویو میں کیا تھا۔ وہ کہتے ہیں:

''میں اپنے افسانہ، ناول، ناولٹ، خاکہ لکھنے کے بعد انھیں پڑھتا نہیں ہوں۔ ایک بار لکھتا ہوں اور انھیں اشاعت کے لیے بھیج دیتا ہوں۔ کئی سال پہلے یہ غلطی کرتا رہا کہ اپنی تحریروں کی نقلیں نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے میرے کئی افسانے چھپ تو چکے ہیں لیکن ضائع ہو گئے ہیں۔ اس زمرے میں میرے دو ایک ناولٹ بھی شامل ہیں۔ جن کی اس سفاکانہ موت کا مجھے بے حد افسوس ہے۔''

(بحوالہ: شاعر جون 2011، ص 13)

کشمیری لال ذاکر سے ایک بار جب افتخار امام صدیقی نے پوچھا تھا کہ آپ اپنی سوانح کیوں نہیں لکھتے تو انھوں نے اس تلخ حقیقت کے ساتھ جواب دیا تھا:

''میں نے بہت سی آٹو بایوگرافی پڑھی ہیں اور صرف دو آٹو بایوگرافی ہیں جو حقیقت پر مبنی ہیں۔ ان میں سے ایک مہاتما گاندھی کی سوانح حیات ہے 'مائی ایکسپریمنٹ وتھ ٹرتھ'' اور دوسری سوانح حیات روس کی بہت ہی مشہور اور خوبصورت ڈانسر کی ہے جس کا نام 'آئی سی ڈورا ڈنکن' ہے اور اس کی سوانح حیات کا نام ہے 'مائی لائف' جسے میں نے امریکہ کی ایک لائبریری میں پڑھا اور پھر اس کے بعد وہ کتاب کہیں نظر نہیں آئی۔ ہندوستان میں جتنی بھی آٹو بایوگرافی لکھی گئی ہیں ان میں سے 75 فیصد جھوٹ، دس فیصد مبالغہ آمیزی، 5 فیصد غلط اعترافات ہوتے ہیں۔''

(بحوالہ: شاعر جون 2011، ص 13)

کشمیری لال ذاکر کی مذکورہ بات سے کافی حد تک اتفاق کیا جا سکتا ہے۔ کشمیری لال ذاکر نے اگرچہ سوانح حیات نہیں لکھی ہے مگر ان کے بہت سے ناولوں اور افسانوں میں ان کی شخصیت اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ 'سندور کی راکھ' انھوں نے اپنی شریک حیات کی کم عمری میں وفات سے متاثر ہو کر لکھا جو خالص ان کی حقیقی و ذاتی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس ناول کو پڑھنے پر بہت سے ایسے گوشے ضرور قاری کے سامنے آئیں گے جن کا راست اور براہ راست تعلق ذاکر صاحب کی زندگی سے تھا، ان کی شخصیت سے تھا۔ کشمیر کے منظر و پس منظر میں بھی انھوں نے کئی ناول اور افسانے لکھے۔ ظاہری بات ہے کوئی بھی فنکار جبھی ان موضوعات و مسائل پر قلم اٹھاتا ہے یا کسی علاقے کے ماحول، تہذیب و ثقافت، کلچر، سوسائٹی اور طرز زندگی پر روشنی ڈالتا ہے جب کہ وہ خود اس ماحول کا حصہ یا فرد رہا ہو نیز وہ منظر و مسائل اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوں۔ اور پھر ذاکر صاحب کے فن کا تعلق تو ہمیشہ ادب برائے ادب نہ ہو کر ادب برائے زندگی رہا۔ ان کا ایسا کوئی ناول یا تخلیق نہ ہوگی جس میں مقصدیت و پیغام نہ ہو وہ ماورائیت یا خواب و خیال کی دنیا سے بعید تھے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کشمیری لال ذاکر مختلف کرداروں کے توسل سے اپنی تخلیقات میں خود چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اس طرح ان کی تخلیقات کے حوالے سے بھی ذاکر صاحب کی شخصیت کو سمجھا اور پہچانا جا سکتا ہے۔ کشمیر اور پنجاب کے کلچر اور سوسائٹی کو انھوں نے بہت قریب سے دیکھا۔ وہ کشمیر میں جوان ہوئے اور پنجاب میں پوری زندگی بسر کی۔ کشمیر کے اُس ماحول کو بھی انھوں نے بہت قریب سے دیکھا جس کی بنیاد سرمایہ دارانہ نظام پر قائم تھی۔ جس کا ذکر انھوں نے افتخار امام صدیقی کو دیے گئے انٹرویو میں یوں کیا ہے:

''دوسری طرف وہ بھاری اکثریت تھی جن کی حیثیت بے زبان، بے حس کٹھ پتلیوں جیسی تھی جو اپنے آقاؤں کے ہر حکم پر لبیک کہنے کو ہمہ وقت تیار یا مجبور تھی۔ حاکم و محکوم، جابر و مجبور کی یہ تقسیم انصاف پر مبنی نہیں ہو سکتی۔ یہ میرے اندر کی آواز تھی اور میرے دل میں یہ جذبہ بھی تھا کہ اس نظام کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ میں نے اس کا گھناؤنا روپ دیکھا تھا۔ لوگوں کی پیٹھ پر برستے کوڑے، ٹکٹکی پر الٹے لٹکتے لوگوں پر پولس مظالم۔ یہ سب کچھ مجھے غلط معلوم ہوا۔ لہٰذا میں ایک ذہنی اضطراب و بے چینی کا شکار ہو گیا۔''

(بحوالہ: شاعر جون 2011 صفحہ نمبر 12)

کشمیر اور کشمیریت کو انھوں نے اپنے ناول 'آدھے چاند کی رات' اور اپنے افسانے 'جب کشمیر جل رہا تھا' میں بڑے مؤثر اور فنی زاویوں کے ساتھ پیش کیا۔ پہلے چنڈی گڑھ اور پھر پنجاب سے الگ ہو کر ہریانہ صوبہ وجود میں آیا۔ ذاکر صاحب تاحیات چنڈی گڑھ میں مقیم رہے۔ چنڈی گڑھ اپنے آپ میں بہت ایڈوانس شہر ہے۔ فیشن اور مغربی کلچر کا موجد۔ ذاکر صاحب نے چنڈی گڑھ کو گربھ سے لے کر جوان ہونے تک اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اپنے سامنے تین نسلوں کو پروان چڑھتے ہوئے دیکھا اور وہ سب کچھ دیکھا جو اس شہر میں موڈرنٹی کے نام، کلچر کے نام پر ہوتا ہے۔ نیز اس ماحول سے متاثر ہو کر انھوں نے 'ایک شہر ایک محبوبہ' اور 'میرا شہر ادھورا سا' دو ناول اردو ادب کے دامن میں پیش کیے۔ ان ناولوں کے توسل سے ذاکر صاحب کے تفکرات و خیالات اور احساسات و جذبات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ نیز اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں وہ چنڈی گڑھ کو کیسا محسوس کرتے ہیں اور اس شہر کی ابھرتی ہوئی تہذیب و ثقافت کو کس حد تک درست ٹھہراتے ہیں۔

کشمیری لال ذاکر ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک ناول نگار، خاکہ نویس، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار اور شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ وہ آخری ایام تک اردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروف کار رہے۔ اگرچہ وہ عمر کے اعتبار سے بوڑھے ہو گئے تھے مگر جسمانی و ذہنی اعتبار سے وہ بوڑھے نہیں تھے۔ تبھی تو وہ نوے برس تجاوز کرنے کے بعد بھی مسلسل خامہ فرسائی کرتے رہتے تھے۔ اپنی طویل زندگی کے تجربات و مشاہدات کو انھوں نے افسانے، ناول یا دیگر اصناف ادب کے حوالے سے صفحۂ کاغذ پر رقم کر دیا ہے۔ کشمیری لال ذاکر جتنے اچھے افسانہ نگار، ناول نگار اور خاکہ نگار تھے

اتنے ہی اچھے وہ شاعر بھی تھے۔ ان کی شاعری کو خالص رومانیت سے تعبیر کریں تو بے جا نہ ہوگا کیوں کہ ذاکر صاحب خود ایک رنگین مزاج اور بذلہ سنج انسان تھے۔ ان کی شاعری خالص رومان پرور فضا پر محمول ہے۔ غزلوں کا مجموعہ 'شیشہ بدن خواب' ہو یا قطعات کا مجموعہ 'عکسِ رخِ گلبدن' دونوں مجموعوں میں ان کی رنگین مزاجی، رومانویت اور جمالیات جلوہ گر ہے۔ ان کی شاعری کو پڑھ کر یہ اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ ان کا اندازِ بیان، طرزِ تکلم اور شعری رچاؤ بساؤ اپنے ہم عصر شعراء سے مختلف تھا۔ وہ جو بات، خیالات، جذبات اور احساسات شعری سانچے میں ڈھالتے تھے اس سے نئے زاویوں اور وجدان کا جنم ہوتا تھا۔ جس کے باعث ان کی شعری کائنات نیز غزلیں اور قطعات الگ نوع کا لطف دیتے ہیں۔ اکثر وہ غزلیں وہ ہمیشہ پڑھا کرتے تھے شاید وہ ان کو سب سے زیادہ محبوب ہوں۔ بطور نمونہ آپ بھی ان کے دو دو شعر ملاحظہ فرمائیں:

جئیں گے تازہ گلاب بن کر، یہ طے ہوا تھا
مریں گے خوشبو کا خواب بن کر، یہ طے ہوا تھا
پڑھوں گا تم کو، لکھوں گا تم کو، یہ فیصلہ تھا
رہوگے میری کتاب بن کر یہ طے ہوا تھا

ہمیں تو اپنا فسانہ سنا نا ہو تا ہے
تمہارا ذکر تو بس اک بہانا ہو تا ہے
لٹکنا ہوتا ہے، خود ہی وفا کی سولی پر
پھر اپنی لاش کو، خود ہی اُٹھا نا ہو تا ہے

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ذاکر صاحب ہمیشہ گلاب کی طرح تازہ دم، ہشاش بشاش، تندرست اور توانا رہے اور جب دنیا سے رخصت ہوئے تو اسی شان سے رخصت ہوئے یعنی خوشبوئیں لٹاتے ہوئے۔

بات چاہے ذاکر صاحب کی شاعری کی ہو یا افسانہ نگاری کی یا ناول نگاری کی یا خاکہ نگاری کی انھوں نے ہر صنفِ ادب میں اپنی قابلیت، صلاحیت، ذہانت و فطانت اور فنی جودتوں کا لوہا منوایا ہے۔ افسانہ نگاری میں بھی ان کا پایہ اتنا ہی مسلم و مستحکم ہے جتنا ناول نگاری میں۔ افسانوی ادب میں انھوں نے جب کشمیر جل رہا تھا (1948)، ایک کرن روشنی کی (1978)، اداس شام کے آخری لمحے (1979)، بیریوں والا فقیر (1984)، چنار چنار چہرے (1994)، برف دھوپ، چنار (2005)، سمندری ہواؤں کا موسم (2005)، تجھے ہم ولی سمجھتے (2007) مجموعات سے نوازا۔

ذاکر صاحب کی کہانیوں میں نادر تشبیہات واستعارات اور اشارے کنائے کو بڑا دخل حاصل ہے، جس کے موجب ان کے فن میں گیرائی، گہرائی اور داخلیت کا عنصر تحلیل ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ جو بات قاری تک پہنچانا چاہتے ہیں، اپنے مختص الفاظ اور استنباطی عمل، اندازِ بیان اور اسلوبِ نگارش سے پہنچا دیتے ہیں۔

سندور کی راکھ (1955) میں منظرِ عام پر آیا یہ ذاکر صاحب کا ایک طرح کا سوانحی ناول ہے جو انھوں نے اپنی اہلیہ کی موت سے متاثر ہو کر قلمبند کیا تھا اور یہیں سے کشمیری لال ذاکر کی ناول نگاری کا بھی آغاز ہوتا ہے۔ انگوٹھے کا نشان (1978)، ایک لڑکی بھٹکی ہوئی (1979) میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا جو نوجوانوں کے مسائل پر ایک بہترین ناول ہے۔ خون پھر خون ہے (1979) ایک تاریخی ناول ہے، دھرتی سدا سہاگن (1980)، بھودان آندولن پر مشتمل ناول ہے جو اپنے اندر بہت تاثیر اور معنویت لیے ہوئے ہے۔ کھجوراہو کی ایک رات (1980)، یہ بھی ایک تاریخی ناول ہے جس میں ذاکر صاحب نے اپنے تجربات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ایک شہر ایک محبوبہ (1980) ناول میں چنڈی گڑھ کی تہذیب و ثقافت کو فنی نقطہ نگاہ سے دکھانے کی کوشش کی ہے۔ تین چہرے ایک سوال (1981)، ناول مزدوروں کی زندگی کی نمائندگی کرتا ہے۔ لمحوں میں بکھری زندگی (1982)، جیسا کہ اس کے نام سے ہی ظاہر ہے۔ یہ ناول عورتوں کے مسائل اور ان کی زندگی کے نفسیاتی پیچ وخم کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ جاتی ہوئی رُت (1983)، ناول میں ہندوستانی سوسائٹی میں عورت کا کیا مقام ہے اس پہلو کو پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ ڈوبتے سورج کی کتھا (1984)، میں بوڑھوں کے مسائل پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی (1993)، یہ ناول بھوپال گیس المیہ پر مشتمل ایک دردانگیز ناول ہے۔ میری شناخت تم ہو (1994)، میں سورت میں پلیگ کی بیماری سے متاثر ہو کر لکھا گیا ناول ہے۔ لیکن 'کرماں والی' (1980) اور 'آخری ادھیائے (2008)' ان دو ناولوں کے باعث ذاکر صاحب کو ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ 'کرماں والی' کو متعدد بار اسٹیج کیا گیا۔ اس ناول میں بٹوارے کے درد کو بہت ہی نفسیاتی، سیاسی اور سماجی اعتبار سے مرتسم کیا گیا ہے۔ خواجہ احمد عباس 'کرماں والی' کے تعلق سے یوں رقم طراز ہیں:

''مرحوم کرشن چندر کی طرح کشمیری لال ذاکر بھی جذباتی طور پر انسانیت کے پجاری ہیں، انھیں بھی انسانیت کی عظمت پر اٹوٹ بھروسا ہے۔ یہ بھروسا اور یقین ان کے ناول کے ہر پنے سے جھلکتا ہے۔

''کاش! اس ناول کو علی گڑھ اور مراد آباد کے ہی نہیں بلکہ سارے ہندوستان کے ہندو اور مسلمان پڑھیں اور اس سے کچھ سیکھیں۔ کرماں والی' کہانی ساری انسانیت کی کہانی ہے۔ امید اور آشا کی کہانی ہے جو نئی بھی ہے اور پرانی بھی۔ بہت پرانی۔ کشمیری لال ذاکر نے یہ ناول قلم میں روشنائی بھر کر نہیں بلکہ انسانیت کو آنسوؤں سے روشنائی کا کام لے کر لکھا ہے۔''

آخری ادھیائے، ناول ایڈز کے موضوع پر شاید اردو ادب میں پہلا ناول ہے۔ اس طرح ان کی کائنات ناول کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہیں لگتی ہے کہ انھوں نے لگ بھگ ان سبھی موضوعات و مسائل پر قلم اُٹھایا جن کا تعلق حقیقی واقعات وحادثات سے رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کینوس وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے جس کا احاطہ کرنا اتنا سہل کام نہیں ہے۔

ذاکر صاحب خاکہ نگاری میں بھی جواب نہیں رکھتے۔ انھوں نے خاکوں کے پانچ مجموعے سپردِ قلم کیے۔ جن میں اپنی ہواؤں کی خوشبو (1992)، نئی صبحوں کے سفیر (1994)، درد آشنا چہرے (1998)، نگینہ بیکری کا قلندر (1999)، یاران تیز گام (2006) شامل ہیں۔ ان خاکوں میں انھوں نے اپنے معاصر ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کے حالات قلم بند کیے ہیں۔ تین ڈرامے بعنوان 'نیا سویرا (1962)، 'ہمسایہ' (1968)، اور سلاخ ٹوٹتی ہے (1996) رقم کیے اور ایک سفرنامہ 'یہ صبح زندہ رہے گی (1997) رقم کیا جو پاکستان کے سفر سے متعلق ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ذاکر صاحب کا قلم بوڑھا نہیں ہوا تھا۔ وہ مرتے دم تک اردو ادب کی خدمت میں مصروف رہے۔ جب ہم ذاکر صاحب کے تعلق سے پورے ادبی منظرنامے پر نظر ڈالتے ہیں تو نہ جانے کیوں یہ احساس ابھر کر آتا ہے کہ اتنی کتابوں کا مصنف ہونے کے باوجود بھی ذاکر صاحب کو ادب میں وہ مقام و مرتبہ نہیں ملا جس کے وہ حقدار تھے۔ فکشن کی تنقیدی تاریخ کو جب ہم کھنگالتے ہیں تو ذاکر صاحب کہیں پر بھی نظر نہیں آتے۔ کوئی ان کا ذکر نہیں کرتا۔ ہاں اب پچھلے چند برسوں سے ضرور ان کا ذکر کیا جانے لگا ہے۔ کئی یونی ورسٹیوں نے ذاکر صاحب پر تحقیقی کام بھی کیے ہیں۔ جن میں پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ، عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد، کشمیر یونیورسٹی سری نگر، ساگر یونیورسٹی مدھیہ پردیش، دہلی یونیورسٹی دہلی اور چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ شامل ہیں۔ ہمیں ایسے فکشن نگار پر کام کرنے کی ضرورت ہے جس نے ساری عمر اردو ادب کی خدمت میں صرف کردی۔

■

Dr. Mohd Mustamir
Haryana Urdu Akademy,
IP 16, Sector 14, Panchkula - 134113 (Haryana)

اظہر ابرار

شمیم نکہت

خوشبو جیسی شخصیت

یادِ رفتگاں

شمیم نکہت جیسی خوشبو شخصیت بھی اس دنیا سے چل بسی اور اپنے پیچھے کہانیوں کی معطر دنیا چھوڑ گئی۔ ان کی کہانیوں میں ان کی ذات، صفات کی خوشبوئیں بسی ہوئی ہیں۔

ممتاز فکشن نگار جوگیندر پال نے ان کی کہانیوں کے متعلق کہا تھا ''شمیم نکہت کی نہایت مناسب ماجرا سازی نے مجھے خاص طور پر ان کی کہانیوں کی طرف متوجہ کیا ہے۔ دو آدھے کی سبھی کہانیاں مصنفہ کی خود پارسائی کے عناصر کو ہوا دینے کی بجائے نمایاں طور پر وارداتی ہیں اور ہمارے روزمرہ کے تلازموں سے بے ساختہ جڑ کر گویا ہم پر بیت جاتی ہیں۔ شمیم نکہت نے ان کہانیوں میں بجا طور پر اپنی دیکھی بھالی محدود زندگی کے مناظر پر اکتفا کیا ہے۔''

ڈاکٹر شمیم نکہت کی کہانیوں میں جو بات سب سے زیادہ متاثر کن ہے وہ دنیا کے بڑے مسائل نہیں بلکہ ایک عام زندگی کے محدود دائرے میں آئی ہوئی الجھنیں ہیں بھلے ہی وہ دوسروں کے لیے چھوٹی ہوں لیکن کئی بار ان کا حل تلاش کر پانا عام لوگوں کے لیے مشکل کا سبب بن جاتا ہے۔ یہ عام زندگی کے کردار روزمرہ میں کئی بار پریشاں حال رہتے ہیں اور کبھی خود ہی مشکلات سے باہر بھی نکل آتے ہیں۔ شمیم نکہت کا گردو پیش اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ قاری حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ ان کہانیوں میں عورتیں، لڑکیاں، پاگل، مزدور پیشہ، نوکرانیاں، لکھنؤ کا رچا بسا ماحول، دہلی کی گلیاں، چوراہے، گاؤں کے چوپال، لہلہاتے کھیت کھلیان کیا کچھ موجود نہیں ہوتا گویا ہندوستان کی ایک ملی جلی تہذیب کی عکاسی نظر آتی ہے۔ ان کے افسانوں میں بیانیہ غضب کا ہوتا ہے اور اس لیے بھی نسائی کرب کی چبھن واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے، جس طرح انھوں نے اپنی کتاب 'پریم چند کے ناولوں میں نسائی کردار' تصنیف کی اور اس میں عورت کی پیڑا کو بخوبی سمجھایا۔

پروفیسر قمر رئیس نے شمیم نکہت کی تخلیقی دنیا کے بارے میں کچھ اس طرح رائے دی: ''شمیم کی کہانیوں میں نئے احساس و شعور کے ساتھ ساتھ ان انسانی قدروں کا عرفان بھی ہے جو انھیں عزیز ہیں اور جو ان کے تخلیقی ہنر کا ایک متحرک حصہ بن گئی ہیں۔ انھوں نے ترقی پسند افسانہ کی توانا روایت سے فیض ہی نہیں اٹھایا اسے آگے بھی بڑھایا ہے۔ اسے بدلتی ہوئی زندگی کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ بنایا ہے۔''

عورت کا درد شمیم نکہت کے افسانوں میں بخوبی عیاں ہوجاتا ہے انھوں نے عورت کے ہر روپ کو پیش کیا۔ ان کے افسانے 'انصاف' میں ایک ایسی عورت پیش کی گئی جو اتنی لاچار ہے کہ اس کا شوہر ظلم کرتا جارہا ہے اور اس سے اس کے پانچ سالہ بچے کو چھین لینا چاہتا ہے۔ قانون، دھرم، سماج سب اس ابلا کا تماشہ دیکھتے ہیں اور ایک ماں ان سب سے ہار جاتی ہے۔ 'ممتا کا کرب' الگ نوعیت کی کہانی ہے۔ اس میں 'منی' پہلے ہی ذہنی طور پر کمزور تھی لیکن اس کو اس وقت اور بھی زیادہ صدمہ پہنچا جب اس سے اس کے بچے چھین لیے گئے۔ یہاں ایک عورت جسے ماں کہلانے کے حق سے محروم کردیا گیا وہ یہی سوچتی رہی کہ بچے اسے 'ماں' کہہ کر پکاریں۔ ''پہلی بار جب رنجنا نے اسے آنٹی کہا تو اس کے تالو سے زبان چپک گئی، اس کے کانوں سے شعلے ابل رہے تھے، وہ کانپ گئی، پھر بیتا نے توتلی زبان سے مامی کو ممی اور اس کو بوا کہہ دیا۔ وہ اور گہرے کنوئیں میں اترتی چلی گئی۔ اس کے چاروں طرف کانٹے دار جھاڑیاں اگ آئیں۔'' دنیا میں کسی بھی ماں کے لیے اس سے بڑا کرب اور کیا ہوسکتا ہے کہ اس کے اپنے بچے ہی اسے ماں نہ کہیں۔

''اب مجھے دمینتی کچھ اور بڑی بلکہ بونے قد کی عورت لگنے لگی، معصوم گڑیا جس کے اندر ذمہ دار عورت دونوں چھپے ہوئے تھے، وہ کماتی تھی اور ماں کو کھلاتی تھی۔''

شمیم نکہت نے افسانے 'وہ' میں ایک ایسی لڑکی کے کردار کو ابھارا ہے جو دوسروں کے گھروں میں کام کرکے اپنا اور اپنی بوڑھی ماں کا پیٹ بھرتی ہے۔ یہ لڑکی دمینتی ایک جفاکش ہے جس کے اندر احساس ذمے داری اس درجہ موجود ہے کہ شوہر کو مہلک بیماری لاحق ہونے کے باوجود اس سے ترک تعلق نہیں کرتی جبکہ دونوں کی عمروں میں اٹھارہ برس کا فرق ہے۔ 'سودا' اس افسانے میں افسانہ نگار نے ان عورتوں کا ذکر کیا جو مردوں کے دھوکے کا شکار ہوجاتی ہیں اور وہ انھیں بازاروں کی زینت بنا دیتے ہیں۔ بازار میں بیٹھی ان عورتوں میں سے 'پارو' بھی ایسے ہی ایک بھیڑیے 'رمیش' کے دھوکے کا شکار ہوئی تھی جس نے محبت کے نام پر دغابازی کی اور اسے شہر کے سفید پوش بھیڑیوں کے لیے نوچنے کا سامان بنا دیا۔ ہندوستانی سماج میں عورت کی حالت اس درجہ بگڑ چکی ہے کہ اسے اپنے شوہر کو دوسری شادی کی اجازت دینے کے بعد بھی ناراض ہونے کا حق نہیں اس کے باوجود وہ تمام ذمے داریوں کو راضی بخوشی نبھائے چلی جاتی ہے۔ ایسا ہی کردار ہمیں 'ثروت آپا' کے روپ میں نظر آیا۔ 'وہ لمحہ' اس افسانے کی اثر انگیزی آخری سطور تک قارئین کو باندھے رکھتی ہے کیونکہ اس لڑکی کا دل اتنا نرم ہے کہ وہ ایک مسافر کو اپنا ہمسفر قبول کرلیتی ہے۔ یہاں افسانہ نگار نے عورت کی محبت کے ایک نئے پہلو کو ظاہر کیا۔ وہ ایک لمحے میں اس مسافر کو دل دے بیٹھتی ہے لیکن جب اس نوجوان کی آواز لڑکی کے کانوں میں آکر جم جاتی ہے تو حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے ''معاف کیجیے گا۔ زندگی

دو پہیوں پہ چلتی نہیں، ٹھہر جاتی ہے۔ بار بار میں نے یہی سبق سیکھا ہے اور پھر ایک بھورا سا کمبل کندھے پر سنبھال کر وہ کھڑا ہوا۔ گھٹنوں کے بیچ دبی بیساکھیوں کو گھسیٹتا اور کھٹا کھٹ کرتا۔ آہستہ آہستہ بس سے رینگ گیا۔ اس کا ہاتھ ہوا میں لہرایا روکنے کے لیے لیکن ہل نہ سکا۔''

ہندوستانی سماج میں آج بھی ودھوا ہونا ایک کلنک سمجھا جاتا ہے پھر مذہبی عقائد کی پابندی اس عورت پر اس قدر اثر انداز ہوتی ہے کہ اس کی ساری امنگیں، آرزوئیں، خواہشات اور احساسات کو ختم کر کے رکھ دیتی ہے اور وہ اسی کو اپنا 'بھاگیہ' سمجھ کر خود کو یوں محسوس کرتی ہے گویا وہ کوئی شراپ ہو۔ افسانہ نگار نے اپنے مجموعے 'دو آدھے' میں مہوہ اس عورت کا کردار پیش کیا جسے محبت کرنے کا بھی حق نہیں اور جب چوری چھپے وہ رگھو سے شادی کر کے کچھ دن خوشی سے رہ لیتی ہے تو گاؤں والوں کو یہ بات بڑی ناگوار گزرتی ہے۔ یہاں پر افسانہ نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ بیواؤں کے ساتھ کس طرح ناروا سلوک بڑھتا جا رہا ہے ایک موقع پر مہوہ اپنی قسمت کے بارے میں کہتی ہے ''میرا بھاگیہ ہی ایسا ہے۔'' رگھو نے چڑ کر کہا۔ ''مہوہ! '' بھاگیہ ہوتے نہیں بنا دیے جاتے ہیں۔'' اور مہوہ نے سہتے ہوئے کہا۔ ''رگھو۔ میں ودھوا ہوں۔ تیری بہن لگتی ہوں۔ کیا تو سمجھتا ہے سماج تیرا کہا مان لے گا۔''

افسانہ نگار کے گہرے مشاہدے نے سماج سے ایک نسائی کردار ذکیہ کا انتخاب کیا وہ ان لاکھوں عورتوں کی نمائندگی کرتی ہے جو دنیا میں خراب حالات کا شکار ہو کر بالکل اکیلے رہ جاتے ہیں اور ان کے قریبی رشتے بھی بڑے طویل فاصلوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ذکیہ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا وہ زندگی کے جس موڑ پر آج کھڑی ہے وہاں اس کے پاس تنہائی کے سوا اور کوئی ساتھی موجود نہیں۔ بھولی بسری یادیں اس کا دل بہلا رہی ہیں۔ بچپن کا زمانہ بھائی بہنوں کی شرارتیں اسے بے چین کر دیتی ہیں اور یہ عورت اپنے وجود کو بکھرنے سے کسی طرح بچانے کی کوشش میں مصروف ہے۔

افسانہ نگار نے اپنے افسانوں میں ان عورتوں کو بھی جگہ دی ہے جو اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتی ہیں۔ ایسی عورتوں کی دماغی حالت اس وقت اور خراب ہو جاتی ہے جب وہ مسخرے پن کا سامان بن جاتی ہیں۔ اسی طرح کی ایک 'پگلی' عورت جسے سب چاچی چاچی کہہ کر چڑاتے تھے اور اسے پتھر کنکر مار کر خوش ہوتے تھے لیکن کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ آخر وہ پاگل کیوں ہوئی جبکہ ماضی میں اس کے دو بچے ایک حادثے کا شکار ہو گئے تھے۔ حادثے

مجھے اساتذہ بھی رضیہ سجاد ظہیر اور احتشام حسین جیسے ملے جنھوں نے مجھے ادبی دنیا سے متعارف کرایا اور جن کی رہنمائی میں میں نے صرف کہانیاں ہی لکھنی نہیں سیکھیں بلکہ زندگی کو پہنچانا اور مشکلوں سے لڑنا سیکھا۔ انہی لوگوں سے میں نے ترقی پسندی کو سمجھا اور غیر شعوری طور پر وہی عناصر میری تحریر کا حصہ بنتے گئے۔ میں شدت پسند کبھی نہیں رہی لیکن صدیوں سے عورتوں پر ہونے والے مظالم اور ناانصافیوں کے خلاف میرا قلم ہمیشہ سے اٹھ جاتا ہے، میری کہانیوں کا عام موضوع عورت ہے۔''

کا صدمہ اسے اتنا گہرا ہوا تھا کہ وہ پگلی ہو گئی۔ یہاں پر افسانہ نگار نے اس عورت پر سماج کے ذریعے کیے جا رہے ظلم و بربریت کو بیان کیا کہ ہمارا مہذب طبقہ، اخلاق و کردار کا علمبردار یہ سماج ایک ایسے انسان کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتا جو دنیا کے لیے بیکار ہو چکا ہے اور جس کا ہونا نہ ہونا یہاں ہر کسی کے لیے اتنا ہی غیر اہم ہو جاتا ہے جتنا کہ کسی مرے ہوئے انسان کی لاش کا پڑا ہونا۔

پروفیسر شمیم نکہت نے ایک جگہ لکھا تھا ''مجھے اساتذہ بھی رضیہ سجاد ظہیر اور احتشام حسین جیسے ملے جنھوں نے مجھے ادبی دنیا سے متعارف کرایا اور جن کی رہنمائی میں میں نے صرف کہانیاں ہی لکھنی نہیں سیکھیں بلکہ زندگی کو پہنچانا اور مشکلوں سے لڑنا سیکھا۔ انہی لوگوں سے میں نے ترقی پسندی کو سمجھا اور غیر شعوری طور پر وہی عناصر میری تحریر کا حصہ بنتے گئے۔ میں شدت پسند کبھی نہیں رہی لیکن صدیوں سے عورتوں پر ہونے والے مظالم اور ناانصافیوں کے خلاف میرا قلم ہمیشہ سے اٹھ جاتا ہے، میری کہانیوں کا عام موضوع عورت ہے۔''

اس مختصر سے اقتباس میں بڑی گہری باتیں پوشیدہ ہیں صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو پروفیسر شمیم نکہت کا افسانوی مجموعہ 'دو آدھے' میں تین چوتھائی افسانے صرف عورتوں کی زبوں حالی پر مبنی ہیں اور ان کی فکر ان کہانیوں پر صد فی صد صادق بھی آتی ہے۔ ان افسانوں میں کہیں کوئی عورت انصاف کے لیے ترس رہی ہے تو کوئی اپنے بچوں کے لیے ممتا کے کرب میں مبتلا ہے، کوئی غریب لڑکی گھروں میں خادمہ بن کر گزارا کر رہی ہے تو کسی نے محبت کے نام پر عورت کو بازار میں بیٹھا دیا۔ اور کوئی بھائی اپنے بھائی سے جدا ہو کر اپنے آپ کو آدھا محسوس کر رہا ہے۔

ثروت آپا، گلشن بوا، بی مغلانی ایسے کردار ہیں جو خدمت خلق کے ذریعے روحانی سکون محسوس کرتے ہیں۔ یہ بات افسانوں کے تعلق سے کہی جاتی رہی ہے کہ افسانے انکشاف ذات ہوتے ہیں۔ پروفیسر شمیم نکہت کا کردار بھی ان افسانوی کرداروں میں ڈھلا ڈھلا سا محسوس ہوا اسی بات کی توسیع کرتے ہوئے ڈاکٹر ریشماں پروین نے ان کے متعلق کتنی سچی بات کہی ''آپا کی سب سے بڑی خوبی ان کی انسانیت تھی۔ پچھلے دس بارہ برس میں 'میں' نے ان کو نہ جانے کتنے لوگوں کی مدد کرتے دیکھا۔ کبھی کسی کی شادی تو کبھی کسی کی پڑھائی۔ میرے سامنے کتنی ہی لڑکیاں ان کے گھر میں رہ کر تعلیم حاصل کر کے چلی گئیں اور خوش خوش اپنی کامیاب ازدواجی زندگی گزار رہی ہیں۔'' پروفیسر شمیم نکہت عورتوں کو ملنے والے حقوق سے مطمئن نہیں تھیں وہ اندر ہی اندر کڑھتی تھیں اور آزادی نسواں پر دی جانے والی مراعات کو ایک پروپیگنڈا کہتی تھیں کہ عورت کو بازار کی چیز بنا دیا گیا۔ وہ ادب میں بھی عورتوں کے وجود کی عدم شمولیت پر نالاں رہیں۔ وہ کہتیں تھیں ''آج کا بیشتر نسائی ادب احتجاجی ادب ہے اور اس کا بہت کم حصہ تخلیقی فکر کا جز بن سکا ہے۔''

افسانہ 'وہ' میں پروفیسر شمیم نکہت صاحبہ نے اپنی بیٹی شعاع کا ذکر کیا تھا یہ ان کی وہی لاڈلی بیٹی تھی جس میں کبھی ان کی جان بستی تھی اور اس کی موت کا صدمہ ان پر اتنا گہرا ہوا کہ وہ اس سے عمر بھر ابھر نہ سکیں۔ اپنی پیاری بیٹی کی یاد میں انھوں نے شعاع فاطمہ گرلس انٹر کالج قائم کیا جہاں وہ غریب بچوں کی کفالت کیا کرتی تھیں ان کے شوہر اور اردو زبان کے معروف نقاد پروفیسر شارب ردولوی نے اپنی بیوی کا ہر قدم بخوبی ساتھ نبھایا۔ پروفیسر شمیم نکہت صاحبہ مہمان نوازی میں بھی لاجواب تھیں۔ معروف افسانہ نگار رتن نے پروفیسر شمیم نکہت صاحبہ کے لیے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کیا خوب کہا کہ ''ڈاکٹر شمیم نکہت کے جانے کے بعد اور سکڑ گئی ادبی دنیا'' واقعی یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ پروفیسر شمیم نکہت کی نہ صرف تصانیف بلکہ ان کی عملی زندگی بھی نسائی شعور کی آئینہ دار ہے۔

■

Dr. Azhar Abrar Asstt. prof. & Head Dept of Urdu. S.K. Parwal College, Kamptee, Distt. Nagpur - 441002 (MS)
Mob.:9970284175
E-mail.: azhar_abrar@rediffmail.com

پیغام آفاقی...

تعمیری کردار کا شخص اور فکشن نگار

جاوید احمد مغل

پیغام آفاقی موجودہ دور کے ایک منفرد فکشن نگار ہیں۔ وہ ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں۔ اُردو زبان کے علاوہ ہندی اور انگریزی زبان سے بھی گہری واقفیت رکھتے ہیں جس کا واضح ثبوت ان کی تخلیقات ہیں۔ پیغام آفاقی ایک خوش طبع اور اعلی شخصیت کے مالک ہیں جو زندگی کے اہم ترین مسائل کی تصویر کشی ایک ذمے دار ادیب اور انسان دوست ناول نگار کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ پیغام آفاقی نے سیاسی، سماجی، معاشی، اقتصادی اور نفسیاتی مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے ناولوں کے ساتھ ساتھ افسانے بھی لکھے اور تقریباً یہی مسائل ان کے افسانوں میں بھی نظر آتے ہیں۔

پیغام آفاقی کا اصل نام اختر علی فاروقی تھا لیکن ادبی دنیا میں وہ پیغام آفاقی کے نام مشہور ہوئے، جبکہ گھر میں انھیں اختر کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ پیغام آفاقی کی پیدائش ان کے آبائی گاؤں بہار کے ضلع (سیوان) چانپ میں 6 فروری 1953 کو جمعہ کے دن نمازِ عصر کے آخری لمحوں میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام شیخ عبدالجبار فاروقی تھا، جن کا ادب سے تعلق محض قاری ہونے تک محدود تھا۔ اُن کی والدہ محترمہ کا نام وظیفۃ النساء بیگم ہے۔ جن کی عمر بانوے سال ہے لیکن صحت مند اور بقید حیات ہیں۔ پیغام آفاقی کے دادا کا نام شیخ علی جان تھا۔ اُن کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔

پیغام آفاقی کی ابتدائی تعلیم پہلے گھر میں ہی شروع ہوئی، اس کے بعد وہ گاؤں کے ایک بزرگ عبدالرحیم عرف میاں جی سے درس لیتے رہے۔ پھر گاؤں کے ایک مکتب میں داخلہ لیا۔ تیسرے درجے تک انھوں نے وہیں تعلیم حاصل کی، جہاں مختار حسین اُن کے استاد رہے۔ چوتھے درجے میں سیوان کے اسلامیہ مڈل اسکول میں داخلہ لیا۔ یہاں سے انھوں نے چوتھی اور پانچویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔ چھٹی جماعت سے ہائرسکنڈری تک کی تعلیم D.A.V ہائرسکینڈری اسکول سیوان سے حاصل کی۔ ہائرسکنڈری میں اُن کا بنیادی مضمون Biology تھا، اس کے ساتھ Physics اور Chemistry بھی ان کے مضامین تھے۔ 1971 میں پیغام آفاقی نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں داخلہ لیا۔ یہاں سے انھوں نے بی۔اے آنرز انگریزی ادب کے ساتھ پاس کیا اور اس کے ساتھ اُردو ادب اور پولیٹیکل سائنس اُن کے اضافی مضمون تھے۔ 1975 میں آفاقی نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے ہی History میں ایم اے کیا۔ ایم۔اے میں Medieval India اور اسلامی تاریخ اُن کے خصوصی مضامین تھے۔

1976 میں وہ آئی۔اے۔ ایس کے امتحان میں شریک ہوئے اور تحریری امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ عمر کم ہونے کی وجہ سے انٹرویو میں شریک ہونے کے باوجود اُن کا رزلٹ روک دیا گیا مگر بعد میں اُن کو محکمۂ پولیس میں شامل کرلیا گیا۔

1978 میں اُنھوں نے ملازمت اختیار کی، ایک سال کی ٹریننگ کے بعد اُن کی پوسٹنگ جزائر انڈومان نکوبار میں ہوئی۔ جہاں وہ تقریباً ساڑھے چار سال تک رہے۔ اُس زمانے میں انھوں نے چار طویل خط اپنے دوست غضنفر کو لکھے جو ناول نگار ہیں جس کو انھوں نے آگے چل کر اپنے ناول 'فسوں' میں شامل کیا۔ اس کے بعد پیغام آفاقی کا تبادلہ انڈومان نکوبار سے دہلی ہوا۔ اُن کی پوسٹنگ کئی دوسری جگہوں پر بھی ہوتی رہی۔ ملازمت کے دوران وہ مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ جن میں Supreme Court, Traffic crime, Anti Sikh Riot Anti Air craft corruption cell اور پرنسپل پولیس ٹریننگ دہلی پولیس وغیرہ شامل ہیں۔ پیغام آفاقی گذشتہ تین دہائیوں سے مستقل طور پر دہلی پولیس میں ایک سینئر پولیس آفیسر کی خدمات انجام دے رہے تھے۔

پیغام آفاقی کو کم عمری سے ہی ادب سے گہری دلچسپی تھی طالب علمی کے زمانے میں اُنھوں نے نظمیں لکھنی شروع کیں۔ اُن کی پہلی نظم بچوں کے ماہنامہ مسرت، پٹنہ سے 1968 میں شائع ہوئی۔ ان دنوں اس کے اڈیٹر قدوس جاوید تھے۔ اس کے بعد انھوں نے کئی نظمیں لکھیں۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی پر اُن کی ایک نظم اخبار سیاست (کانپور) 1972 میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد چند نظمیں ماہنامہ (تحریک) دہلی سے شائع ہوئیں۔

پیغام آفاقی نے طالب علمی کے زمانے سے لے کر 1972 تک کا بیشتر وقت شاعری میں گزارا۔ اس کے علاوہ انھوں نے کئی افسانے بھی لکھے جن میں (تلاش) ماہنامہ (تحریک) سفید خون (آہنگ) لوہے کا جانور رسالہ (آجکل) دہلی میں اور ناریل کا پیڑ وغیرہ اُن کی ابتدائی تحریروں میں شامل ہیں۔

1973 سے 1975 کے دوران پیغام آفاقی نے اپنا پہلا ناول 'راگنی' کے نام سے لکھا جو غیر مطبوعہ ہے۔ لیکن اس کی مقبولیت سے اُن کی خود اعتمادی میں اضافہ ہوا، کیونکہ اس کے قلمی نسخے کو ایک سو سے زائد لوگوں نے پڑھا تھا۔ اس ناول کا موضوع بہار میں پھیلتا ہوا کرائم تھا۔ اس کے بعد بھی انھوں نے کئی افسانے لکھے جن میں کوآپریٹو سوسائٹی، قطب مینار، چیتل کی بالٹی، کے علاوہ 1985-86 میں کئی دیگر افسانے ریڈیو پر نشر کیے گئے۔

1989 سے 2011 کے عرصے میں پیغام آفاقی نے اُردو ادب کو دو شاہکار ناول عطا کیے۔ اُن کا مشہور ناول 'مکان' 1989 میں منظر عام پر آیا۔ یہی وہ ناول ہے جس نے اُردو ادب میں پیغام آفاقی کو پہچان دلائی۔ یہ ناول کئی سال تک قارئین، سیاست دانوں اور علمی و ادبی حلقوں

میں بحث کا موضوع بنا رہا۔ اس ناول کا ہندی کے علاوہ دوسری کئی زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔ اس ناول پر اُن کو کئی ادبی انجمنوں کی طرف سے اعزازات و انعامات سے نوازا گیا۔ جن میں پہلا انعام یو پی اُردو اکادمی لکھنؤ نے 1990 میں دیا۔ پیغام آفاقی نے اس ناول کے بارے میں خود کہا کہ:

''ناول 'مکان' انسان کو سمجھا دیتا ہے کہ انسانی ذہن بغیر پیسے، بغیر سیاسی طاقت اور بغیر جسمانی طاقت کے ہی ان تمام طاقت رکھنے والوں پر قابض ہوسکتا ہے چونکہ تخلیقی سوچ دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے اور تخلیقی سوچ نے مفکروں، سیاست دانوں اور بڑے رہنماؤں سے وہ کام کروائے جنھوں نے دنیا کی پوری شکل کو تبدیل کر دیا۔''

'مکان' کا موضوع تخلیقی قوت ہے، جسے سمجھنے کے لیے ہندوستان کے عصری، سیاسی وسماجی منظرنامے کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ یہ ناول ادب میں اپنے مخصوص فلسفۂ حیات کی وجہ سے ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ 'مکان' کی اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ امریکہ کی ایک میگزین میں اس ناول کے حوالے سے لکھا گیا تھا:

'' مکان سارے ہندوستان کی یونی ورسٹیوں اور اسکولوں میں پڑھی جانے والی کتابوں کی فہرست کا ناگریز حصہ ہے۔''

پیغام آفاقی کا پہلا شعری مجموعہ 'درندہ' کے نام سے 2001 میں چھپ کر منظر عام پر آیا۔ دراصل پیغام آفاقی اس یاسیت اور اس کے پس پردہ حقیقت کا ادراک اپنے بچپن سے ہی کر رہے تھے۔ اس کے شواہد ان کی اس شاعری میں موجود ہیں جو ان کے اس مجموعے میں شامل ہے۔

پیغام آفاقی انسان دشمن عناصر کا مطالعہ بہت گہری نظر سے کرتے ہیں۔ 'مافیا' ان کی اس خوبی کا زندہ ثبوت ہے۔ ناول 'مکان' کے بعد اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ 'مافیا' کے نام سے 2002 میں چھپ کر منظر عام پر آیا۔ اس میں کل اٹھارہ افسانے ہیں، جو اُردو کے علاوہ ہندی مجموعے کی صورت میں بھی شائع ہوچکے ہیں۔

پیغام آفاقی نے جہاں اُردو فکشن کو جدید اور متنوع جہات سے روشناس کروایا ہے وہیں علمی وادبی مضامین کے علاوہ ٹی۔ وی۔ سیریل اور اسکرپٹ پر بھی اپنی نوعیت کی الگ پہچان بنا رہے ہیں۔ اُن کا پہلا ٹی۔ وی سیریل (ٹوٹنے کے بعد) 1998 میں اور دوسرا (ڈنک) 1999 میں ٹیلی کاسٹ ہوا۔ میڈیا سے گہری وابستگی کے پیش نظر اُن کو اکثر و بیشتر جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی میں خصوصی لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا جاتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ اندرا گاندھی اوپن

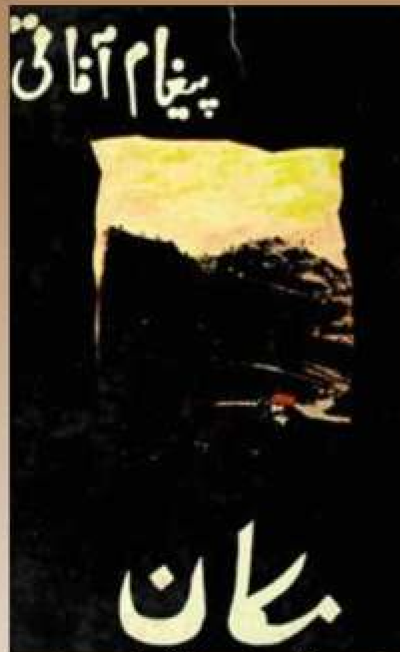

یونی ورسٹی کے تعلیمی پروگراموں کی تشکیل کمیٹی کے پینل میں بھی ان کا نام بحیثیت فلم ڈائریکٹر شامل رہا ہے۔

ناول 'مکان' کے بعد پیغام آفاقی نے 'معاملہ' کے نام سے ایک ناول لکھنا شروع کیا جو مکمل ہونے کے باوجود اشاعت کی منزل سے ہمکنار نہیں ہوسکا ہے۔ اُن کا معروف ناول 'پلیتہ' اُسی کے ایک حصے سے ماخوذ ہے۔ 'پلیتہ' پیغام آفاقی کا دوسرا یادگار ناول ہے۔ یہ ناول 2011 میں چھپ کر منظر عام پر آیا۔ اگرچہ اس ناول کا موضوع حاکم ومحکوم کے رشتے کو پیش کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ اس ناول میں اُن حکمرانوں کے کرداروں، اُن کے اعمال کے خفیہ پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے جن کا خفیہ ہونا ہی زمانۂ قدیم سے آج تک عام آدمی کے لیے زندگی کو ایک شکارگاہ بنائے ہوئے ہے۔ اس طرح یہ ناول علامتی اظہار کا شاہکار نمونہ ہے۔

پیغام آفاقی نے بچپن میں ہی اپنے گاؤں کے آئینے میں ہندوستان کی 95 فیصد آبادی کو قریب سے دیکھا۔ انھوں نے اس آبادی کے مسائل کی روشنی میں قومی اور عالمی سطح پر رائج استحصالی نظام کا بھی تجزیہ کیا اور اس طرح ناول 'پلیتہ' ایک وسیع تناظر میں آج کے ہندوستانی معاشرے کے حقیقی چہرے کو سامنے لانے والا ایک منفرد ناول ثابت ہوا ہے۔

پیغام آفاقی کے ناول 'پلیتہ' میں حقائق اور مسائل کا بیان علامتی اور استعاراتی اسلوب میں ہوا ہے۔ اس اعتبار سے 'پلیتہ' اُردو میں سماجی و ثقافتی بیانیہ Socio-cultural Narration کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس ناول کا بیانیہ اپنے اندر اتنی تہہ داری چھپائے ہوئے ہے کہ قرأت ختم ہونے کے بعد پھر سے پڑھنے کا تقاضا کرتا ہے اور ناول صفحہ بہ صفحہ نئی گہرائیوں کے ساتھ ہمارے سامنے کھلتا چلا جاتا ہے۔

پیغام آفاقی نے ہندوستانی تاریخ کا نہایت سیاہ چہرہ پیش کیا ہے۔ یہ پیغام آفاقی کی فنکارانہ جرأت مندی اور بے باکی ہے، جس نے اس بات کا احساس کرایا ہے کہ آج کے ماحول میں سچ کو سچ کی طرح کھرے انداز میں پیش کرنے والے فنکار ابھی زندہ ہیں۔

پیغام آفاقی کے دونوں ناولوں 'مکان' اور 'پلیتہ' کے مطالعے کے دوران ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف خود ناول میں موجود موضوعات و مسائل کو ذاتی طور پر جھیلتا رہا ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں کے موضوعات کے مواقف پلاٹ کی تشکیل وتعمیر میں اپنے فنی شعور وتخلیقی بالیدگی کا ثبوت دیتے ہوئے جس طرح تاریخی صداقتوں اور معاشرے کی حقیقتوں کو پیش کیا ہے وہ ان کی فن کاری کی بلند پروازی کا ثبوت ہے اور اسے تجربات و مشاہدات کے فنی وتخلیقی بیان کا اعلیٰ نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسے تخلیقی تجربہ ہی کہا جانا چاہیے۔ پیغام آفاقی کے ناولوں کا ہر کردار اپنے ماحول اور معاشرے کی مکمل ترجمانی کرتا ہے۔ گہری سماجی بصیرت، حقیقت پسندی، فنکارانہ شعور اور فنی پختگی کے ساتھ ساتھ تخلیقی زبان وبیان کی خوبصورتی و لچکداری ان کے ناولوں کی دلکشی میں بھی چار چاند لگاتی ہے۔

پیغام آفاقی کریسنٹ ایجوکیشنل سوسائٹی اور علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن دہلی کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں۔ ان کی رہنمائی میں ایک مکمل اُردو چینل کی تشکیل پر ریسرچ کا کام بھی ہوا۔ جس کے ذریعے وہ اُردو تہذیب کی کھوئی ہوئی تخلیقی قوت کو ادب اور میڈیا دونوں کے ذریعے پورے عالمی نقشے پر اُجاگر کرتے رہے۔

ادبی خدمات کی بنا پر پیغام آفاقی کو کئی انعامات سے نوازا گیا جن میں (تخلیقی نثر) پر اُردو اکیڈمی دہلی ایوارڈ، فیروز گاندھی ایوارڈ، میلینیم اُردو ایوارڈ (جامعہ اُردو علی گڑھ) لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر سرکاری انعامات پر پیغام آفاقی کی نظر رہتی تو وہ بھی 'پلیتہ' جیسا ناول نہیں لکھ پاتے۔ اس کی ایک بڑی مثال سعادت حسن منٹو ہے جن کو انعام نہیں ملا بلکہ اس پر مقدمے چلائے گئے، وہ بھی منٹو کے قائل نظر آتے ہیں۔ اسی لیے وہ کہتے تھے کہ ادیب کا مقصد انعامات حاصل کرنا نہیں ہے۔ صرف اور صرف اعلیٰ ادب تخلیق کرنا ہے اور اس کی عمدہ مثالیں خود پیغام آفاقی کے ناول، افسانے، شاعری اور مضامین ہیں۔

■

Dr. Javed Ahmed Mughal, Dept of Urdu,Jammu University, Baba Saheb Ambedkar Road, Tawi, Jammu 180006 (J&K)

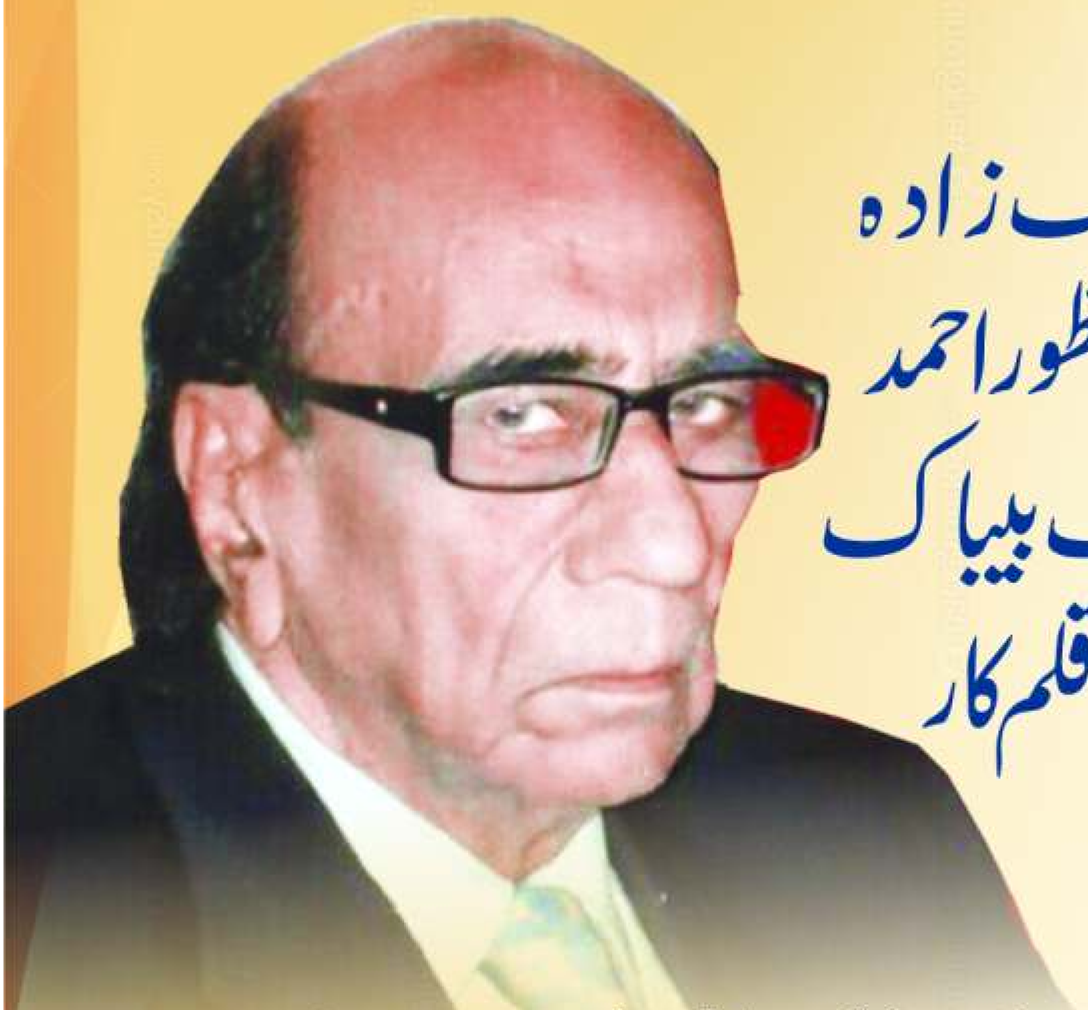

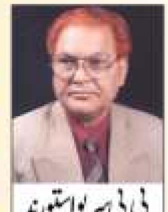

پی پی سریواستو رند

ملک زادہ منظور احمد ایک بیباک قلم کار

جب کسی قریبی دوست یا کرم فرما کے انتقال کی خبر ملتی ہے تو لگتا ہے کہ موت نے ایک قدم ہماری طرف بھی بڑھا دیا۔ دوست جو مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے، ایک ایک کر کے جدا ہو گئے — کمار پاشی، مخمور سعیدی، حیات لکھنوی، امیر آغا، محمد علی موج، زبیر رضوی، ضمیر حسن دہلوی وغیرہ — ایک ادبی محفل تھی، ہم مزاج لوگ تھے، ہم مشرب لوگ تھے۔ کینہ پروری سے دور اردو ادب کے لیے کوشاں، سب نے ایک دنیا الگ بسا لی۔ اس کے علاوہ میرے کرم فرما بزرگ مظہر امام، بھائی رفعت سروش، کرشن بہاری نور نے جب داغِ مفارقت دیا تو یقین ہوا کہ موت تو برحق ہے۔ صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

بھائی ملک زادہ منظور احمد صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا، وہ مجھ سے عمر میں بڑے تھے۔ جب بھی نوئیڈا تشریف لاتے فون پر اطلاع دیتے، میں ان کے حکم پر ان کے بیٹے جاوید ملک زادہ کی رہائش گاہ پر 52 سیڑھیاں چڑھ کر حاضر ہوتا۔ حالانکہ تیسری منزل تک پہنچنے میں میرا تنفس بھی بگڑ جاتا، لیکن ملک زادہ صاحب سے ملنے، ان سے بات کرنے کا اشتیاق میری ڈھلتی عمر کے درمیان کبھی نہیں آیا۔ دو بوڑھے لوگ جب مصروفِ گفتگو ہوں تو کسی بھی موضوع پر بلا تکلف بات چیت ہو سکتی ہے۔ ہمارے درمیان کسی قسم کی پردہ داری نہیں تھی۔ جب انھوں نے ماہنامہ 'امکان' نکالنے کا فیصلہ کیا تو کئی بار میرا مشورہ بھی شامل حال رہا۔

کہتے ہیں کہ کسی خلائی سیارے کو مریخ تک پہنچنے کے لیے چھ کروڑ کلومیٹر سے زائد کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے، تب کہیں جا کر اپنی منزل پاتا ہے۔ ایک بڑی جماعت ہمہ وقت مستعد اور سرگرم عمل رہتی۔ کچھ ایسے ہی حالات میں ماہنامہ 'امکان' کا اجرا ہوا۔ شروع شروع میں ملک زادہ صاحب ایک کالم 'کنک' اپنے قلم سے لکھا کرتے تھے جو بہت مقبول ہوا۔ اسی کالم میں انھوں نے لکھا تھا کہ ان کی خواہش ہے 'امکان' ان کی زندگی میں بند نہ ہو۔ 'امکان' ایک خلائی سیارے کی صورت نکلا اور ان کی زندگی میں عرشِ ادب پر مسلسل پرواز کرتا رہا۔ میرا قلمی تعاون ہمیشہ سے ہی 'امکان' کے لیے رہا۔

ملک زادہ صاحب کے مزاج میں جو سنجیدگی، متانت، بردباری، ملنساری، ذہنی کشادگی، وسعتِ نظر، سکون و اطمینان تھا وہ کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔ ملک زادہ صاحب کا حسنِ سلوک، انتظامی لیاقت، بے مثال تخلیقی صلاحیت، وسیع مطالعہ، وسیع مشاہدہ، وسیع سوچ کی توانائی، اپنے سے چھوٹے سے شفقت کا اظہار، اپنے سے بڑوں کا احترام ان کے کردار کا حصہ رہا۔ اردو کے تعلق سے فنی باریکیوں پر گہری نظر، حوصلے کا جذبہ اور دیگر اوصاف جناب ملک زادہ منظور احمد میں تھے، جس نے مجموعی اعتبار سے ان کے قامت کو بلندی بخشی۔

ان کی کتاب 'رقصِ شررٗ یوں تو اردو کے مشاعروں پر مشتمل ہے مگر اس کے مطالعے سے ایک پورے دور کی تہذیب، رکھ رکھاؤ کے سلسلے اور تذکرے کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اردو مشاعروں کے تعلق سے یہ ایک دستاویزی کتاب ہے۔ پرانے چراغ رہ رہ کر بجھ رہے ہیں مگر ان کے تذکرے کاغذ پر زندہ ہیں۔

وقت کا دریا رواں ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل رفتہ رفتہ ایک دوسرے میں پیوست ہوتے جا رہے ہیں۔ صبح اور شام کا چکر، ماہ و سال کی گردش کے ساتھ موسم اپنا لباس تبدیل کر رہا ہے، زندگی کے منظرنامے سے پرانے چہرے غائب ہو رہے ہیں۔ پرانی تہذیب کا ڈھانچہ درک چکا ہے۔ ایک نئی تہذیب نے گنگا جمنی تہذیب کو بھی شکست دے دی ہے۔ مشاعروں میں اشعار پر بھیک مانگی جاتی ہے۔ سامعین تالیاں بجاتے ہیں۔ معلوم نہیں ہوتا کہ ہوٹنگ ہو رہی ہے یا شاعر کو داد سے نوازا جا رہا۔ شاعرات بیوٹی پارلر سے تیار ہو کر مشاعرے میں آتی

ہیں۔ دلکش ترنم، خوبرو، سطحی اور غیر معیاری غزل جس کا خالق کوئی اور ہوتا ہے مشاعرے کے اسٹیج پر اداکاری ہوتی ہے، اس طرح کی تمام صورت حال کا ذکر ملک صاحب نے اپنی کتاب 'رقصِ شرر' میں کیا ہے۔ اب جبکہ اردو شاعرات کا ذکر آگیا ہے تو اقتباس پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ اردو شاعرات کا پہلا مشاعرہ ملک زادہ منظور احمد کی کوشش سے گورکھپور میں ہوا:

''انٹرویو دے کر گورکھپور لوٹا تو مشاعرۂ شاعرات کی داغ بیل ڈال دی۔ غلام حسین صاحب نئے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے۔ وامق جونپوری صاحب کے بہنوئی اختر عباس گورکھپور میں ڈی آئی جی پولس کے عہدے پر فائز

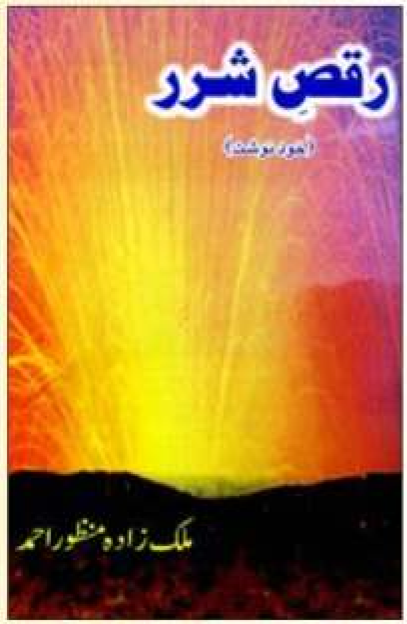

تھے۔ دونوں کی خواہش تھی کہ مشاعرہ کیا جائے.. یہ وہ زمانہ تھا جب ملک کی دو شاعرات ہر جگہ نظر آتی تھیں، اس کے علاوہ جو شاعرات تھیں وہ دیوناگری رسم الخط میں لکھے ہوئے دوسروں کے اشعار اپنا کہہ کر پیش کرتی تھیں.. مگر ہم نے یہ اہتمام ضرور کیا کہ معتبر اور پڑھی لکھی شاعرات کا تناسب نسبتاً زیادہ رکھا جائے... مشاعرے کی صدارت ڈی آئی جی اختر عباس کی اہلیہ کی تھی اور نظامت دہلی کی ڈاکٹر شمیم نکہت کی، جن شاعرات کو مدعو کیا وہ تھیں ڈاکٹر زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، بمبئی سے مینا قاضی، جھانسی سے کرن جھانسوی، لکھنؤ سے شاہجہاں بانو یاد، دہلی سے نسیم مخموری، جمیلہ بانو اور ساحرہ قزلباش وغیرہ۔ مشاعرہ بے حد کامیاب رہا۔'' (رقصِ شرر،ص 224-223)

چونکہ خواتین کا پہلا مشاعرہ ملک زادہ منظور احمد کی تحریک پر ہوا اس لیے میں 'رقصِ شرر' میں درج شاعرات کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں جس سے آپ شاعرات کے متعلق اپنی رائے قائم کرسکیں۔

شاہجہاں بانو یاد کے سلسلے میں لکھتے ہیں جو اس وقت کی معروف شاعرہ تھیں:

''شاہجہاں بانو یاد دہلوی سے میری پہلی ملاقات اس صدی کی پانچویں دہائی میں ہوئی تھی۔ الہ آباد میں نمائش کا مشاعرہ تھا۔ صدارت یوپی پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین نفیس الحسن کررہے تھے۔ شعرا کے تعارف کی ذمے داری مجھے سونپی گئی۔ میں نے انھیں دعوت کلام دی، وہ تالیوں کی گونج میں لاؤڈ اسپیکر کے سامنے آئیں۔ میں نے ان کا سرسری جائزہ لیا جس کا ذکر میری کتاب 'شہرِ سخن' میں ہے... وہ بذاتِ خود ایک سادہ، پرکار غزل تھیں۔ سیاہ اوررکوٹ، سفید ساری، کانوں میں جھومتے طلائی آویزے، چہرے پر بل کھاتی دو چوٹیاں، گھنیری پلکیں نیند کے بار سے بوجھل، مجموعی طور پر وضع قطع اور لباس سے بڑی سادگی ٹپک رہی تھی مگر اس سادگی میں بھی بڑی پرکاری تھی۔ انھوں نے غزل سنائی، سامعین دوسری غزل کے لیے بضد تھے۔ داد و تحسین کے شور میں اپنی جگہ جاکر بیٹھ گئیں۔ اس کے بعد ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ رہی خط و کتابت بھی رہی۔ ان کی خوش پوشی، ان کے پڑھنے کا انداز، معانی مطلب سے حرکات و سکنات کی ہم آہنگی، فن موسیقی میں مہارت، ترنم کا زیر و بم، ان کی تمام چیزوں نے مل کر ان کی شخصیت کو ابھارا.. کلاسیکل موسیقی کی فنکارہ تھیں۔ ریڈیو پر اکثر ان کی ٹھمری کے پروگرام نشر ہوتے تھے:

یہ کالی کالی گھٹا جو برسنے والی ہے
مزا تو جب ہے کسی پارسا کو لے ڈوبے
آئینہ دیکھ کر ہم اسے دیکھتے
آپ اپنی نظر میں سمانا پڑا
ڈوبنے والوں میں اک اور انسان ہی سہی
ڈوبنے والو نہ گھبراؤ کہ ہم آتے ہیں

کبھی کبھی لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ مشاعروں میں شاعرات کی شرکت کہاں تک مستحسن ہے۔ میرا کہنا ہے کہ جب خواتین زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کے شانہ بہ شانہ کارہائے نمایاں انجام دے رہی ہیں تو مشاعروں کے دروازے بھی ان کے لیے کھلے رہنے چاہئیں مگر پوری غزل کہلوا کر اپنے نام سے پڑھنا مشاعرے کے نام پر ایک دھبہ ہے۔ آج کے مشاعروں میں غیر معتبر شاعرات کا غیر معمولی اضافہ ہورہا ہے۔'' (رقصِ شرر،ص 216)

جب خواتین زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کے شانہ بہ شانہ کارہائے نمایاں انجام دیے رہی ہیں تو مشاعروں کے دروازے بھی ان کے لیے کھلے رہنے چاہئیں مگر پوری غزل کہلوا کر اپنے نام سے پڑھنا مشاعرے کے نام پر ایک دھبہ ہے. آج کے مشاعروں میں غیر معتبر شاعرات کا غیر معمولی اضافہ ہورہا ہے.''

'رقصِ شرر' میں مشاعروں کے تعلق سے لاتعداد شعرا، شاعرات اور دیگر شخصیات کا ذکر ملک زادہ منظور احمد صاحب نے بہت بیباک انداز میں کیا ہے، جن کو پڑھ کر نہ صرف حیرت ہوتی ہے بلکہ تعجب بھی۔

اب تذکرے لکھے تو جاتے ہیں اور حلقہ در حلقہ بڑھتے اور پھیلتے بھی ہیں مگر ادبی مسائل کو سمیٹنا یوں بھی آسان نہیں۔ شاعر ہوں یا نثر نگار، ادبی نقاد ہوں یا ترجمہ نگار، صحافی ہوں یا انشاپرداز، کتنے لوگ ہیں جو وقت گزر جانے پر یاد کیے جاتے ہیں۔ عام طور پر اپنے زمانے کے لوگوں کا ذکر چھیڑنا جتنا آسان ہوتا ہے اتنا ہی مشکل ان لوگوں پر سلامت روی سے قلم اٹھانا بھی ایک مسئلہ ہے۔ اس کے لیے ایک متوازن زاویۂ نگاہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ افراد کے ساتھ محفلوں کا بھی ایک کردار ہوتا ہے۔ جو ماحول اور افراد کے مجموعی تاثر اور تاریخی تناظر کے ساتھ بنتا ہے۔ عصری رویے ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں مگر ان کی تاریخی معنویت کو وقت گزر جانے پر ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ ملک زادہ منظور احمد نے 'رقصِ شرر' میں رنگوں، خوشبوؤں اور روشنیوں کی طرح اپنی تخلیقی حسیت کے ساتھ کئی جہتوں کا سفر کیا ہے اور نشاناتِ سفر چھوڑے ہیں۔

ملک زادہ منظور احمد کی کتاب 'رقصِ شرر' آپ بیتی، خودنوشت یا کچھ بھی کہیے ایک ایسا دستاویز ہے جو صحتِ واقعات کو ملحوظ رکھ کر لکھا گیا اور جو اسلوب نگارش کا ایک دلکش مرقع ہے بلکہ مشاعروں پر ایک مستند تحریر ہے۔ کسی کا شعر ہے:

ہے آج جو سرگزشت اپنی
کل اس کی کہانیاں بنیں گی

■

P. P. Sriwastava Rind R-16, Sector 11,
NOIDA (UP)
Mob.:9711422058
Email.: rind.srivastava@gmail.com

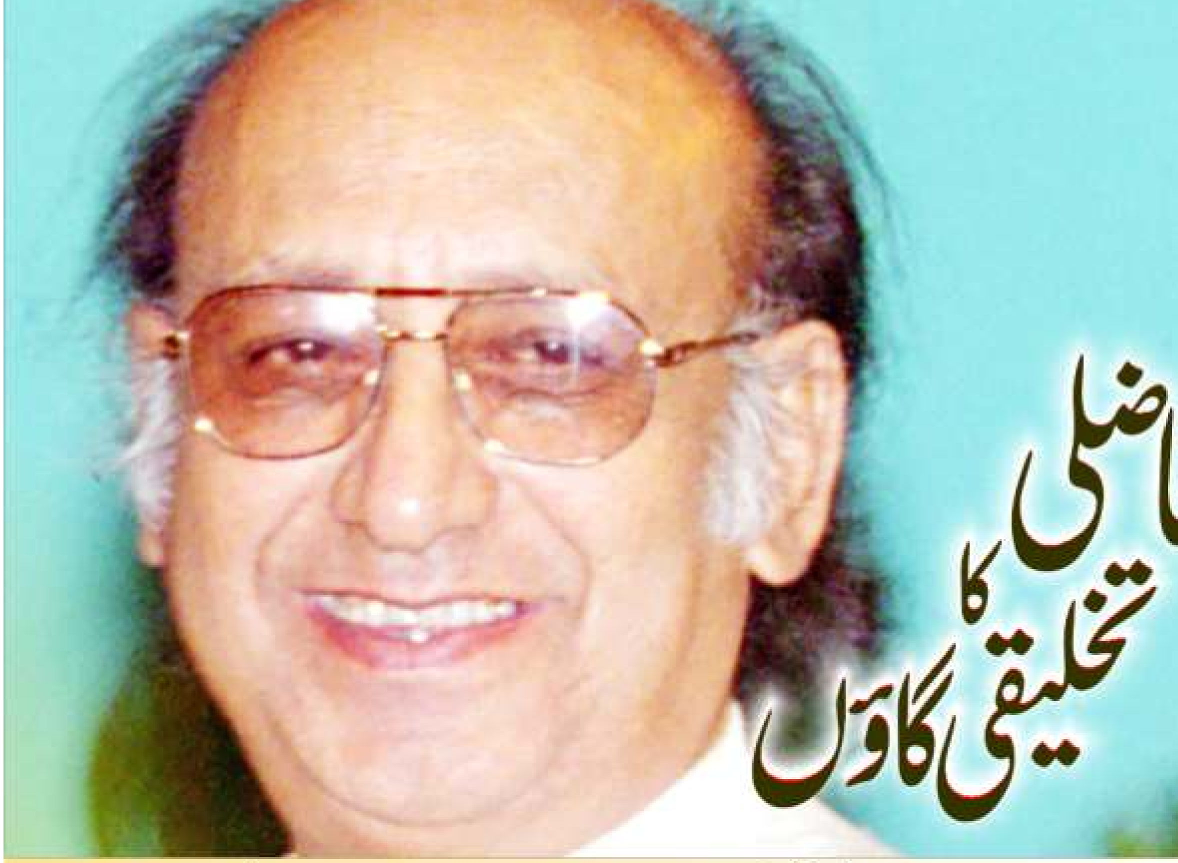

ندا فاضلی کا تخلیقی گاؤں

کوثر مظہری

(1)

ندا فاضلی کا نام تو کالج کے زمانے میں (1982-84) ہی سن رکھا تھا، لیکن چونکہ میں اس زمانے میں B.Sc (علم نباتات) کر رہا تھا، اس لیے ان کے حوالے سے، یا ان کی چیزیں پڑھنے کا یا انھیں سننے کا موقع کم ملا۔ البتہ دہلی آنے کے بعد ایک دو مشاعروں میں انھیں سننے کا اتفاق ہوا۔ ان کا شعر پڑھنے اور سنانے کا انداز بالکل جداگانہ تھا اور پھر جب وہ دوہے سناتے تو دوسرے مصرعے کے اختتام پر دونوں ہاتھوں کو ہوا میں لے جاتے اور تقریباً دونوں طرف سے سر کے سامنے اوپر تک لاکر چھوڑ دیتے۔ لفظوں کو دہرانے کا بھی ان کا ایک خاص انداز تھا جس کی نقالی بعد کے کئی شعرا کے یہاں نظر آئی۔

ذاتی طور پر میری ان سے بہت قربت نہیں تھی، لیکن جب میں نے اپنا شعری مجموعہ 'ماضی کا آئندہ' اپنے دوست شکیل اعظمی کے ذریعے ان کو بھجوایا تو پورا مجموعہ پڑھ کر فوراً فون کیا اور دیر تک یوں باتیں کرتے رہے جیسے وہ مجھے ذاتی طور پر بہت اچھی طرح جانتے ہوں۔ ''کوثر صاحب آپ تو بہت اچھی تنقید بھی لکھ رہے ہیں اور میں نے رسالوں میں آپ کی چیزیں پڑھی ہیں۔'' ایسا تعریفی جملہ سن کر میرے حوصلے بڑھ گئے۔ اس کے بعد شعبۂ اردو کی طرف سے فراق میموریل لکچر انھوں نے پیش کیا جو کہ بہت ہی معلوماتی اور دل چسپ تھا۔ ان کی گفتگو اور مقالہ پیش کرنے کے انداز نے سامعین کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ اسی طرح جامعہ کلچرل کمیٹی کی طرف سے ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد کیے جانے کی ذمے داری مجھے دی گئی۔ یہ نومبر 2009 کی بات ہے۔ فہرست میں سینئر شعرا میں بیکل اتساہی کے بعد ندا صاحب ہی کا نام تھا۔ مشاعرے کا کنوینر ہونے کے ناتے مجھے ہی ندا صاحب سے گفتگو کرنی تھی۔ میں نے جب انھیں فون کیا تو جامعہ میں مشاعرہ پڑھنے کے لیے وہ فوراً تیار ہوگئے۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ یہاں یونیورسٹی جو اعزازیہ پیش کرے گی اس کی رقم 'یہ' ہے۔ انھوں نے کہا— ''کوثر صاحب میں مشاعرے پڑھتا ہوں، لیکن جامعہ ملیہ میں مشاعرہ پڑھنا یہ خود میرے لیے اعزاز کی بات ہے، آپ اعزازیہ کی بات مت کیجیے۔'' اس طرح وہ خوشی خوشی اس مشاعرے میں تشریف لائے۔ صبح جامعہ کے نہرو گیسٹ ہاؤس میں کچھ نوجوان ادیب و شاعر ان سے ملنے آئے۔ میں بھی شریک تھا۔ ان میں جناب حقانی القاسمی، جناب عبدالقادر شمس، نعمان قیصر وغیرہ تھے۔ وہیں کینٹین میں ہم سب ندا صاحب کے ساتھ چائے پیتے رہے اور بہت دیر تک ادبی اور غیر ادبی (لیکن دل چسپ) باتیں کرتے رہے۔ وہ جس قدر خوب صورت تھے اسی طرح انھیں خوب صورت انداز میں گفتگو کرنے کا ملکہ حاصل تھا۔ اب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں، البتہ ان کے شعری اور نثری متون ہمارے سامنے ہیں۔ ہم جب بھی ندا سے ہم کلام ہونا چاہیں ان کی نگارشات پڑھیں تو شاید ان کا عکس، ان کے تجربے، ان کے مشاہدے اور یہاں تک کہ ان کی شخصیت کے مختلف پہلو ہمارے سامنے کھلتے جائیں گے اور حقیقت یہی ہے کہ اصل سرمایہ تو ان کی تخلیقات ہی ہیں۔

> **ہم جب بھی ندا سے ہم کلام ہونا چاہیں ان کی نگارشات پڑھیں تو شاید ان کا عکس، ان کے تجربے، ان کے مشاہدے اور یہاں تک کہ ان کی شخصیت کے مختلف پہلو ہمارے سامنے کھُلتے جائیں گے اور حقیقت یہی ہے کہ اصل سرمایہ تو ان کی تخلیقات ہی ہیں۔**

(2)

ہر ایک گھر میں دیا بھی جلے اناج بھی ہو
اگر نہ ہو کہیں ایسا تو احتجاج بھی ہو

ندا فاضلی کے شعری تناظر اور تخلیقی نہج کو سمجھنے کے لیے میں نے یہ شعر درج کیا ہے۔ ذرا اس شعر کو پڑھیے اور اس پر غور کیجیے تو اندازہ ہوجائے گا کہ یہ کسی ترقی پسند شاعر کا شعر ہے۔ اس میں ہر ایک گھر میں روشنی اور اناج ہونے کی بات کی جارہی ہے اور اگر ایسا ممکن نہیں تو اس کے لیے احتجاج کرنے کا مشورہ بھی دیا جارہا ہے۔ ترقی

پسندوں کا بھی کچھ یہی تقاضا تھا۔ لیکن بہت جلد ندا فاضلی کو احساس ہوگیا کہ ترقی پسندی کا جادو سرد پڑ چکا ہے اور ایک جدید رجحان مدمقابل ہے۔ دوسری طرف تقسیم ہند کے بعد رونما ہونے والے فسادات اور انسانی قدروں کی پامالی، غیر ضروری سیاسی جوش اور ولولے، انسانی جذبوں کی تقسیم، نقل مکانی کے سبب بے مکانی، بے چہرگی اور انسانی وجود کی بقا کے لیے جدوجہد، یعنی یہ سب کچھ اور اسی نوع کے دوسرے مسائل اور عوامل ایسے تھے جو ندا کی

ندا فاضلی خود رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ کے بھوگی رہے ہیں، لہٰذا وہ ان رشتوں کو اپنی شاعری میں سجاتے سنوارتے رہے ہیں۔ سیاسی اور سماجی طور پر جو اتھل پتھل ہوتی ہے اسے بھی شاعر شعری پیکر عطا کرتا ہے۔ لیکن شاعر کا خلوص خواہ وہ دوستی کا ہو یا دشمنی کا، رشتوں کی الگنی پر دھوپ میں سوکھتے ہوئے زیادہ درخشاں اور پائندہ نظر آتا ہے۔

تخلیقیت اور باطن دونوں میں ہلچل پیدا کر رہے تھے۔ کبھی کبھی اس طرح کے تجربے سوہانِ روح بن جاتے ہیں۔ سنیے:

بیٹھے ہیں دوستوں میں ضروری ہیں قہقہے
سب کو ہنسا رہے ہیں مگر رو رہے ہیں ہم

اور پھر یہ نظم دیکھیے:

پیار، نفرت، دیا، جفا، احسان
قوم، بھاشا، وطن، دھرم، ایمان
عمر گویا/ چٹان ہے کوئی
جس پہ انسان کوہ کن کی طرح
موت کی نہر/ کھودنے کے لیے/ سیکڑوں تیشے
آزماتا ہے/ ہاتھ پاؤں چلائے جاتا ہے

ندا فاضلی خود رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ کے بھوگی رہے ہیں، لہٰذا وہ ان رشتوں کو اپنی شاعری میں سجاتے سنوارتے رہے ہیں۔ سیاسی اور سماجی طور پر جو اتھل پتھل ہوتی ہے اسے بھی شاعر شعری پیکر عطا کرتا ہے۔ لیکن شاعر کا خلوص خواہ وہ دوستی کا ہو یا دشمنی کا، رشتوں کی الگنی پر دھوپ میں سوکھتے ہوئے زیادہ درخشاں اور پائندہ نظر آتا ہے۔

زمینی قربتوں اور فاصلوں کو ہمیشہ ندا فاضلی نے اپنی تخلیقی ہنرمندی کا حصہ بنایا ہے۔ ان کے لسانی اظہار میں بھی سادگی کے ساتھ تازگی دیکھی جاسکتی ہے:

کچھ لوگ یونہی شہر میں ہم سے بھی خفا ہیں
ہر ایک سے اپنی بھی طبیعت نہیں ملتی

اسی انسانی رشتے کی حقیقت اور نسلی بُعد (Generation Gap) کو وہ اپنی ایک نظم میں اس طرح پیش کرتے ہیں۔ غور کیجیے کہ اس نظم کے کرافٹ میں کیسی کرب آگیں تخلیقیت ضم ہوگئی ہے:

بیٹھے بیٹھے یونہی قلم لے کر
میں نے کاغذ کے ایک کونے پر
اپنی ماں/ اپنے باپ، کے دو نام
ایک گھیرا بنا کے کاٹ دیے
اور اس گول دائرے کے قریب
اپنا چھوٹا سا نام ٹانک دیا
میرے اٹھتے ہی، میرے بچے نے
پورے کاغذ کو لے کے پھاڑ دیا

یہاں کاغذ پھاڑنے کے ساتھ ساتھ، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر کا دل بھی دو نیم ہوگیا ہے۔ یہی ہے وہ احساس کی لطافت جس میں شدت کی پھواریں ہیں اور یہی ہیں وہ پھواریں جو ندا کی شاعری کو ترفع (Sublimation) عطا کرتی ہیں۔

رشتوں کا تحفظ ہو یا اقدار انسانی کا، دونوں انسانی معاشرے کے لیے اہم ہیں۔ سیاسی بازی گروں اور مذہبی ٹھیکے داروں نے بھی انسانی قدروں کو خراب و پامال کیا ہے۔ ایسے میں کسی بھی سچے تخلیقی فنکار کے لیے خاموش رہنا مشکل ہوتا ہے۔ ندا، خدا، سماج اور انسانی رشتوں پر کچھ اس طرح اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہیں:

کسی گھر کے کسی بجھتے ہوئے چولھے میں ڈھونڈ اس کو
جو چوٹی اور داڑھی تک رہے وہ دین داری کیا

بندرابن کے کرشن کنہیا اللہ ہو
بنسی، رادھا، گیتا، گیّا اللہ ہو
مولویوں کا سجدہ، پنڈت کی پوجا
مزدوروں کی ہیّا ہیّا اللہ ہو
اتنی خونخوار نہ تھیں پہلے عبادت گاہیں
یہ عقیدے ہیں کہ انسان کی تنہائی ہے

ندا فاضلی کے اس رویے کو مذہب مخالف نہیں سمجھنا چاہیے، بلکہ اس میں انسانی دردمندی اور عظمت آدم کو پس پشت ڈال کر مذہب کے نام پر لڑنے لڑانے والوں کے لیے دور سے آتی ہوئی ایک کرن ہے۔ معاشرے کے تاریک سینے میں ندا نے ایک شمع روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہیں، یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ ندا کی شاعری میں جہاں انسانی دردمندی کے نغمے ہیں وہیں بچوں کی معصومیت کے تحفظ کا گیت بھی ہے:

بچوں کے چھوٹے ہاتھوں کو چاند ستارے چھونے دو
چار کتابیں پڑھ کر یہ بھی ہم جیسے ہوجائیں گے
ہمیشہ مندر و مسجد میں وہ نہیں رہتا
سنا ہے بچوں میں چھپ کر وہ کھیلتا بھی نہیں

اسی طرح ان کی ایک مختصر سی نظم 'چھوٹی سی شاپنگ' ہے جس میں نہایت ہی سادگی کے ساتھ پانچ سال کی بچی کے لیے ایک گڑیا کی خریداری کا نقشہ پیش کیا گیا ہے اور پھر اس کی منظرکشی میں ندا نے جو تخلیقیت کے رنگ بھرے ہیں، اس سے وہ گڑیا رقص کناں ہوگئی ہے، ملاحظہ کیجیے:

گوٹے والی/ لال اوڑھنی/ اس پر/ چولی گھاگھرا
اسی سے میچنگ کرنے والا/ چھوٹا سا اک ناگرا
چھوٹی سی!/ یہ شاپنگ تھی/ یا/ کوئی جادو ٹونا
لمبا چوڑا شہر اچانک/ بن کر ایک کھلونا
اتہاسوں کا جال توڑ کے
داڑھی، پگڑی، اونٹ چھوڑ کے
الف سے/ اماں/ بے سے/ بابا/ بیٹھا باج رہا تھا
پانچ سال کی بچی/ بن کر/ جے پور ناچ رہا تھا

دیکھیے کہ کس تخلیقی ہنرمندی کے سبب 'داڑھی پگڑی اور اونٹ' جو کہ جے پور (راجستھان) کی تہذیبی شناخت خلق کرتے ہیں ایک دم سے پانچ سال کی بچی کے لیے خریدی گئی گڑیا میں مبدل ہوکر ناچنے لگتے ہیں۔ یہ ان اشیا کی محض ظاہری تبدیلی نہیں ہے بلکہ اس لطیف جذبے کی قلب ماہیت ہے جو شاعر کے دل میں اس بچی کے لیے پل رہا ہے۔ ندا نے رشتوں کے باطن میں اترنے اور انھیں محسوس کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی معصوم رشتہ جب گاؤں، گھر، خاندان کی طرف مراجعت کرتا ہے تو تخلیقی شعور کی کہکشاں آسمانِ شاعری پر یوں ابھرتی ہے:

میں برسوں بعد/ اپنے گھر کو تلاش کرتا ہوا
اپنے گھر پہنچا/ لیکن میرے گھر میں
اب میرا گھر نہیں تھا
اب میرے بھائی اجنبی عورتوں کے شوہر بن چکے تھے
میرے گھر میں/ اب میری بہنیں
انجانے مردوں کے ساتھ مجھ سے ملنے آئی تھیں
اپنے اپنے دائروں میں تقسیم
میرے بھائی بہن کا پیار
اب صرف تحفوں کا لین دین بن چکا تھا

میں جب تک وہاں رہا
شیو کرنے کے بعد/ برش، کریم، سیفٹی ریزر
خود دھو کر اٹیچی میں رکھتا رہا/ میلے کپڑے
خود گن کر لانڈری میں دیتا رہا
اب میرے گھر میں وہ نہیں تھے
جو بہت سوں میں بٹ کر بھی
پورے کے پورے میرے تھے
جنھیں میری ہر کھوئی چیز کا پتہ یاد تھا
مجھے کافی دیر ہوگئی تھی/ دیر ہو جانے پر کھویا ہوا گھر
آسمان کا ستارہ بن جاتا ہے
جو دور سے بلاتا ہے/ لیکن پاس نہیں آتا ہے
(نظم: دور کا ستارہ)

اس نظم میں محض 'ندا' کا مشاہدہ یا نجی تجربہ نہیں بلکہ گھر خاندان کے افراد کا الگ الگ ہو کر زندگی گزارنا، بھائی بہنوں کی شادیاں ہونے کے بعد آنگن میں 'اجنبیت' کا آجانا، تحفے کا لین دین— اس طرح دھیرے دھیرے قربتوں کا دوریوں میں بدل جانا سب کچھ شامل ہے۔ یہ بہت ہی سچا Landscape ہے جسے ندا فاضلی نے بنایا ہے۔

یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ندا نے، اگر غلط نہیں، تو صرف رشتوں کی شاعری کی ہے۔ خاندانی افراد کے رشتوں کی، بہن بھائی اور ماں باپ کے رشتوں کی، پہاڑ

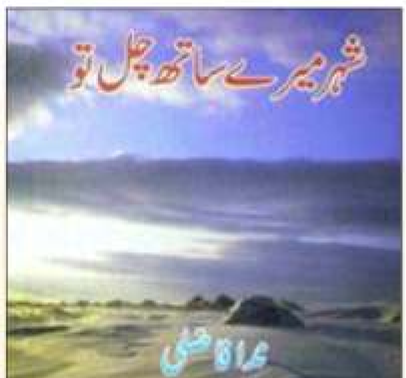

اور چرند و پرند کے رشتوں کی یعنی مظاہر قدرت میں بھی وہ ایک طرح سے رشتوں کے متلاشی نظر آتے ہیں۔ انھیں شاید رشتوں کی کہانی سنانے میں روحانی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ یہاں ایک 'نظم' جو کہ غزل کے فورم میں ہے ملاحظہ کیجیے اور دیکھیے کہ ندا نے 'ماں' کے روپ کو کس طرح پینٹ

ندا کی شاعری میں انسانی جذبوں کی سرشاری اور زندگی کی بالکل ہی سچی تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ انسانی زندگی اور انسانیت دونوں کو مستحکم کرنے والے جو بھی عوامل اور عناصر شاعری کے لیے استعمال ہوسکتے ہیں، ندا نے انہیں بہت ہی خوش اسلوبی سے استعمال کیے ہیں۔ پوری کائنات اور بالخصوص ہندوستانی زمین اور اس زمین پر تنے ہوئے نیلے شامیانے اور اس شامیانے میں جڑے ہوئے چاند سورج اور ستارے اور ان دونوں کے بیچ خلاؤں میں اڑتے ہوئے رنگ برنگ پرندوں کو ندا نے بہت ہی قریب سے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔

کرنے کی کوشش کی ہے:

بیسن کی سوندھی روٹی پر کھٹی چٹنی جیسی ماں
یاد آتی ہے چوکا باسن چمٹا پھکنی جیسی ماں
بانس کی کھرّی کھاٹ کے اوپر ہر آہٹ پر کان دھرے
آدھی سوئی، آدھی جاگی، تھکی دوپہری جیسی ماں
چڑیوں کی چہکار میں گونجے رادھا موہن علی علی
مرغی کی آواز سے کھلتی گھر کی کنڈی جیسی ماں
بیوی، بیٹی، بہن، پڑوسن تھوڑی تھوڑی سی سب میں
دن بھر اک رسّی کے اوپر چلتی نٹنی جیسی ماں
بانٹ کے اپنا چہرہ، ماتھا، آنکھیں، جانے کہاں گئی
پھٹے پرانے اک البم میں چنچل لڑکی جیسی ماں

ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ندا نے ماں پر پورا ایک ناول تحریر کر دیا ہے۔ کتنی جہتیں ہیں۔ اردو شاعری میں 'ماں' کو طرح طرح سے عقیدتوں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ غزل میں، نظم میں، لیکن فی الحقیقت ندا نے جس طرح کی نظم اور جس ڈکشن میں کہی ہے، میں نے ایسی نظم کہیں نہیں پڑھی۔ ایک بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ایسی شاعری کا تجزیہ کرنے سے جذبہ و احساس کی لطافت ماند پڑ جاتی ہے۔ آخر کے شعر میں تو ماں کے وجود کے بکھرنے یا یہ کہہ لیں کہ ماں کے اپنے وجود کو اپنی نئی نسل میں بانٹ کر خرچ کر کے مٹ جانے کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ آپ ملاحظہ کیجیے کہ کس طرح یہ شعر پورے SensoryNerves میں سنسناہٹ پیدا کر دیتا ہے:

بانٹ کے اپنا چہرہ ماتھا، آنکھیں جانے کہاں گئیں
پھٹے پرانے اک البم میں چنچل لڑکی جیسی ماں

وارث علوی نے ندا پر لکھے گئے اپنے مضمون 'جدید شاعری کا معتبر نام- ندا فاضلی' (مشمولہ 'ناخن کا قرض') میں لکھا ہے اور کہا ہے کہ اقبال کی نظم 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' اچھی ہے مگر فلسفیانہ خیالات سے بوجھل ہے۔ پھر یہ لکھا ہے کہ: ''میرے نزدیک اردو میں 'ماں' کے موضوع پر صرف دو نظمیں یادگار رہیں گی۔ فراق کی نظم 'جگنو' اور ندا کی منقولہ بالا نظم۔'' (ص 91)

حالانکہ ندا نے یہ نظم بغیر کسی عنوان کے کہی ہے اور غزل کی ہیئت میں کہی ہے۔ وارث علوی نے دو صفحات میں اسی نظم کے مختلف نقوش اور جہتوں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ندا نے ایک ہندوستانی ماں کی تصویر ہندوستانی پس منظر میں خوبصورت لفظوں کی مدد سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس طرح ندا کی شاعری میں انسانی جذبوں کی سرشاری اور زندگی کی بالکل ہی سچی تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ انسانی زندگی اور انسانیت دونوں کو مستحکم کرنے والے جو بھی عوامل اور عناصر شاعری کے لیے استعمال ہوسکتے ہیں، ندا نے انھیں بہت ہی خوش اسلوبی سے استعمال کیے ہیں۔ پوری کائنات اور بالخصوص ہندوستانی زمین اور اس زمین پر تنے ہوئے نیلے شامیانے اور اس شامیانے میں جڑے ہوئے چاند سورج اور ستارے اور ان دونوں کے بیچ خلاؤں میں اڑتے ہوئے رنگ برنگ پرندوں کو ندا نے بہت ہی قریب سے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ چاند، مانجھی، ندی، دریا، گوریا، پیپل کے پتے، برکھا رت، ساون، بھادوں، انگیٹھی، کنیا، بگلوں کی ڈاریں، کٹورے سا تال، مٹکے کا پانی اور بھی ایسے نشانات و آیات جو ہماری ہندوستانی تہذیبی بساط کو خوب صورت بناتے ہیں، ندا نے انھیں اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ آپ ان الفاظ پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ بہت کم اُردو کے شعرا ہیں جو ان کو اپنی شاعری میں جگہ دے پاتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ ہے، اپنی تہذیبی جڑوں سے دوری یا کم از کم ان کی طرف توجہ کا فقدان۔ اگر یہاں الفاظ کے اچھے یا برے ہونے کی بحث چھیڑ دی جائے تو بات غیر ضروری طور پر نظریاتی مباحث کی لیک پر چل نکلے گی اور ایسے میں ندا فاضلی کے شعری منشور سے چھن کر آنے والی ست رنگی شعاعوں سے ہمارے ذہن منور نہیں ہوسکیں گے، اس لیے اس بحث کو یہیں موقوف کیا

جاتا ہے۔

اب تک جن پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی، ندا نے ان کے علاوہ بھی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ شاعروں کا محبوب موضوع عشق بھی رہا ہے۔ عشقیہ مضامین اور ان کے ارتعاشات بھی ندا کی شاعری میں ملتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی نظم 'ایک ملاقات' دیکھیے:

نیم تلے دو جسم اجانے چم چم بہتا ندیا جل
اُڑی اُڑی چہرے کی رنگت کھلے کھلے زلفوں کے بل
دبی دبی کچھ گیلی سانسیں جھکے جھکے سے نین کنول
نام اس کا؟ دو نیلی آنکھیں
ذات اس کی؟ رستے کی رات
مذہب اس کا؟ بھیگا موسم
پتا؟ بہاروں کی برسات

نظم پڑھتے ہوئے آپ الفاظ و تراکیب میں قطعی نہیں الجھتے بلکہ اس کی روانی میں آپ بھی بہتے چلے جاتے ہیں۔ سچا جذبہ، سچا اور سیدھا اسلوب اظہار، یہی ہے ندا کی شاعری کا واضح نقش۔ فکری پیچیدگی سے پرے اور پیچیدہ اسلوب سے دور ندا کی شاعری الگ سے پہچانی جاسکتی ہے۔
ان کی شاعری میں عشق کا جذبہ کچھ یوں بھی اترتا ہے:

جب جب موسم جھوما ہم نے کپڑے پھاڑے شور کیا
ہر موسم شائستہ رہنا کوری دنیا داری ہے
ہر اک رستہ اندھیروں میں گھرا ہے
محبت اک ضروری حادثہ ہے
تم سے چھٹ کر بھی تمھیں بھولنا آسان نہ تھا
تم کو ہی یاد کیا تم کو بھلانے کے لیے
اکیلے کمرے میں گلدان بولتے کب ہیں
تمھارے ہونٹ ہیں شاید گلاب میں شامل
اب بھی یوں ملتے ہیں ہم سے پھول چنبیلی کے
جیسے اُن سے اپنا کوئی رشتہ لگتا ہے

نظم پڑھتے ہوئے آپ الفاظ و تراکیب میں قطعی نہیں الجھتے بلکہ اس کی روانی میں آپ بھی بہتے چلے جاتے ہیں۔ سچا جذبہ، سچا اور سیدھا اسلوب اظہار، یہی ہے ندا کی شاعری کا واضح نقش۔ فکری پیچیدگی سے پرے اور پیچیدہ اسلوب سے دور ندا کی شاعری الگ سے پہچانی جاسکتی ہے۔

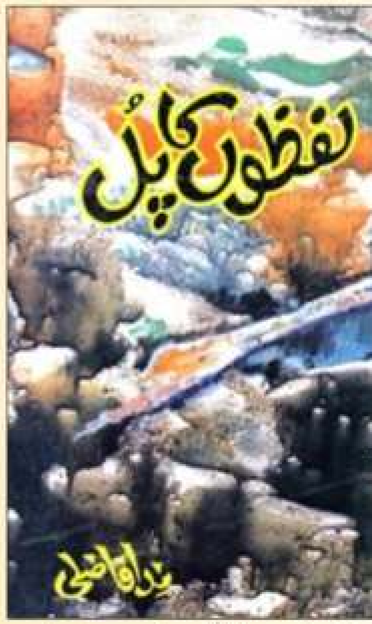

وہ ایک ہی چہرہ تو نہیں سارے جہاں میں
جو دور ہے وہ دل سے اُتر کیوں نہیں جاتا

اور پھر ایک خوب صورت مشورہ کہ:

عشق کرکے دیکھیے اپنا تو یہ ہے تجربہ
گھر، محلّہ، شہر، سب پہلے سے اچھا ہوگیا

اگر بغور دیکھا جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ندا نے عشقیہ مضامین کو زیادہ وسعت نہیں دی ہے۔ چونکہ انھوں نے زندگی کے تلخ تجربے اور مشاہدے سمیٹے ہیں، ان کے گلے گلے دکھوں اور جدوجہد کا پانی آیا ہے، لہٰذا زمانے کے اندر اتر کر ان کی تخلیقی حسیت نے انھیں ایک ایسے شاعر کے روپ میں ابھارا ہے جو اپنے ہم عصروں میں مضامین اور اسالیب اظہار دونوں سطحوں پر الگ نظر آتا ہے۔

ایسے میں کبھی شان قلندری بھی پیدا ہو جاتی ہے او رکبھی زندگی کے مختلف اچھے برے نقوش بھی ابھرتے ہیں:

ہر اک آنگن میں دیواریں کھڑی ہیں
سبھی کے پاس کچھ پرچھائیاں ہیں
آنکھیں کہیں، نگاہ کہیں، دست و پا کہیں
کس سے کہیں کہ ڈھونڈو بہت کھو رہے ہم
رشتوں کے نام وقت کے چہرے بدل گئے
اب کیا بتائیں کس کو کہاں چھوڑ آئے ہیں
مسمار ہورہی ہیں دلوں کی عمارتیں
اللہ کے گھروں کی حفاظت نہیں رہی
خوشی منایئے آئینہ سامنے رکھ کر
خود اپنے کھونے کا ڈر بھی خیال میں رکھیے

او رپھر ندا ایک اُچٹتی سی نگاہ پوری کائنات پر ڈالتے ہوئے یہ سوال کرتے ہیں:

زمین پیروں تلے سر پہ آسماں کیوں ہے
جہاں جہاں جو رکھا ہے وہاں وہاں کیوں ہے

بڑا شاعر، بڑا فنکار کائنات اور اشیائے کائنات پر سوالات قائم کرتا ہے۔ غالب کے یہاں تو اس کی مثالیں بھری پڑی ہیں:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں
کس پردے میں ہے آئینہ پرداز اے خدا
رحمت کہ عذر خواہ لب بے سوال ہے

اسی طرح دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے، والی پوری غزل سوالوں پر قائم ہے۔ اس غزل کے یہ اشعار:

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں عشوہ و غمزہ و ادا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

اور دیوان غالب کی پہلی غزل کا مطلع ہی سوال قائم کرتا ہے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

خیر، عرض یہ کرنا ہے کہ ندا فاضلی نے اس پوری کائنات کو کھلی آنکھوں سے دیکھا اور اس کی بیشتر اشیا کو اپنے باطن میں اتارنے، سنوارنے اور پھر الفاظ کے پیکر میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے نظموں اور غزلوں کو کم و بیش مساوی طور پر اپنی تخلیقات میں برتنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی شاعری پڑھتے ہوئے ایک خاص بات جو سمجھ میں آتی ہے وہ ہے ان کا اپنی مٹی اور اس کی جڑوں سے پیار۔ بلکہ ایسا جیسے ان کے لہو میں اس دھرتی کا رنگ (Ochre) حلول کرگیا ہے۔ ان کے دوہے تو اس بات کی توثیق کرتے ہی ہیں، مفرس و معرب الفاظ و تراکیب سے وہ تقریباً بچتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں صوفی سنتوں کے اقوال احساس کی حد تک اور ہندوستانی رنگ تنفس کی حد تک نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں Urban کردار کے بجائے ایک Rural اور دیہی کردار ابھرتا ہے اور اسی لیے انھوں نے اپنے کلیات کو بھی 'شہر میں گاؤں' سے موسوم کیا ہے۔ آخر میں یہ شعر ملاحظہ کیجیے جو میرے خیال سے ندا فاضلی کی شعری اساس تک پہنچنے کا راستہ دیتا ہے:

کھول کے کھڑکی چاند ہنسا پھر چاند نے دونوں ہاتھوں سے
رنگ اڑائے، پھول کھلائے، چڑیوں کو آزاد کیا

■

Prof. Kausar Mazhari Dept. of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi - 110025
Mob.:9818718524
Email.kausmaz@gmail.com

فاطمہ وصیہ جائسی

کچھ یادیں کچھ باتیں

لئیق رضوی

9 جون 2016 کی تپتی ہوئی دوپہر تھی۔ اچانک فون گھنگھنا اٹھا۔ اسکرین پر وصیہ پھپھی (فاطمہ وصیہ جائسی) کے لکھنؤ والے گھر کا نمبر چمک رہا تھا۔ میں نے تپاک سے آداب کرتے ہوئے خیریت دریافت کی لیکن یہ کیا دوسری طرف سے کوئی جواب ہی نہیں۔ نہ وہ مانوس آواز اور نہ جیتے رہیے! کا شفیق جملہ۔ میں گھبرا کر ہیلو ہیلو کرتا رہا لیکن دوسری طرف کچھ دیر تک سکوت ہی رہا۔ پھر وصیہ پھپھی کی چھوٹی بیٹی نورمہ کی رندھی رندھی سی آواز آئی۔ لئیق بھائی! امی نہیں رہیں۔ میں سناٹے میں آ گیا۔ بیمار تو وہ کافی دنوں سے تھیں لیکن ان کی موت کی خبر آ جائے گی اس کا گمان بھی نہیں تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کہوں؟ کس سے کہوں؟ یادوں کا جیسے ایک بڑا کارواں سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ ان کا مسکراتا اور روشن چہرہ، ان کی بہت سی باتیں اور ملاقاتیں یاد آنے لگیں۔

فاطمہ وصیہ جائسی کی موت، ایک ممتاز شاعر و ادیب کا بچھڑ جانا ہی نہیں، میرے لیے یہ ذاتی صدمہ بھی ہے۔ رشتے داری کے سبب انھیں جاننا پہچاننا تو بچپن سے ہی تھا۔ بڑا ہوا تو ان کی ادبی شخصیت سے بھی ملاقات ہوئی۔ 1989 میں روزنامہ 'قومی آواز' میں ملازمت کے سلسلے میں لکھنؤ میں رہنا ہوا تو ان سے ملاقاتیں اور بڑھ گئیں۔ کام سے جب بھی فرصت ملتی نشاط گنج کی ساتویں گلی میں ان کے گھر (مکان نمبر 37/512) چلا جاتا۔ خاصا بڑا تھا یہ گھر اور اس سے بھی کہیں بڑا ان کا دل۔ بغیر کھانا کھلائے واپس نہ بھیجتیں۔ گھنٹوں باتیں ہوتیں۔ جائس کی۔ عزیزوں کی اور شعر و ادب کی بھی۔ کتابوں کے تحفے ملتے۔ پھر یو جی سی کی فیلوشپ ملنے کے بعد میں تحقیقی مقالہ لکھنے کے لیے الہ آباد یونی ورسٹی سے وابستہ ہو گیا۔ لیکن اس دوران بھی ان سے رابطہ بنا رہا۔ کبھی لکھنؤ جاتا تو ان سے بھی ضرور ملتا۔ وہ بھی کبھی فون اور کبھی خط سے خیریت دریافت کرتی رہتیں۔ جولائی 1992 میں والد کے اچانک انتقال کے وقت عزیز و اقارب نے جو تعزیتی خط بھیجے تھے، ان میں وصیہ پھپھی کا خط سب سے جذباتی اور اثر انگیز تھا میرے لیے۔

ستمبر 2003 میں میں سہارا نیوز چینل میں نوئیڈا آ گیا۔ ان کا بیٹا عدنان اور چھوٹی بیٹی نورمہ بھی نوئیڈا میں ہی مقیم ہیں۔ اپنے بچوں کے پاس جب بھی وہ نوئیڈا آتیں تو ہم سے ملنے راشٹریہ سہارا کے دفتر بھی ضرور آتیں۔ اکثر و بیشتر نواسے ارسلان کے ساتھ اور کئی بار اکیلے بھی۔ یہاں سبھی انھیں جانتے مانتے تھے لیکن کسی چیمبر میں جانے کے بجائے وہ سیدھے میگزین سیکشن میں آ جاتیں۔ حقانی القاسمی، سراج نقوی، نشاں زیدی اور ادبی ذوق والے بعض دوسرے رفیق کار، ہم سب ان کے ارد گرد جمع ہو جاتے۔ جو پاس نہ ہوتا اسے بلا لیا جاتا۔ تمام باتیں ہوتیں۔ ان کی دلچسپ گفتگو میں کبھی بھی وقت گزرنے کا پتہ نہ چلتا۔ بعض دوسرے شاعروں کی طرح فاطمہ وصیہ جائسی کو یوں ہی اپنے اشعار سناتے رہنے کی عادت نہیں تھی۔ کئی بار اصرار کرنے پر بھی وہ ہنس کر ٹال دیتیں۔ البتہ ہر بار وہ یہ جاننے کی کوشش ضرور کرتیں کہ ہم کیا لکھ پڑھ رہے ہیں؟ مفید مشورے بھی دیتیں۔

جب بھی نوئیڈا میں ہوتیں تو کبھی میں چلا جاتا اور کبھی وہ پورے حق سے بلا لیتیں۔ دیر ہوتی تو محبت بھری ڈانٹ بھی سننی پڑتی۔ ایک بار اسی میں انھوں نے شعر و سخن کی ایک محفل بھی سجائی تھی۔ پھر عدنان سیکٹر 139 میں منتقل ہو گئے۔ ان سے آخری ملاقات اسی گھر میں ہوئی تھی۔ کافی کمزور لگ رہی تھیں لیکن جوش اور جذبے میں کہیں کوئی کمی نہیں تھی۔ ہمیشہ کی طرح تپاک سے ملیں۔ اپنی من پسند خاص کالی چائے بھی پلوائی۔ گھنٹوں باتیں ہوئیں۔ تب کون جانتا تھا کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہے۔

فاطمہ وصیہ کی وفات کے ساتھ دبستان جائس کا ایک اور روشن چراغ بھی بجھ گیا۔ ان کی موت جذبوں کی ایک باکمال مصور کی موت ہے۔ ان کی تخلیقی کائنات حسین شعری پیکروں سے عبارت ہے۔ ان کی وفات کے ساتھ دبستان جائس کی غالباً وہ آخری کڑی بھی ٹوٹ گئی، جو یہاں کی پرانی ادبی اور تہذیبی روایتوں اور قدروں کو عصر حاضر سے منسلک کرتی تھی۔ فاطمہ وصیہ دبستان جائس کے تابناک ماضی کی گواہ بھی تھیں اور کہیں نہ کہیں حصے دار بھی۔

فاطمہ وصیہ 10 ستمبر 1940 کو جائس کے ایک ممتاز گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ شعر و سخن کا شوق انھیں وراثت میں ملا تھا۔ ان کے نانا مولانا سید رضی حسن قبلہ رضی جائسی اپنے وقت کے نامور عالم و ادیب تھے۔ والد سید وراثت حسین نقوی اور والدہ سیدہ رضیہ بیگم شعر و ادب کا ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ والدہ تو مدحیہ اشعار بھی کہتی تھیں۔ گھر کے اس ماحول نے ان کے اندر کے شاعر کو بھی جگا دیا۔ جس عمر میں عام بچیاں گڑیا گڈے کھیلتی ہیں فاطمہ وصیہ جائسی نے شاعری شروع کر دی تھی۔ وطن کی زرخیز مٹی اور ادبی ماحول نے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ ابھی محض تیرہ برس کی تھیں کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والدہ انھیں لے کر لکھنؤ آ گئیں۔ لکھنؤ کے اندر ایک جائس تو اب بھی بستا ہے لیکن اس زمانے میں یہ بستی اور گلزار تھی اور ممتاز بھی۔ خانوادۂ اجتہاد کے جائسی علما اور ادیبوں کی ڈیوڑھیاں تشنگان علم و فن کو سیراب کر رہی تھیں۔ قریبی رشتے داریوں کے سبب ان میں سے بیشتر گھروں میں ان کا آنا جانا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان قیمتی لمحوں نے انھیں خوب مالا مال کیا۔ باپ کی اچانک موت اور پھر ہجرت کے سبب مدھم پڑ گئے فاطمہ وصیہ کے ادبی سفر کو اس مانوس ماحول نے نئی رفتار دی۔ شعر تو وہ پہلے سے ہی کہہ رہی تھیں لیکن ان کا ملان سخن سے کسب فیض کے مسلسل مواقع نے ان کے فکر و فن کو نئی اونچائیاں دیں۔ فاطمہ وصیہ نے باضابطہ

طور پر کسی کی شاگردی تو نہیں کی لیکن انھوں نے والدہ کے ساتھ ساتھ اپنے خانوادے کے جن قلمکاروں سے براہ راست یا بالواسطہ کسب فیض کیا، ان میں ظفر مہدی گہر، کامل حسین کامل، کلب حسین مائی، محمد حسن سالک، باسط حسن ماہر، منظر حسین منظر، نبی حسن نبی، سید محمد بسمل وغیرہ خاص ہیں۔ فاطمہ وصیہ نے 'معراج قلم' سمیت کئی مقامات پر اس کا مخلصانہ اظہار کیا ہے۔

شعر و سخن کے ساتھ ساتھ انھیں تحصیل علم کا بھی بے پناہ شوق تھا۔ والد کی موت کے بعد رک گئے مکتبی تعلیم کے سلسلے کو شادی کے پندرہ برس بعد 1977 میں انھوں نے از سر نو شروع کیا اور لکھنؤ یونیورسٹی سے امتیازی نمبروں میں بی اے اور ایم اے (اردو) کی ڈگریاں حاصل کیں۔ فاطمہ وصیہ کے لیے شعر و سخن فرصت کا مشغلہ یا نام و نمود کی جستجو نہیں تھی۔ وہ ادب کے مثبت اور مقصدی رویوں کی قائل اور پیروکار تھیں۔ انھوں نے امید و عمل کے سبق دیے ہیں۔ فاطمہ وصیہ جائسی کل وقتی ادیب تھیں اور ان کا قلم 9 جون 2016 کو ان کی سانس کے ساتھ ہی رکا۔ انھیں لکھنؤ کے حسینہ غفراں مآب میں سپرد خاک کیا گیا۔ وہ اچھی شاعرہ تھیں تو بہت اچھی انسان بھی۔ رشتوں کا لحاظ اور پاسداری ان کی شخصیت کا حصہ تھا۔ بڑوں کا جتنا احترام چھوٹوں سے اتنی ہی شفقت۔ جو ان سے ملا ان کا قائل ہو گیا۔ فاطمہ وصیہ نے زندگی کے تمام اتار چڑھاؤ دیکھے۔ وقت نے بار بار ان کا امتحان لیا لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ ہر بار وہ نئے جوش کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بڑھیں۔ خود کہتی ہیں:

غم ہستی غم جاناں غم دوراں ہو کر
زندگی اپنی گزرتی رہی طوفاں ہو کر

اپنے آبائی وطن جائس پر فاطمہ وصیہ کو بڑا ناز تھا۔ وہ روایتی طور پر خود کو جائسی نہیں لکھتی تھیں بلکہ ان کے اندر ایک جائس بستا تھا۔ ایک جیتا، جاگتا جائس۔ ان کے خوابوں اور خیالوں کا جائس۔ وہ جہاں بھی رہیں ان کے دل و دماغ میں بسا یہ جائس ہمیشہ ان کے ساتھ ہی رہا۔ وطن کا حوالہ ان کے لیے سرمایہ افتخار تھا اور یہاں کی باتیں اور یادیں ان کی زندگی اور شخصیت کا حصہ۔ ایک اٹوٹ حصہ۔ جائس ان کے نام سے ہی نہیں ان کی شخصیت سے بھی وابستہ تھا۔ انتہائی گہری اور جذباتی وابستگی تھی یہ۔ جائس کا محرم انھیں بہت یاد آتا تھا۔ جب بھی محرم کے آگے پیچھے ملاقات ہوتی، جائس کے محرم کی باتیں کرتیں۔ اب بھی وہ مرثیہ یا نوحہ پڑھا جاتا ہے؟ کون پڑھتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اپنے بچپن کے محرم کی باتیں بتاتیں۔ 'بڑے علم' کی زیارت کرنے وہ کئی بار موقع نکال کر آٹھویں محرم کو جائس آئیں بھی۔ وہ جائس کی ادبی اور تہذیبی قدروں کی سچی امین تھیں۔ اپنی ادبی حس اور صلاحیتوں کے لیے انھوں نے وطن کی مٹی کا شکریہ ادا کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتی ہیں:

'جائس کی زرخیز مٹی کا جو رچاؤ میرے رگ و پے میں تھا اس کا اثر ہے کہ میں کچھ لکھنے پڑھنے کے قابل ہوں۔ ورنہ میری ذات تو ایک ذرۂ بے مایہ ہے جس کے پاس کچھ بھی نہیں۔'

یہی نہیں فاطمہ وصیہ جائسی کی باتوں میں، ان کے اشعار میں بھی جائس بار بار جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ چند اشعار:

سجدہ گاہ مہ و اختر ہے زمین جائس
آسماں سے کہیں بہتر ہے زمین جائس

میں سب کو دیتی ہوں ایثار و خلق کی دعوت
مری نواؤں میں پنہاں ہے جذب پدماوت
ہے مجھ کو فخر کہ میرا بھی وطن ہے جائس
جہاں کے لوگوں نے بانٹی ہے پیار کی دولت

یا پھر لکھنؤ اور جائس کے تعلق سے ان کی غزل کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

آج بھی آواز دیتی ہے یہ جائس کی زمیں
لکھنؤ! ہم بھی تو ہیں تیرے دبستاں کے قریب

فکر و فن کے تعلق سے فاطمہ وصیہ جائسی صاحب طرز شاعرہ تھیں۔ رباعی سے مسدس اور غزل سے مرثیہ تک، انھوں نے تقریباً تمام شعری سانچوں اور اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ فنکارانہ برتاؤ اور انفرادی رنگ و آہنگ کے سبب ہر جگہ ان کے دستخط الگ سے نظر آتے ہیں۔ شاعری کی ابتدا جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے گیارہ برس کی عمر میں نوحہ گوئی سے ہوئی تھی۔ عرصے تک نوحہ و سلام گوئی پر ہی فوکس رہا۔ پھر بچوں کے لیے بھی لکھنے لگیں۔ پانچویں دہے کے نصف آخر میں ان کی تحریریں اس وقت کے موقر اخبار و جرائد میں جگہ پانے لگیں تھیں۔ کم لوگ جانتے ہیں کہ فاطمہ وصیہ کو صحافت سے بھی دلچسپی تھی۔ تخلیقی سفر کے ابتدائی زمانے میں انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی سید سبط رضی (جو بعد میں منسٹر اور گورنر ہوئے) کے ساتھ ایک قلمی ادبی پرچہ 'کہکشاں' بھی جاری کیا تھا۔ یہ پرچہ کوئی ایک برس تک پوری شان سے نکلا۔ 'کہکشاں' کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتی ہیں:

'ایک ماہنامہ کہکشاں کے نام سے نکالا جاتا تھا۔ جس میں چھوٹے چھوٹے مضامین، نظمیں، چٹکلے، سوال و جواب سب ہی کچھ ہوتا۔ ضخامت بھی اچھی خاصی ہوتی۔ یہ رسالہ ایک سال تک نکلتا رہا ہاتھ سے لکھ کر۔ اس لیے کہ اس وقت کتابت اور طباعت کا بار اٹھانا مشکل تھا۔ بس کاغذ اور قلم کے ذریعے سے ہی اپنے ذوق کی تسکین کر لی جاتی۔'

غزل اور نظم کی طرف وہ قدرے دیر سے آئیں لیکن ایک طویل مشق سخن اور زبان و بیان پر عبور کے سبب جلد ہی یہاں بھی ان کی پہچان مسلم ہو گئی۔ فاطمہ وصیہ جائسی نے کہی تو نظمیں بھی ہیں لیکن ان کی غزلیں خاص ہیں۔ ان کے فکری رویے اور تخلیقی جوہر یہاں زیادہ خوبصورتی سے سامنے آتے ہیں۔ ان کے کئی مجموعہ کلام شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں 'ریزہ ریزہ حیات' (1983)، 'قطرہ قطرہ سمندر' (1986)، 'طرز گفتگو' (1990) اور 'روبرو' (2002) خاص ہیں۔ 'کرچ کرچ زندگی' عنوان سے دیوناگری، میں بھی ایک انتخاب شائع ہو چکا ہے۔

فاطمہ وصیہ کی شاعری احساس و جذبات کی موثر صورت گری ہے۔ ان کے یہاں تفکر بھی ہے اور فلسفہ بھی۔ زبان و بیان کی روانی بھی اور تخیل کی بلند پروازی بھی۔ تاریخ کا عرفان بھی اور ادبیت کی روشنائی بھی۔ روایت کا احترام اور جدتوں کی جستجو بھی۔ کلاسیکی رنگ اور رچاؤ کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں جابہ جا نیا احساس بھی دھڑکتا ہوا نظر آتا ہے۔ فاطمہ وصیہ نے کتابیں ہی نہیں زندگی کو بھی پڑھا تھا۔ ان کی شاعری کا خمیر ان کے عمیق مطالعے اور مشاہدے سے ہی اٹھتا ہے۔ فاطمہ وصیہ جائسی جذبوں کی مصور تھیں۔ انھوں نے لفظوں سے فکر و احساس

فاطمہ وصیہ کی وفات کے ساتھ دبستان جائس کا ایک اور روشن چراغ بھی بجھ گیا۔ ان کی موت جذبوں کی ایک باکمال مصور کی موت ہے۔ ان کی تخلیقی کائنات حسین شعری پیکروں سے عبارت ہے۔ ان کی وفات کے ساتھ دبستان جائس کی غالباً وہ آخری کڑی بھی ٹوٹ گئی، جو یہاں کی پرانی ادبی اور تہذیبی روایتوں اور قدروں کو عصر حاضر سے منسلک کرتی تھی۔ فاطمہ وصیہ دبستان جائس کے تابناک ماضی کی گواہ بھی تھیں اور کہیں نہ کہیں حصے دار بھی۔

کے خوبصورت شعری پیکر تراشے ہیں۔ تخیل کی رنگارنگ چھینٹوں نے ان کے اشعار کو اور بھی حسین اور دلکش بنا دیا ہے۔ نرم و نازک لہجہ، جذبوں کی معصومیت، احساس کی ملائمت اور اظہار کی بے ساختگی نے ان کے اشعار میں بلا کی کاٹ پیدا کر دی ہے۔ چند منتخب اشعار ملاحظہ ہوں:

جہاں لوگوں میں دانائی بہت ہے
وہیں ہنگامہ آرائی بہت ہے
گفتگو سے تری باتوں کا بھرم ٹوٹ گیا
جس کی کرتے تھے پرستش وہ صنم ٹوٹ گیا
رہرو کو یاد ہی نہیں اپنی مسافتیں
منزل پہ جاکے راہ کے خم بھولتا گیا
اس مسافر سے تو پوچھو کہ رہ غربت میں
پاس منزل کے وہ پہنچا ہے کہ دم ٹوٹ گیا
نہیں خیال تو کچھ انتظار کس کا ہے
یہ ذہن و دل پہ بلا وجہ بار کس کا ہے
ہمارا نام تو غیروں میں ہو گیا شامل
جو لوگ اپنے ہیں ان میں شمار کس کا ہے
طوفان میں پھنسے تو کنارے تک آ گئے
ساحل نے ان کو پھر سے ابھرنے نہیں دیا
ہم نے امیر شہر کو سجدہ نہیں کیا
خودداری مزاج نے گرنے نہیں دیا

زبان و بیان پر انھیں زبردست قدرت حاصل تھی۔ صاف ستھری زبان، سدھا ہوا لہجہ، لفظوں کی مناسب نشست و برخاست، محاوروں کا برمحل اور فنکارانہ استعمال انھیں الگ پہچان دیتا ہے۔ انھوں نے نئی ترکیبیں اور علامتیں تراشی ہیں تو تشبیہوں اور استعاروں کو نئے مدارج سے بھی روشناس کرایا ہے۔ مضمون آفرینی، تخیل کے جداگانہ رنگ، لفظوں کی مناسب نشست و برخاست، رعایت لفظی اور بندشوں کی چستی نے ان کے اشعار میں اور بھی جاذبیت پیدا کر دی ہے:

نظارہ چاہیے تو بیاباں میں آیئے
سب کچھ وہاں پہ سچ ہے ذرا سا فسوں نہیں
دنیا یہ چاہتی ہے وصیہ ہر ایک سے
اپنی تو سب کہوں پہ کسی کی سنوں نہیں
دل میں اس کا خیال کیوں آیا
موسم برشگال کیوں آیا
اس شہر میں لٹ جانے کے امکان بہت ہیں
جس سمت نظر ڈالیے انسان بہت ہیں
نہ آشیاں کا نہ ان کی جبین ناز کا ہے
معاملہ تو ہمارے سر نیاز کا ہے
ہمارا سر ہے سلامت تو در بھی ڈھونڈیں گے
انھیں یہ وہم کہ ان کا ہی آستاں ٹھہرا

فاطمہ وصیہ سکہ بند ترقی پسند ادیب تو نہیں تھیں لیکن ان کے اشعار میں ترقی پسندانہ فکر و فلسفہ سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر انسانی حرمت اور حریت کی وکیل اور پیروکار تھیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کو عصری تقاضوں سے بھی ہم آہنگ رکھا ہے۔ زندگی کی تپش اور دنیا کی سفاکیوں کی آگ میں جھلسے چہرے ان کے اشعار کے آئینے میں پوری دردمندی کے ساتھ منعکس ہوتے ہیں۔ وقت کی بے رحمی، زمانے کی چیرہ دستیاں اور انسانی ابتذال اور اخلاقی گراوٹ پر وہ کڑے سوال کھڑے کرتی ہیں۔ فرد اور سماج کے مسائل انھیں بھی بے چین کرتے ہیں۔ انھوں نے نابرابری، تفریق، غربت، بے ایمانی جیسے سماج کی ناہمواریوں، ناانصافیوں اور سماج کے کالے کونوں کی طرف بار بار انگلی اٹھائی ہے۔ صرف انگلی ہی نہیں اٹھائی بلکہ ادبی مداخلت بھی کی ہے:

یہ غم کی بھیڑ اور یہ دنیا کے راستے
ان کی عنایتوں کے سوا اور کچھ نہیں
یہ رنگ و نسل اور تشدد کے سلسلے
دشمن کی راحتوں کے سوا اور کچھ نہیں
دام میں طائر کو لے جاتی ہے دانے کی تلاش
پھر بھی مظلومی و محرومی مقدر ہی تو ہے

فاطمہ وصیہ جائسی کے بیشتر کلام میں یوں احساس کی مدھم مدھم لہریں ہولے ہولے رواں دواں ہیں لیکن جذبات کی شدت نے کہیں کہیں ان کی آواز کا لہرہ قدرے تیز کر دیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بادشاہ وقت کوئی اور کوئی مجبور کیوں
بن گیا ہے اک زمانے سے یہی دستور کیوں
دھوپ میں پانی میں سردی میں ہوا کے ساتھ ساتھ
جان اپنی دے رہا ہے آج پھر مزدور کیوں
جنس گراں بہا کا خریدار کون ہے
کردار ہے تو صاحب کردار کون ہے
یوں تو برابری ہے مگر سچ بتایئے
آزاد کون اور گرفتار کون ہے
دل میں محبتوں کے سوا اور کچھ نہیں
تیری حکایتوں کے سوا اور کچھ نہیں

فاطمہ وصیہ جائسی کے یہاں نظمیں ہر چند کم ہیں لیکن خیال کی ندرت اور تخلیقی برتاؤ کا سلیقہ اس میدان میں بھی انھیں پہچان اور اعتبار بخشتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار ہی دیکھیے:

بھول جانے کی عادت نہ ہوتی اگر
کیسے کٹتا بھلا زندگی کا سفر
کتنی یادیں تھیں کتنی ملاقاتیں تھیں
کتنی باتیں تھیں کتنی حسیں راتیں تھیں
زندہ رہتے ہیں اور صبر کرتے ہیں ہم
کس طرح سے کہیں بھول جاتے ہیں ہم

فاطمہ وصیہ جائسی نے تقدیسی شاعری کے باب میں بھی اپنے دستخط ثبت کیے ہیں۔ انھوں نے نعت و منقبت بھی کہی ہیں اور نوحہ، سلام اور مرثیے بھی۔ 'تمنائے فاطمہ' (1997) اور 'معراج قلم' (1999) عنوان سے سلام اور قصائد کے مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ 'سکوت گویا' (2008) ان کے مراثی اور نوحوں کا مجموعہ ہے۔ زبان و بیان کے تعلق سے فاطمہ وصیہ جائسی کے مراثی یوں تو روایتی انداز کے ہیں لیکن موضوعات کی سطح پر انھوں نے بعض تجربے بھی کیے ہیں۔

1951 سے 2016 تک فاطمہ وصیہ جائسی کا تخلیقی سفر نصف صدی سے بھی زائد عرصے پر محیط ہے۔ انھوں نے ایک بڑا ادبی سرمایہ یادگار چھوڑا ہے۔ آپ بیتی اور جگ بیتی دونوں کو موضوع بنایا ہے۔ ان میں نثر بھی ہے اور منظومات بھی۔ مختلف شعری اصناف پر مشتمل ان کے کئی مجموعہ ہائے کلام منظر عام پر آ چکے ہیں۔ بچوں کے لیے ان کی نظموں کا مجموعہ 'بچپن' (1993) بھی شائع ہو چکا ہے۔ لیکن بہت سی تحریریں اب بھی غیر مطبوعہ ہیں۔ کافی چیزیں رسائل میں بکھری ہوئی ہیں۔ ضرورت ہے انھیں یکجا کر کے منظر عام پر لانے کی۔ ان کے ادب اطفال پر بھی الگ سے کام ہونا چاہیے۔ یہی ان کو سچا خراج عقیدت بھی ہوگا۔

Laeeq Rizwi
96/B3, Arawali, Sector 34, Noida - 201301 (UP)
E-mail.:laeeqrizwi@yahoo.co.in

رضوانہ ارم

جلتے شبدوں کی آنچ اور کومل لہجے کا شاعر
منظر شہاب

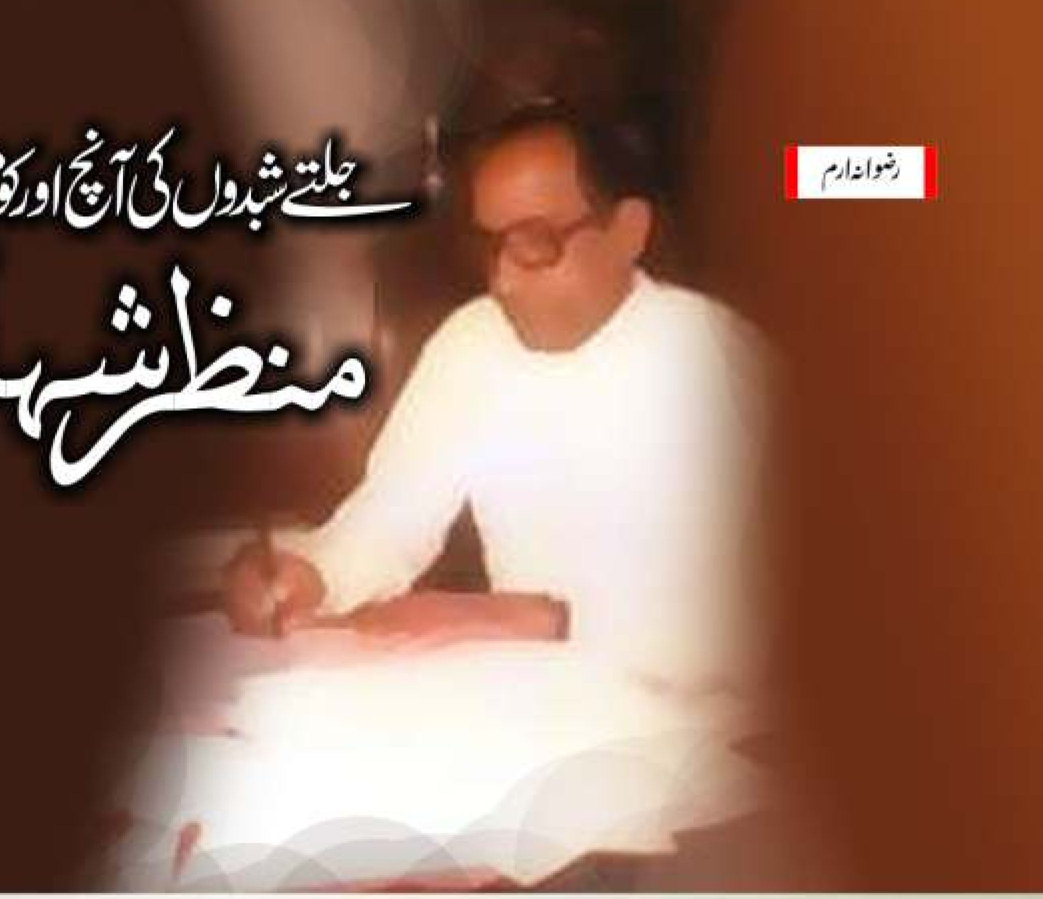

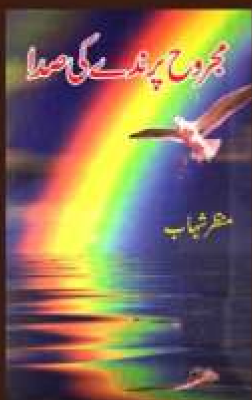

اس کائنات رنگ و بو میں کچھ ایسی شخصیتیں بھی صفحۂ ہستی پر نمودار ہوتی ہیں جنکی ہستیاں فنا ہو جاتی ہیں مگر ان کے علمی و ادبی، تخلیقی واختراعی کارنامے آنے والی کئی نسلوں کے اذہان کی آبیاری کرتے ہیں اور علم و ادب، درس وتدریس کا زرّیں باب بن جاتے ہیں۔ انگریزی مفکر۔ Samuel Johnson نے بھی کہا ہے کہ۔

"It matters not how a man dies ,but how he lives,Tha act of dying is not importance, it lasts so short a time."

جناب منظر شہاب (شاعر و ادیب) کا شمار بھی نابغہ روزگار ہستیوں میں ہوتا ہے۔ جو نہ صرف اپنی ذات سے انجمن تھے بلکہ جن کے علمی، ادبی، تدریسی، و تنظیمی کارنامے صرف سرزمین جھارکھنڈ و بہار کے ہی لیے باعث افتخار نہیں ہیں بلکہ عالمی شعری، نثری اور تنظیمی فکری کینوس پر بھی اپنی تمام تر تابانیوں کے ساتھ جلوہ فگن رہیں گی۔ کیونکہ ادیب و مفکر کی ذات و کارنامے ماورائے حیات و ممات و زماں ومکاں ہوتے ہیں۔ انگریزی فلاسفر Alferd de Mysset کے لفظوں میں "Great artists have no-country"

ترقی پسند ادیب و دانشور کی کثیر الجہات شخصیت اور فکر وفن کے کئی پہلو ہیں۔ وہ ایک اچھے استاد، پرنسپل، منتظم، مدیر، ہدایت کار، اداکار، مصنف، شاعر و نثر نگار اور ترقی پسند تحریک کے فعال ومحرک رکن تھے اور سماجی و سیاسی استحصالی قوتوں کو شکست دینا بھی ان کا نصب العین رہا ہے۔ وہ اپنی تخلیقات میں معاملات حُسن وعشق کو ہی شائستگی کے ساتھ نہیں برتتے بلکہ غم دوراں کی بھی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔

مرحوم نے کم وبیش 90 سال کی عمر پائی اور عمر کے اس طویل عرصے میں ترقی پسند تحریک کے نقش ہائے رنگا رنگ تراشے اور عشق و اشتراکیت کے امتزاج سے بہترین شعری پیکر اُبھارے۔

مرحوم اس ادبی کہکشاں کے آخری درخشندہ ستارے تھے، جن میں انور عظیم، کلام حیدری، غیاث احمد گدی، اختر پیامی، نوشاد نوری، احمد یوسف، مظہر امام اور شکیل الرحمٰن شامل تھے۔ منظر شہاب کی تخلیقی و تشکیلی صلاحیت کو پروان چڑھانے میں اور ان کے فکر وفن کو زرخیزی وشادابی بخشنے میں 'انجمنوں' اردو اداروں، تحریری و مذاکراتی ادبی مقابلوں و مسابقوں، کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کا ترجمان رسالہ 'نئی راہ' اخبارات میں کالم نویسی اور دربھنگہ، پٹنہ، و جمشید پور کی علمی وادبی نیز سیاسی سرگرمیوں کا بڑا عمل دخل رہا ہے۔ بقول منظر شہاب:

''ہندوستان بھر کی نمائندہ زبانوں اور تہذیبوں کی قوس قزح نے میرے ذہن کو کشادگی بخشی 'بالخصوص اڑیہ، بنگلہ اور مراٹھی ڈراموں نے بہت متاثر کیا، ان کی قابل رشک کامیابی نے جذبات کو اس حد تک مشتعل کیا کہ میں نے بھی کالج کی 'بزم اردو' کی طرف سے ڈرامہ اسٹیج کرنے کا فیصلہ کر لیا۔''

(رسالہ: زبان وادب، پٹنہ، شمارہ، جنوری تا اپریل 1994)

شعری و نثری دونوں ہی اصناف میں انھوں نے اپنی جودت طبع اور منفرد انداز بیاں سے اظہار کے نئے نئے گل بوٹے کھلائے ہیں۔ ترقی پسند تحریک نے اردو زبان وادب کو ذات سے کائنات کے سفر پہ گامزن کیا اور اردو ادب کو عالمی ادب سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ بخشا، متنوع موضوعات کو رنگا رنگ مسائل سے ہم آہنگ کر کے ایک نیا جزیرہ دریافت کیا ہے۔

زندگی کے مرکزی اور اہم حقائق ومسائل و واردات قلبی و دماغی غزل کے موضوع ہوتے ہیں۔ ان حقائق میں واردات عشق کو اولیت حاصل ہے۔ بقول آل احمد سرور:

''غزل بہر حال زخمی غزال کی آہ یا تیر نیم کش یا محبوب سے باتیں کرنے کا نام ہے۔ یعنی یہ عشقیہ اور غنائیہ شاعری ہے لیکن یہ عشق حقیقی بھی ہو سکتا ہے اور مجازی بھی، خدا سے بھی، محبوب سے بھی، کسی عقیدے سے یا کسی مسلک سے بھی یعنی مسئلہ نظارے کا نہیں نظر کا ہے۔''

(اردو غزل، مرتبہ ڈاکٹر کامل قریشی، ص 26)

'پیراہن جان' اور 'مجروح پرندے کی صدا' منظر شہاب کے مجموعے ہیں جو اردو شعر وادب کی تاریخ میں

اجتہادی شان رکھتے ہیں ان کی شاعری الفاظ کے خوبصورت برتاؤ، لہجے کی تازگی اور فرحت بخش انداز بیاں کا دلکش امتزاج ہے، جس کی بھینی بھینی خوشبوئیں مشام جاں کو معطر کرتی ہیں۔ منظر شہاب بذات خود پیراہن جاں کے متعلق کہتے ہیں کہ:

"پیراہن جاں میری تمام عمر کے مختلف النوع احساسات کی کشید ہے، میری یہ آرزو رہی ہے کہ کبھی ذات کبھی کائنات اور کبھی دونوں کے باہمی ارتباط کے پس منظر میں زندگی کے جلوۂ صد رنگ کی عکاسی کو اپنا شیوۂ فن بناؤں۔"

منظر شہاب کی تخلیقات زندگی، کائنات کے حسن، انسانی احساس وجذبات اورسماج کے مسائل سے براہ راست سروکار رکھتی ہیں۔شعر کا لہجہ شعور کے سمندر کا استعارہ ہے۔ بیشتر غزلیں اور نظمیں نغمگی اور شعریت سے لبریزہیں اور مقصدی ہونے کے باوصف اصول جمالیات اور تہذیب عشق وتزئین حسن و جمال سے آراستہ ہیں۔

منظر شہاب نے کلاسکی شعراء سے لے کر اقبال اور فیض تک اثرات قبول کیے اور شعری روایت سے پورا استفادہ کیا پھر ان تمام تجربوں کو شعر کے پیکر میں ڈھالا ہے۔ روایت کی پیروی کے باوجود روایت سے انحراف برتتے ہوئے جدید ترقی پسند رجحان کو بھی اپنایا۔

انھوں نے اپنے تجربات واحساسات اور جذبات و مشاہدات کو فنی حسن میں تحلیل کرکے تخیل کو پرواز، خیال کو وسعت، حسن و جمال کو دلآویزی عطا کی ہے۔ تصور عشق، تقدیس حسن، پیکر تراشی، مناظر قدرت کی ساحرانہ تصویرکشی اور ان کا شدت احساس سے پگھلتا ہوا تندی صہبا سا نرم و سبک لہجہ ان سے ایسے شعر کہلواتا ہے:

زم لہجہ بھی عجب آگ لگاتا ہے شہاب
آگ دھیمی ہی سہی دل سے لپٹ جاتی ہے

متعدد ناقدین ادب اور اہل فکر وفن نے منظر شہاب کی شاعری پہ اظہار خیال کیا ہے ان میں، ڈاکٹر وہاب اشرفی، جناب مظہر امام، ڈاکٹر رش اختر، خلیل الرحمن اعظمی مظفر اقبال، شکیل الرحمن، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمن فاروقی، قمر رئیس، ابو الکلام قاسمی، بلراج کومل، کلام حیدری، صلاح الدین پرویز، علقمہ شبلی، سید احمد قادری پروفیسر افتخار اجمل شاہین کے نام سرفہرست میں جنھوں نے ان کی شاعری میں جمالیات اور مقصدیت کے خوبصورت امتزاج کی نشاندہی کی ہے نادر تشبیہات اور تازہ کار استعارات وتراکیب، رمزو کنایہ، پیکر تراشی اور شدت جذبات اور تخیل کی بلند پروازی کو ان کی شاعری کا وصف خاص بتایا ہے۔ منظر شہاب ایک قادر الکلام شاعر ہیں ان کی شعری کائنات میں نظم و غزل کے علاوہ دوسری اصناف شاعری مثلاً: رباعی، قطعہ اور گیت بھی مجموعہ کلام میں شامل ہیں۔ منظر شہاب کا طبعی رجحان ومیلان، نرم و مدھم لہجہ، نیم رومانی اور نیم فکری شاعری کی طرف رہا ہے، جس پر رمزیت کا انداز نمایاں ہے۔اس رجحان کی نمائندگی ترقی پسندوں میں، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، مجید امجد، اختر الایمان، ساحر لدھیانوی، ابن انشا، مظہر امام، کمال احمد صدیقی، رفعت سروش اور اسی طرح کے دوسرے شعرا کر رہے تھے۔ بغاوت، انقلاب، احتجاج اور جمالیات سب کی بہترین آمیزش سے شاعری کا خمیر گوندھا گیا ہے۔ انھوں نے دوسرے ترقی پسند شاعروں کی طرح غم جاناں اور غم دوراں دونوں کے اظہار میں روایت شکن رویہ اختیار کیا۔

مجھے باغباں بتائے، یہ بہار ہے تو کیسی
نہ وہ فصل گل کا سودا، نہ وہ چاک دامنی ہے
اب اس کو تم بہار کہو، یا خزاں کہو
ہیں خون عندلیب سے عارض گلوں کے نم
سجدے کے طلبگار صنم گر بھی، صنم بھی
ہر آدمی لگتا ہے خدا شہر ہوس میں
ضمیر عشق میں میری نوائے گرمی شوق
بلا کشان محبت کی آبرو ہوں میں

بقول سوسن لنگر "فن ایسی ہستیوں کی تخلیق ہے جو انسانی احساس کی علامت ہے"۔

منظر شہاب کی تخلیقات زندگی، کائنات کے حسن، انسانی احساس وجذبات اور سماج کے مسائل سے براہ راست سروکار رکھتی ہیں۔شعر کا لہجہ شعور کے سمندر کا استعارہ ہے۔ بیشتر غزلیں اور نظمیں نغمگی اور شعریت سے لبریز ہیں اور مقصدی ہونے کے باوصف اصول جمالیات اور تہذیب عشق وتزئین حسن و جمال سے آراستہ ہیں۔ شدت جذبات کا شعری اظہار فن کے تمام ترچاؤ اور تقاضوں سے ہم آہنگ ہے جو انسانی احساس کی علامت ہیں سماجی و سیاسی استحصال کے خلاف احتجاج و انحراف کو بیان کرتے ہیں:

تمام عمر نکہہ دار و غم گسار رہی
وہ اک نگاہ جو یکتا ہے سب نگاہوں میں

ذاتی کوائف

اصل نام: محمد یٰسین، **قلمی نام:** منظر شہاب
والد: مولانا سید محمد طٰہٰ الٰہی فکری (مرحوم)
والدہ: سیدہ بی بی سکینہ خاتون (مرحومہ)
پیدائش: 31 مئی 1927 شاہو بیگھہ ،نوادہ
وطن: عظیم آباد
بحیثیت مدرس پہلی بحالی: جولائی 1949 میموریل خانقاہ انگلش ہائی اسکول، اسلام پور، **دوسری تقرری:** 1953 کو پریتو کالج جمشید پور، شعبۂ اردو بحیثیت لکچرر، **تیسر تقرری:** بانی پرنسپل کریم سٹی کالج جمشید پور 21 جنوری 1964
ملازمت سے سبکدوش: 1989
تخلیقات کی اشاعت: 1941 دربھنگہ، پٹنہ، کلکتہ، اور دہلی کے مختلف رسائل وجرائد میں افسانے شائع ہوئے۔ 'ماہنامہ تہذیب' نے انہیں برصغیر میں متعارف کروانے میں نمایاں رول ادا کیا۔
بحیثیت ڈرامہ ہدایت کار: (1) پردہ اٹھاؤ، پردہ گیراؤ (اوپندر ناتھ اشک) 1954، (2) مسٹر پرول ویدم 1956، (3) بھگوان چور بھیجو 1958 (4) میر کلو کی گواہ (5) Monkey's paw (تیسری خواہش) جیسے ڈراموں کی ہدایت سازی کی ہے۔
کلیدی کردار: مہاراشٹر منڈل جمشید پور کا اسٹیج ڈرامہ 'جلتے دل اور جلتی راہیں' میں انھوں نے کلیدی کردار ادا کیا۔
مدیر: ۔رسالہ نئی کرن، نئی راہیں اور راحیل
تصانیف: پیراہن جاں (شعری مجموعہ) 1989، شاخ شاخ پھول غزلوں کا مجموعہ (زیر طبع)، میر تقی میر، خاندان، زمانہ، شخصیت اور شاعر، انتخاب نثر اردو، بہار کے جلتے بجھتے چراغ (مجموعہ مضامین)، پداول (ودیاپتی۔اردو ترجمہ)، تمثیلوں کا مجموعہ (ویس بدیس کی ایکانکی۔(زیر طبع)، حرف حرف داستان (ذاتی خطوط کا مجموعہ)زیر طبع، اور پھر بیاں اپنا (مضامین کا مجموعہ 2002)، مجروح پرندے کی صدا (شعری مجموعہ 2007)، ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے (منظر شہاب پر مضامین 2011)
تحقیقی کام: ۔منظر شہاب: حیات اور فکر وفن از ڈاکٹر صلاح الدین، رام نگری، متھلا یونیورسٹی، منظر شہاب شخصیت اور فن از ابرار مجیب، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا:
انتقال: 7 ستمبر 2016 شب آٹھ بجے آزاد نگر جمشید پور
(ماخوذ از منظر شہاب: حیات اور فکر وفن، ڈاکٹر صلاح الدین رام نگری)

بندھے ہوئے ہیں کہ کھل کر بکھر نہ جائیں ہم
وگرنہ اب تو تعلق سزا سزا سا ہے
دیکھیے جاں پہ گذرتے ہیں حوادث کیا کیا
آتشیں موج کی ہلچل ہے بہت دل کے قریں
ہر عہد میں، ہر دور میں سولی پہ چڑھی ہے
حق مانگنے والوں کی صدا شہر ہوس میں
منظر شہاب آؤ جی بھر کے ہم بھی رو لیں
چپ سادھنے سے عہد ماتم نہیں بدلتا
یہ ارتقائے جہاں انحراف کا انعام
وہ انحراف جو تجدید سے عبارت ہے

'پیراہن جاں' کی بیشتر نظمیں 'نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہ گزر پھر بھی' کا استعارہ ہیں۔ سنہرے لمحے، جشن کی رات، چاندنی رات، ساقی نامہ، حکم امتناعی، پہاڑی لیلیٰ، لہو ترنگ وغیرہ جمالیاتی رچاؤ، نغمگی، تشبیہ واستعارے، علامات وتلازموں، پیکر تراشی، سوزوساز حیات وکائنات اور تمام تراشترا کی موضوعات کے باوجود شاداب نئی رت اور ترو تازہ سبک گام ہواؤں اور دلکش پیرائے بیان کا گلدستہ ہیں۔ میں یہاں صرف بخوف طوالت ان کی ایک نظم 'سنہرے لمحے' درج کرنا چاہوں گی:

سنہرے لمحے
نئی سحر کے سنہرے لمحے
رخ جہان سے ردائے ظلمت ہٹا رہے ہیں
ردائے ظلمت ہٹا رہے ہیں، فضا کو زریں بنا رہے ہیں
اُفق کے رخسار نیلگوں پر، شفق کا غازہ دمک رہا ہے
شفق کا غازہ جہار عالم کو آئینہ سا دکھا رہا ہے
یہاں زمان ومکاں کی کوئی بھی قید باقی نہیں رہی ہے
وہ آسماں ہو، زمیں ہو یا وقت کا خرام رواں دواں ہو
تمام مشاطۂ سحر کے کریم ہاتھوں جمال تزئین پا رہے ہیں
فضا میں جادو جگا رہے ہیں

'پیراھن جاں' کی بیشتر نظمیں 'نئی نئی سی ھے کچھ تیری رہ گزر پھر بھی' کا استعارہ ھیں۔ سنہرے لمحے، جشن کی رات، چاندنی رات، ساقی نامہ، حکم امتناعی، پہاڑی لیلیٰ، لہو ترنگ وغیرہ جمالیاتی رچاؤ، نغمگی، تشبیہ واستعارے، علامات وتلازموں، پیکر تراشی، سوز وسازحیات وکائنات اور تمام تراشترا کی موضوعات کے باوجود شاداب نئی رت اور ترو تازہ سبک گام ھواؤں اور دلکش پیرائے بیان کا گلدستہ ھیں۔

اردو ادب کے نثری شہ پارے ہماری ادبی وراثت کا بیش قیمتی سرمایہ ہیں، جن کی تب وتاب سے اکیسویں صدی کی نثر منور ہے۔ مقفّٰی ومسجع عبارت سے لے کر آسان وعام فہم نثری تحریروں تک نثر کی اپنی ایک روشن تاریخ رہی ہے۔ رجب علی بیگ سرور، غالب، میرامن، مولانا شبلی، سرسید، حالی، مولوی ذکاء اللہ، محمد حسین آزاد، سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، نیاز فتح پوری، سجاد حیدر یلدرم، مہدی افادی اور سجاد انصاری کی نگارشات ادب عالیہ کا درجہ رکھتی ہیں، منظر شہاب کے نثری کارنامے اسی

سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں جن کے مطالعے کے بغیر ان کی علمی قدروقیمت زبان وبیان، بلندی فکر اور طرز بیاں کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔ قمر رئیس نے ان کے مضامین کے مجموعے 'اور پھر بیاں اپنا' پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''منظر شہاب کی ذہانت، تخلیقی صلاحیت اور ذہنی وسعت کے نقوش ان کے نثری مضامین پر مشتمل کتاب 'اور پھر بیاں اپنا' میں دیکھے جا سکتے ہیں۔۔ انھیں میتھلی زبان کے شاعر ودیاپتی کی تخلیق 'پداولی' میں فلسفہ حسن و جمال کی تجسیم کاری نے خاص طور پر متاثر کیا ہے''۔

منظر شہاب نے 'اور پھر بیاں اپنا' میں قدیم وجدید ادبا وشعرا کی کہکشاں سجادی ہے اور خوش رنگ، سحر انگیز، دلکش انداز بیاں سے مملوشخصیات سے وابستہ ہر موضوع کا حق ادا کر دیا ہے، وہ بھی اپنے منفرد حسن بیاں اور سلیس وسادہ نثری پیرائے میں، جس کی فہرست کچھ اس طرح ہے:

'منظر شہاب کی ذھانت، تخلیقی صلاحیت اور ذھنی وسعت کے نقوش ان کے نثر ی مضامین پر مشتمل کتاب 'اور پھر بیاں اپنا' میں دیکھے جا سکتے ھیں۔ انھیں میتھلی زبان کے شاعر و دیاپتی کی تخلیق 'پداولی' میں فلسفہ حسن و جمال کی تجسیم کاری نے خاص طور پر متاثر کیا ھے'

ودیاپتی: میتھلی ادب کا عظیم فنکار، میتھلی کے لوک گیت، ریت کے ٹیلے کا آہوئے بے پرواہ: سہیل عظیم آبادی، حیات وکائنات: مختلف بھی اہم بھی، میر تقی میر: خاندان: زمانہ: شخصیت اور شاعری، بی زیڈ مائل: ایک کج کلاہ شاعر، حسرت: نغمۂ عشق، رنگ پیراہن، اور خوشبوئے بدن کا شاعر، مولانا آزاد کا اسلوب، اختر پیامی: تیرے غزال کیا ہوئے؟ تیرے ختن کو کیا ہوا؟، بے درودیوار: چند تاثرات، میر تقی میر اور سودا کی غزلوں کا تقابلی جائزہ، جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق، اسٹیج کی چند اہم اصطلاحات، اردو ڈراموں کا ارتقا: آغا حشر کے بعد، افسانہ نگاری کے فنی حدود

مذکورہ بالا تمام مضامین اپنی نوعیت، کیفیت، اہمیت، پیشکش اور طرز بیاں کے پیش نظر ادبی حلقے میں توجہ کے طالب رہے ہیں، نثر جو تعمیری اظہار کا وسیلہ ہے، اس کا حق منظر شہاب نے ادا کر دیا ہے۔ بلاشبہ منظر شہاب کی نثر شگفتہ ہے سریع الاثر ہے اور ان کے اپنے طرز سے عبارت ہے۔ بہرکیف! وقت کی پالکی سے اتر جانے کا غم ہر ایک معتبر شاعر ونثر نگار، ہر خاص وعام کو ابد تک خون کے آنسو رلاتا رہے گا۔ ہم سب فریاد بہ لب ہیں کہ:

خدا مغفرت کرے، بڑا نیک شخص تھا

المختصر، منظر شہاب 'پیراہن جاں' مجروح پرندے کی صدا، 'اور پھر بیاں اپنا' اور دیگر سیاسی، سماجی و تنظیمی کارکردگیوں کے باعث اہل علم وادب کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے اور عالمی ادب خصوصاً جھارکھنڈ کے ادبی اُفق پر اپنی تمام تر تابناکیوں کے ساتھ جھلملاتے رہیں گے، اس یقین کے ساتھ کہ:

ملیں گے خاک زادے روشنی سے
ابد کے کہکشانی موسموں میں

■

Dr. Rizwana Iram
Asst Prof. Head Dept of Urdu
Jamshedpur Womens' College
Jamshedpur (Bihar)

حیات افتخار

مرحوم سید سجاد بخاری

تمل ناڈو کی ممتاز ادبی شخصیت

تمل ناڈو کے ممتاز شاعر، نثر نگار اور مترجم جناب سید سجاد بخاری (پیدائش 1951) کا انتقال 2 فروری 2016 کو چینئی میں ہوا۔ آپ کے انتقال سے تمل ناڈو کی اردو ادبی دنیا میں ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے جو قحط الرجال کے اس دور میں پُر ہوتا نظر نہیں آتا۔ آپ اپنی مادری زبان اردو اور علاقائی زبان تمل دونوں پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ آپ نے دونوں زبانوں میں تراجم کے ذریعے جو خدمات انجام دیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔

سجاد بخاری نے اپنے سوانحی حالات بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''خاندانی اعتبار سے میں سادات الطرفین ہوں۔ ہمارے جد امجد بخارا سے ہندوستان آئے تھے اور جنوبی ہند کے تروناملی نامی علاقے میں بسیرا کرنے لگے تھے۔ ہمارے بزرگوں کو اس زمانے میں ٹیپو سلطان کی جانب سے ایک بہت بڑی جاگیر عطا ہوئی تھی اور یہ سلسلہ ہمارے دادا (سید قادر باشاہ) مرحوم تک جاری رہا۔'' (مجموعۂ کلام 'کاش' ص 8-7)

سجاد بخاری کے دادا کا انتقال اس وقت ہوا جب ان کے والد سید امیر باشاہ بخاری کی عمر صرف سات سال کی تھی اور جب سجاد بخاری کی عمر تیرہ سال کی تھی تو ان کے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ان کے ماموں قبلہ سید عظمت اللہ سرمدی جو جنوبی ہند کے مشہور و معروف عالم اور شاعر گزرے ہیں انھوں نے ان کی کفالت کی۔ ان کی سرپرستی اور رہنمائی میں سجاد بخاری نے علی گڑھ سے ادیب کامل کا امتحان پاس کیا جس کی بنیاد پر ان کا سرکاری اسکول میں اردو منشی کی حیثیت سے تقرر ہوگیا۔ اس کے بعد انھوں نے ذاتی دلچسپی اور تعلیم کے حصول کے شوق کی بنا پر نجی طور سے ایم اے (اردو)، ایم اے (تمل ادب)، بی ایڈ اور ایم فل (اردو) تک کی تعلیم حاصل کی۔ مختلف سرکاری اسکولوں میں پوسٹ گریجویٹ اردو ٹیچر کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد 1999 میں رضاکارانہ طور پر وظیفہ یاب ہوگئے۔ وظیفہ یاب ہونے کے بعد مدراس یونیورسٹی کے شعبۂ اردو، عربی و فارسی میں کثیر لسانی لغت کے ایک پروجیکٹ میں اردو کے مشیر کے طور پر خدمات انجام دیں۔

آپ پیشے کے لحاظ سے مدرّس رہے لیکن مزاج شاعرانہ تھا اور شاعری کی خداداد صلاحیت بدرجۂ اتم موجود تھی خود ان کے الفاظ میں ''جہاں تک شعر و شاعری کا تعلق ہے طبیعت میں موزونیت تو تھی ہی مطالعے نے ہوا دی اور زندگی کے تلخ و تند تجربات و حادثات نے اسے دو آتشہ بنا دیا۔'' (مجموعہ کلام 'کاش' ص 9)

سجاد بخاری فطری طور پر شاعر تھے اور موزوں طبیعت بھی پائی تھی لیکن اس کو نکھارنے اور صیقل کرنے میں ان کے ماموں پروفیسر سید عظمت اللہ سرمدی نے نمایاں کردار ادا کیا۔ خود انھوں نے 'تلمیذ سرمدی' ہونے کا اعتراف کیا ہے اور اس حقیقت کو ایک شعر کے پیرائے میں اس طرح پیش کیا ہے:

سرمدی سے سیکھے ہیں رازہائے فن میں نے
ہاں بخاری واقف ہوں فکر کی ادا سے میں

سجاد بخاری کو جب اپنے کلام کی اشاعت کا خیال آیا اور شعری مجموعہ ترتیب دینا شروع کیا تو اپنے استاد اور ماموں مرحوم سید عظمت اللہ سرمدی کے کلام کی اشاعت کا بھی بیڑہ اٹھایا جو ایک طویل عرصے سے بیاضوں میں محفوظ تھا نہ صرف ان کے شعری کارناموں کو بلکہ نثری شہ پاروں کو بھی 'کلیات سرمدی' کے عنوان سے شائع کیا۔ سجاد بخاری کا کلام مجموعے کی شکل میں 'کاش' کے عنوان سے اگست 2016 میں اسی کے ساتھ اشاعت پذیر ہوا۔ لیکن وہ ان کی زندگی میں شائع ہونے کی بجائے پس مرگ ان کے فرزندان نے ان کے اس خواب کی تکمیل کی۔

آپ ایک قادرالکلام شاعر تھے آپ کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے اردو کے ممتاز دانشور اور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے کہ ''ان کو اردو شعری روزمرہ اور غزل کے مروجہ تمام اسالیب پر پوری قدرت حاصل ہے۔ انھوں نے غزل کو نئے مضامین کے اظہار کے لیے نہیں بلکہ اپنے تجربات اور تاثرات کو بیان کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ لہٰذا ان کی غزل میں اجنبیت نہیں بلکہ اپنائیت جھلکتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مہذب ادب شناس ہمارے سامنے بیٹھا ہوا باتیں کر رہا ہے اور گفتگو میں وہ دلکشی ہے کہ ذہن کسی اور طرف بھٹکتا ہی نہیں۔'' (مجموعۂ کلام 'کاش' ص 16)

سجاد بخاری نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے انھوں نے غزلوں کے علاوہ حمد، نعت، رباعیات، قطعات، آزاد غزل، نثری غزل، ہائیکو اور دیگر جدید نظمیں بھی لکھی ہیں لیکن ان کے فن کی جولانی اور طبیعت کی روانی غزلوں ہی میں پورے شباب پر نظر آتی ہے۔ ویسے طویل بحروں میں بھی عمدہ غزلیں لکھی ہیں لیکن چھوٹی بحروں میں فکر انگیز کلام پیش کرنا ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس سلسلے میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

پیٹ پر پتھر تھا اپنے واسطے ابر رحمت ہم پہ برسایا گیا
تھا بخاری آپ کا ادنیٰ غلام آپ کے قدموں میں جو پایا گیا
(نعتیہ غزل)

میں نے چنگاریاں اچھالی ہیں
کاش لگ جائے آگ سینوں میں
منتشر شیرازۂ انسانیت
بھیڑ میں تنہا کھڑا ہے آدمی

بڑے چرچے تھے بھائی چارگی کے
مگر اب نذر آتش ہورہی ہے

جب مسافر تھکان میں آیا   اک پرندہ اڑان میں آیا
راحتوں کو ترستی رہی   رنجشوں میں گھری زندگی
ہار کر خود کو ہم ہنس پڑے   جیت کر رو پڑی زندگی
ہر قدم حادثات کی دنیا   اف یہ موت وحیات کی دنیا
ان کی فطرت ہے قہر برسانا   ہم کو عادت، عتاب سہنے کی
اک دن کسی موڑ پر زندگی   خود ہم سے انجان ہوجائے گی
ٹپکے نہ آنکھوں سے آنسو کوئی   زخموں کی پہچان ہوجائے گی
کس زمانے کی بات کرتے ہو   کب کا انسان مرگیا صاحب

طویل بحروں میں آپ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ اس کے ذریعے ان کے فکر وفن کی انفرادیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

بنی رہتی ہے رونق گھر کی اک مہمان ہو جب تک
بدن پر جان دیتے ہیں بدن میں جان ہو جب تک
ہمیں لے ڈوبتی ہیں اپنی ہی دانائیاں آخر
بڑی اچھی گزرتی ہے یہ دل ناداں ہو جب تک
ان کی مستقبل وحال پر ہے نظر، نازتم کو ہے ماضی پہ اپنے مگر
اپنی تقدیر کو وہ پلٹتے رہیں تم بس اوراق ماضی الٹتے رہو

آپ کی غزلوں کے اشعار میں جہاں فنی شعور کی پختگی جھلکتی ہے وہیں بلندیٔ فکر کی رعنائیاں بھی آشکار ہیں۔ آپ نے آدمی اور انسان، زندگی اور موت، دنیا کی بے ثباتی، انسانی بھائی چارگی اور قوم کی بے حسی جیسے روایتی موضوعات کو بھی فنی ندرت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

مرحوم سید سجاد بخاری کے دیرینہ رفیق اور تمل ناڈو کے شاعر وادیب علیم صبا نویدی آپ کی قادرالکلامی کے متعلق اس طرح رقم طراز ہیں:

''واقعی آپ کی قادرالکلامی کا جواب نہیں ہلکے پھلکے سیدھے سادے شعر کہنے میں آپ کو بہت زیادہ لطف آتا ہے۔ شاعری میں کرتب بازی کے آپ مطلق قائل نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ کے ہاں فکر نہیں ہے بلکہ میں اتنا ضرور کہوں گا کہ آپ کی فکر بہ آسانی سمجھ میں آجانے والی فکر ہے۔ اس طرح کا فکری اثاثہ شاعر کو برسوں کی ریاضت کے بعد ہی نصیب ہوتا ہے۔'' (تمل ناڈو میں اردو، ص 418)

آپ کی زندگی ہی میں آپ کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے ایک تصنیف بعنوان 'سجاد بخاری کی شاعرانہ جہتیں' 2011 میں شائع کی جس میں انھوں نے ان کی غزلیہ شاعری، آزاد غزل، نثری غزل اور نظم نگاری کا بھرپور جائزہ لیا۔ دراصل یہ تصنیف سجاد بخاری کے مجموعہ کلام 'کاش' کے مقدمہ کے طور پر لکھی گئی تھی۔ چونکہ مجموعے کی اشاعت میں تاخیر ہوگئی اس لیے مجموعے کی اشاعت سے پانچ سال قبل ہی یہ مقدمہ کتابی صورت میں اشاعت پذیر ہوگیا۔

آپ نے نثر کے میدان میں بھی اپنے اَنمٹ نقوش ثبت کیے ہیں۔ آپ نے تخلیقی وتنقیدی مضامین بھی لکھے، صحافتی اداریے بھی تحریر کیے اور افسانے کے ذریعے بھی اپنی شناخت قائم کی۔ مدراس سے شائع ہونے والے ہفتہ وار 'اتحاد' سے 1974 تا 1976 تک وابستہ رہے۔ اس میں شائع شدہ آپ کے اداریے، سیاسی تبصرے ادبی اور نیم ادبی مضامین آپ کی نثری صلاحیتوں کی دلیل ہیں۔ تحقیق وتنقید کے میدان میں آپ کا سب سے بڑا کارنامہ آپ کی تصنیف 'آزاد غزل کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ' ہے جو دراصل آپ کا ایم فل کا مقالہ ہے جسے اشاعتی ادارہ 'نرالی دنیا' نئی دہلی نے 2006 میں شائع کیا۔ یہ کتاب آزاد غزل پر لکھی گئی اپنی نوعیت کی منفرد تصنیف ہے۔ عام طور پر ایسے موضوعات پر لکھنے سے گریز کیا جاتا ہے۔ یہ ان کی علمی اور ادبی خوداعتمادی کا ثبوت ہے کہ انھوں نے اس موضوع پر نہ صرف لکھا بلکہ بے لاگ طور پر لکھا بقول عابد صفی ''یہ کتاب آزاد غزل کا بے باکانہ اور آزادنہ مطالعہ ہے۔''
(تاریخ نثر اردو تمل ناڈو میں، ص 336)

تمل ناڈو میں بیسویں صدی کے نصف دوم میں ادبی منظر پر ابھرنے والے اور ریاست کے اہم نثر نگاروں میں اپنا امتیازی مقام پیدا کرنے والوں میں سجاد بخاری کا شمار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر پی احمد باشاہ نے اپنی تصنیف 'آزادی کے بعد تمل ناڈو میں اردو نثر کا ارتقا' میں تسلیم کیا ہے کہ ''تمل ناڈو کے دور حاضر کے نثر نگاروں میں سجاد بخاری ایک ہمہ گیر نثر نگار کی حیثیت سے ابھرے ہیں۔''

آپ نے تمل ناڈو والوں کو اردو زبان وادب کی نامور ہستیوں سے متعارف کرانے کے لیے تمل زبان میں کئی مضامین لکھے۔ اسی طرح تمل زبان وادب کی ادبی شخصیتوں سے روشناس کرانے کے لیے بھی اردو میں کئی مقالے پیش کیے۔ جو مختلف معیاری رسائل میں شائع ہوکر داد وتحسین حاصل کرچکے ہیں۔ آپ نے اردو کے عظیم شاعر مرزا غالب کی منتخب غزلوں کو تمل زبان میں منتقل کرنے کا بیڑہ بھی اٹھایا لیکن ناگہانی موت نے ان کا یہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا۔

اردو شاعری کی آبرو تسلیم کی جانے والی صنفِ سخن اردو غزل کو آپ نے تمل زبان میں متعارف کرانے کی جی جان سے کوشش کی۔ اس سلسلے میں تمل زبان کے دو ممتاز شعرا کوی کو عبدالرحمٰن اور ایروڈ تمل ان بن کی رہنمائی کی جس کی وجہ سے ان دونوں شاعروں نے تمل زبان میں کامیاب غزلیں لکھیں اور ان غزلوں کے مجموعے شائع کیے۔ ان مجموعوں کی اشاعت نے تمل شاعری کی دنیا میں

مرحوم سید سجاد بخاری سے مزید ادبی کارناموں کی توقع کی جارہی تھی۔ اگر وہ اور جیتے رہتے تو اردو اور تمل زبان کے ادبی سرمائے میں ان کی تخلیقات اضافے کا باعث ہوتیں لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ پینسٹھ سال کی عمر میں ان کی ناگہانی موت نے ساری اردو دنیا کو عموماً اور تمل ناڈو کی ادبی فضا کو خصوصاً سوگوار کردیا۔

تہلکہ مچادیا اور دیگر شعرا بھی تمل زبان میں غزل لکھنے کی جانب مائل ہوئے۔

تمل زبان کے ممتاز شاعر کوی کو عبدالرحمٰن کے ایک تمل شعری مجموعے کا آپ نے اردو ترجمہ 'جگنوؤں سے ایک خط' کے نام سے شائع کیا۔ علیم صبا نویدی کے اردو ہائیکو کا انھوں نے تمل زبان میں ترجمہ کیا جو 'پیسم ورلگل' (بولتی انگلیاں) کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ آپ نے ہندی/ اردو ٹی وی سیریلز (مثلاً اکبردی گریٹ اور شکتی مان وغیرہ) کو تمل زبان میں منتقل کیا۔

مرحوم نے دونوں زبانوں یعنی اردو اور تمل زبان میں پوسٹ گریجویٹ ڈگری حاصل کی تھی اور پی ایچ ڈی کے لیے جو موضوع منتخب کیا تھا اس کا تعلق بھی دونوں زبانوں سے تھا یعنی 'علامہ اقبال اور سبرامنیم بھارتی کا تقابلی مطالعہ' جو معاشی پریشانیوں کی وجہ سے مکمل نہ ہوسکا

بہرحال مرحوم سید سجاد بخاری سے مزید ادبی کارناموں کی توقع کی جارہی تھی۔ اگر وہ اور جیتے رہتے تو اردو اور تمل زبان کے ادبی سرمائے میں ان کی تخلیقات اضافے کا باعث ہوتیں لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ پینسٹھ سال کی عمر میں ان کی ناگہانی موت نے ساری اردو دنیا کو عموماً اور تمل ناڈو کی ادبی فضا کو خصوصاً سوگوار کردیا۔

■

Dr. Hayat Iftekhar Ruby Hayath Flats, 80/213,
Choolaimedu High Road, Choolaimedu,
Chennai- 600094 (Tamil Nadu)

یادِ رفتگاں

سید وصی اللہ بختیاری عمری

راشد آزر

حیدرآباد دکن کا ایک ممتاز شاعر

راشد آزر حیدرآباد دکن کے ممتاز شاعر تھے۔آپ کا اصل نام راشد علی خان تھا، راشد آزر کے قلمی نام سے مشہور ہوئے۔مختلف شعری اصناف پر طبع آزمائی کی لیکن ایک نظم گو شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ آپ کے کل دس شعری مجموعے اور ایک تنقیدی کتاب شائع ہوچکی ہے۔

راشد آزر 31 اگست 1931 کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد مرزا حسین علی خان' آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ تھے۔عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبۂ انگریزی کے پروفیسر اور صدر شعبہ تھے۔آپ کی والدہ معصومہ بیگم اپنے دور میں کانگریس کی لیڈر تھیں، چارمینار کے حلقۂ اسمبلی سے ایم ایل اے منتخب ہوئیں اور وزیر بھی رہیں۔راشد آزر کے نانا خدیو جنگ تھے جو عماد الملک سید حسین بلگرامی کے فرزند تھے۔راشد ایک خوددار اور باوقار شخصیت کے مالک تھے۔آپ وقت کے بڑے پابند اور کم آمیز تھے۔ حیدرآبادی تہذیب اور رکھ رکھاؤ آپ کی شخصیت میں جزوِ مزاج کی حیثیت رکھتے ہیں۔

راشد آزر کی ابتدائی تعلیم حیدرآباد کے مشہور اسکول مدرسۂ عالیہ میں ہوئی۔آپ نے انگریزی ادب میں بی اے کی سند حاصل کی۔وکالت میں دلچسپی کی وجہ سے ایل ایل بی کی سند حاصل کی۔اس عہد کے مشہور وکلا سدا شیو راؤ اور واگھرے (جو بعد کو جسٹس واگھرے ہوئے) کے ساتھ وکالت کی، لیکن آپ کو وکالت کا پیشہ راس نہیں آیا۔ فطری طور پر درس و تدریس سے دلچسپی تھی، لہٰذا بی ایڈ کی سند حاصل کی اور 1960 میں حیدرآباد پبلک اسکول میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ یہاں چار سال تک انگریزی پڑھائی۔راشد آزر لکھتے ہیں:

''....ادب اور شاعری سے بچپن ہی سے لگاؤ تھا۔ چنانچہ میں نے انگریزی ادب سے بی اے کیا۔اس کے بعد ایل ایل بی کیا اور تقریباً دو سال تک وکالت بھی کی لیکن وکالت چھوڑ دی۔ وکالت چھوڑنے کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ والد کا انتقال ہو چکا تھا اور جلد از جلد اپنی روٹی آپ کمانا چاہتا تھا۔ اس کے بعد دو کمپنیوں کی نوکریاں کیں اور دونوں جگہ میری اور کمپنی کے مالک کی آپس میں نبھی نہیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے نوکری چھوڑ دی۔ چوں کہ پڑھانے سے دلچسپی تھی اور کالج کے زمانے میں بھی اپنے ہم جماعتوں کو بھی پڑھایا کرتا تھا، اسی لیے پڑھانے کو اپنا پیشہ بنا لیا۔ اس پیشے سے خوش ہوں۔ یہ پیشہ پسند بھی ہے اور شاعری کے لیے راس بھی۔''

راشد آزر سے قدیم خاندانی تعلقات کی وجہ سے پرنس مکرم جاہ چاہتے تھے کہ وہ ان کے یہاں آجائیں اور خدمات انجام دیں۔راشد آزر کے والد کی خواہش تھی کہ راشد آزر بھی تدریسی خدمات انجام دیں، وہ خود بھی جامعہ عثمانیہ میں تدریس سے وابستہ تھے، لیکن راشد آزر صرف ایک سال کے لیے مکرم جاہ کے یہاں گئے اور ہر سال ایک ایک سال توسیع ہوتی رہی اور یہ سلسلہ دس سال تک جاری رہا۔انہوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔مکرم جاہ نے ایک تعلیمی ٹرسٹ بنایا تھا اور اس کی نگرانی کے لیے راشد آزر کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اس کے اسکول کی ذمہ داری انہیں سونپ دی گئی۔ پرانی حویلی میں جو اسکول قائم ہے، وہ راشد آزر کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ راشد آزر نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ دوبارہ حیدرآباد پبلک اسکول جائیں لیکن ایسا ہو نہ سکا اور آپ 1978 تک تقریباً چودہ سال آپ ٹرسٹ سے وابستہ رہے۔

1967 میں حضورِ نظام میر عثمان علی خان آصف جاہ سابع کے انتقال کے بعد نظام ٹرسٹ، مکرم جاہ کی تحویل میں آ گیا تو انہوں نے راشد آزر کو ٹرسٹی بھی مقرر کیا۔ٹرسٹ میں تعلیم کا پورا شعبہ اور پھر امورِ مذہبی کا شعبہ بھی راشد آزر کے زیرِ انتظام رہا۔ نظام ٹرسٹ سے راشد آزر کی عملی وابستگی 1978 تک رہی۔اس کے بعد وہ کسی ملازمت کے بجائے علمی و ادبی مشاغل میں مصروف و منہمک ہو گئے۔

راشد آزر اردو، عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔عربی لغات، خاص طور پر قدیم عربی لغت کے مصادر پر گہری نظر تھی۔آپ کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ آپ کے ذاتی کتب خانہ میں موجود کتابوں پر آپ کے حواشی اور پنسل سے لکھے اشارات اہم ہیں، جن میں زبان و بیان کی اغلاط اور قواعد کی غلطیوں کی جانب اشارے کیے گئے ہیں۔

راشد آزر نے کئی شعری اصناف پر طبع آزمائی کی۔ غزل، نظم، قطعہ اور رباعی وغیرہ اصناف میں آپ کا کلام موجود ہے، لیکن آپ کی بنیادی شناخت نظم گو شاعر کی حیثیت سے قائم ہے۔آپ کے دس شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔جن کی تفصیل درجِ ذیل ہے:

نقشِ آذر 1963، صدائے تیشہ 1971، آب دیدہ 1974، خاکِ انا 1979، جمع خرچ وفا 1992، منزلِ شوق 1992، زخموں کی زبان 1997، اندوختہ 1997، قرضِ جاں 2003، نقدِ حیات 2007

راشد آزر ایک قادر الکلام شاعر تھے۔آپ کے کلام میں زندگی کے تلخ حقائق کا ادراک ملتا ہے۔آپ کی شاعری میں تصنع اور تکلف کے بجائے فطری بے ساختگی اور سادگی پائی جاتی ہے۔آپ کے کلام کا غالب عنصر عشق ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے راشد آزر کے مجموعۂ کلام 'نقدِ حیات' کے مقدمہ میں ملا وجہی کے حوالے سے عشق اور اس کی اقسام بیان کیں اور پھر لکھا ہے کہ راشد آزر کی شاعری کا بنیادی محرک عشق ہے۔ علامہ اعجاز فرخ نے اپنے مضمون 'راشد آزر-فن سے فنکار تک ایک سفر' میں عشق کی مذکورہ اقسام' عشق سلامتی، عشق ہلاکتی، عشق ملامتی اور عشق رفاقتی کے علاوہ ایک اور صورت کشید کی ہے کہ راشد آزر کے ہاں 'عشق توفیقی' پایا جاتا ہے۔

راشد آزر کی شاعری فطری اور زمینی شاعری ہے۔ آپ نے اپنی شاعری میں اپنے زندگی کے حالات و محسوسات کو پیش کیا ہے۔اپنی زندگی کے تجربات اور تلخیوں اور تنہائیوں کو آپ نے اس طرح پیش کیا ہے کہ آپ نے اپنے انفرادی سروکار کو تعمیم اور عمومی رنگ عطا کیا

ہے۔ آپ کی شریکِ حیات فاطمہ بیگم تھیں، جن کے اصرار پر راشد آزر نے اپنا پہلا مجموعۂ کلام شائع کیا تھا۔ اپنی بیوی کے انتقال کے بعد راشد آزر کی زندگی میں ایک خلاء پیدا ہوگیا۔ آپ کے 'آب دیدہ' کی نظمیں اسی غم اور ہجر وفراق کی آئینہ دار ہیں۔

راشد آزر کی شاعری کے بارے میں ایک رائے یہ ہے کہ آپ کی آدھی شاعری 'آرزوئے وصال' ہے اور بقیہ آدھی شاعری 'غمِ فراق' ہے۔ آپ نے 'آب دیدہ' کا انتساب یوں کیا ہے: ''فاطمہ کے نام جو میری بیوی بھی تھی اور محبوبہ بھی۔'' اس انتساب کے ساتھ ایک شعر یہ لکھا ہے:

ساتھ تھا تیرا تو ہمت تھی کہ روشن ہے جہاں
تو نہیں ہے تو اجالے سے دہل جاتا ہوں

راشد آزر کے معاصرین نے آپ کی شخصیت کے بارے میں لکھا ہے، جن میں مغنی تبسم، شاذ تمکنت، عوض سعید، نسیمہ تراب الحسن، سلیمان اریب وغیرہ شامل ہیں اور تقریباً سبھی نے آپ کے کلام کو آپ کی شخصیت اور زندگی کے حالات کا پرتو قرار دیا ہے۔

راشد آزر کے انتقال کے بعد حیدرآباد میں سب سے پہلے سید معظم راز نے لکھا۔ روزنامہ اعتماد، 17 اکتوبر 2016 کی اشاعت 'اوراقِ ادب' میں 'خاکِ انا کا شاعر- راشد آزر' میں وہ لکھتے ہیں:

''ہر مشہور شاعر کی طرح ان کے ہاں بھی شعری سفر رومانوی دور سے شروع ہوکر زندگی کی تلخ وترش حقیقتوں، تعمیر وتخریب کے کڑوے کسیلے تجربات، دکھ سکھ کے زیر اثر بڑھتے گھٹتے جذبات واحساسات کا سامنا کرتے ہوئے بتدریج آگہی اور بصیرت کی جانب گامزن نظر آتا ہے۔ بطور خاص آب دیدہ کا بیشتر کلام جو زیادہ تر نظموں پر محیط ہے شاعر کے اس دکھ و درد کی زندہ تصویر نظر آتا ہے جو بظاہر ان کی شریک حیات فاطمہ کے اچانک سانحہ ارتحال سے پیدا شدہ جذبات واحساسات کی دین ہے جسے انھوں نے اپنی بیشتر نظموں میں بڑی خوبصورتی ومہارت کے ساتھ کچھ ایسا موڑ دیا ہے کہ قاری وسامع بے ساختہ اسے اپنے دل کی ترجمانی پر محمول کر بیٹھتا ہے۔''

راشد آزر کی ایک نظم 'لفظوں کی زندگی' ملاحظہ فرمائیں:

لفظوں کی زندگی
شام کٹتی نہیں، میں کاٹ دیا کرتا ہوں
چاند کی کرنوں میں تالاب کی موجیں گن کر
اور پھر رات گزر جاتی ہے
اور پھر دن بھی نکل آتا ہے
میں تری قبر سے ہوتا ہوا دفتر کو چلا جاتا ہوں

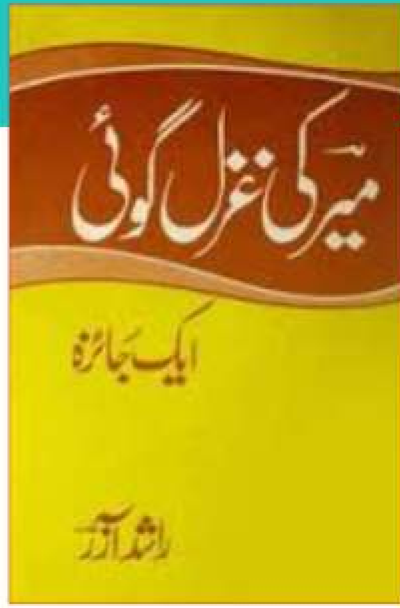

فائلیں کھول کے الفاظ کا منہ تکتا ہوں
کتنے بے معنی ہیں الفاظ، نہ جذبات نہ رنگ
انہی الفاظ پہ ہے ساری تجارت کی اساس
اور جو لفظ ترے منہ سے نکلتے تھے کبھی
آج وہ دفن ہیں احساس کی پہنائی میں
اور میں سوچ رہا ہوں کہ مرے موت کو کتنے دن ہیں
اور بھی لوگ میری طرح لیے یاد کے زخم
زندگی کاٹ دیا کرتے ہیں
اور مرتے ہیں تو سب کہتے ہیں، بیچارہ شریف آدمی تھا
کتنے بے معنی ہیں الفاظ، نہ جذبات نہ رنگ
اور جو لفظ ترے منہ سے نکلتے تھے کبھی!

راشد آزر کے دس شعری مجموعوں کے ساتھ ایک تنقیدی کتاب 'میر کی غزل گوئی' بھی ہے جو انجمن ترقی اردو سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کے بارے میں راشد آزر لکھتے ہیں:

''بہرحال میر کو ایک غیر منقسم، ہمہ جہت اور تہہ دار اکائی کی حیثیت سے پیش کر کے میں نے ایک ادبی تجربہ کیا ہے، جسے آپ شاعرانہ تجزیہ کہہ لیں۔ شاید مضمون کو ابواب میں تقسیم کرنے اور شخصیت کو خانوں میں بانٹنے والوں کے لیے یہ تجربہ نیا اور اجنبی ہو لیکن کسی کو تو یہ کام کرنا ہی تھا، سو میں نے کیا۔ آپ چاہیں تو اس کو جراتِ بیباک کہہ لیں یا چاہیں تو شوقِ فضول کا نام دے لیں' لیکن کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے ایک بار سوچیے کہ میں نے اپنی بحث کے دلائل 'میر کے اشعار سے دے کر میر کو خود اپنا وکیل بنایا ہے اور بار بار متضاد اشعار پیش کر کے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ میر مجموعۂ ضدین تھا اور اس کے کردار کے سارے پہلو ایک دوسرے کی ضد ہی نہیں' ایک دوسرے کے متلازم بھی ہیں اور ان سارے مختلف اور متضاد زاویوں کا انعکاس میر ہے، جس کی شاعری کے سرچشمے انھیں اضداد سے نکل کر ہم تک پہنچے ہیں، اسی لیے میں نے جہاں مختلف پہلوؤں کو ایک دوسرے سے مربوط کیا ہے، وہیں ان میں تھوڑا سا فاصلہ بھی رکھنے کی کوشش کی ہے۔''

اس کتاب میں میر کے فن پر چھ مضامین موجود ہیں۔ میر کے فن کی نزاکتوں کو شاعرانہ انداز سے جس طرح آپ نے محسوس کیا، اسی طرح پیش کیا ہے۔ 'میر کی غزل گوئی' اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں کہ ''انھوں نے میر کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے اور ہماری توجہ میر کے فن کی طرف مبذول کرائی ہے۔''

راشد آزر نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ آبِ حیات میں محمد حسین آزاد نے میر کی غزل کا یہ مشہور شعر یوں درج کیا ہے:

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

راشد آزر نے اس شعر کی تصحیح کی اور اس کے ثبوت کے طور پر فورٹ ولیم کالج کا اولین مرتب کردہ نسخہ کی مدد سے یہ ثابت کیا کہ اصل شعر یوں ہے:

سرہانے میر کے کوئی نہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

راشد آزر کا خیال ہے کہ میر کی طبع نازک سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ انھوں نے 'آہستہ بولو' جیسی تعبیر کا استعمال کیا ہوگا، میر کی طبیعت پر خلل انداز سرگوشی بھی گراں ہوا کرتی تھی۔

اس طرح راشد آزر نے کئی شعروں پر تفصیلی بحث کی ہے۔ کلامِ میر کے فنی محاسن کو اجاگر کیا ہے۔ میر تنقید میں اس کتاب کی اہمیت مسلّم ہے۔

راشد آزر کو حیدرآباد کے علمی وادبی حلقوں میں عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ آپ ابتدا ہی سے ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ حیدرآباد میں اس کے سکریٹری بھی رہے۔ اس طرح پروفیسر مغنی تبسم اور دیگر کے ساتھ آپ بھی حیدرآباد لٹریری فورم (حلف) سے وابستہ رہے۔ دنیائے ادب نے آپ کا اعتراف بھی کیا۔ دسمبر 2016 میں تلنگانہ اردو اکیڈمی نے آپ کی مجموعی شعری خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے 2010 کے باوقار 'مخدوم ایوارڈ' سے نوازا۔ یہ ایوارڈ ایک لاکھ روپے اور توصیفی سند پر مشتمل ہوتا ہے۔

راشد آزر کا انتقال 14 اکتوبر 2016 کو حیدرآباد میں 85 سال کی عمر میں ہوا۔ بعد نماز مغرب نماز جنازہ ادا کی گئی اور تدفین مقبرہ عمادالدولہ، امیر پیٹ میں عمل میں آئی۔

■

Dr. Syed Vasiulla Bakhtiary
Dept. of Urdu, Govt. Degree College
RAYACHOTY - 516269 (AP)

حقانی القاسمی

ذات کے دریا میں تخیل کا
تاج محل

(مقیم اثر بیاولی پر ایک تعزیتی نوٹ)

مقیم اثر سے کبھی ملاقات تو نہیں رہی مگر ٹیلی فون پر گفتگو ہوتی رہی۔ ان کے طرزِ گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ انا پرست، خوددار، ضدی طبیعت کے انسان ہیں۔ ڈھن کے پکے جو ٹھان لیتے ہیں وہ کر گزرتے ہیں اور شاید اسی ضد کے عنصر نے ہی انھیں تخلیق کاروں کی بھیڑ میں زندہ رکھا۔ یہ وصف ان کی ذات کے اندر نہ ہوتا تو شاید وہ بھی خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتے۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں ناقدرشناسی کی رسم عام ہو وہاں خود کو زندہ رکھنے کے لیے بہت سے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ مقیم اثر بیاولی جیسے بے پناہ تخلیقی قوت کے حامل شخص کو بھی اس کے لیے تگ و دو کرنی پڑی۔ ان سے کسی رسالے والے نے گوشے کی بات کی تھی اور اس میں میرا بھی حوالہ شامل تھا۔ جب بہت دنوں تک اس رسالے کا گوشہ شائع نہیں ہوا تو انھوں نے قدرے خفگی کے انداز میں مجھ سے بات کی اور کہا کہ یہ رسالہ شائع نہیں ہوتا تو کوئی بات نہیں۔ میں بیس دن کے اندر اپنے فکر و فن پر ایک رسالے کا نمبر نکال رہا ہوں اور وہ آپ کو بھیجوں گا اور واقعتاً بیس دن کے اندر وہ رسالہ میرے پاس پہنچ گیا جس میں ان کی شخصیت اور فن پر کئی اہم مضامین تھے۔ مجھے بڑی ندامت ہوئی۔ میرا قصور یہ تھا کہ مجھے بھی ان کی شاعری کے حوالے سے جو مضمون لکھنا تھا اس کے لیے نہ تو فرصت نصیب تھی اور نہ ہی ذہن اس کے لیے تیار تھا۔ بہر حال خود پر جبر کر کے میں نے ان پر مضمون لکھا جو بدایوں سے حسیب سوز کی ادارت میں نکلنے والے 'لمحے لمحے' کے مقیم اثر بیاولی نمبر میں شائع ہوا۔ مجھے پتہ نہیں کہ میرے اس مضمون سے وہ خوش ہوئے یا ناراض۔ بہر حال اب جبکہ اس دنیا سے ان کی سانسوں کا رشتہ ختم ہو گیا ہے تو مجھے ان کی تخلیقی سانسوں کی تازگی کا احساس ہو رہا ہے۔ مالیگاؤں کی خاک سے جنم لینے والا یہ آفتاب 27 اپریل 2016 کو جب غروب ہوا تو دہلی اور اطراف کے ادبی حلقوں کو اس کی خبر تک نہیں ہو پائی۔ گلوبلائزیشن کے دور میں یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ جب دنیا ایک مٹھی میں قید ہو گئی ہے پھر بھی ادبی دنیا کی خبریں ہر طرف نہیں پہنچ پاتیں۔ مجھے ان کے انتقال کا بڑا دکھ ہوا کہ ایک بے پناہ تخلیقی قوت کا حامل شخص اس دنیا سے چلا گیا۔ اب جو میں ان پر تعزیتی نوٹ لکھنے بیٹھا ہوں تو ان کی زندگی میں لکھے ہوئے مضمون کی مدد کے بغیر میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ میں نے اس مضمون میں لکھا تھا کہ رجولیت سے عاری معاشرے میں اپنی تخلیقی قوت کا احساس دلانا مشکل ہوتا ہے۔ مقیم اثر کے ساتھ بھی شاید یہی مشکل پیش آئی ہوگی کہ انھیں ایسا معاشرہ ملا جہاں اسپیس کم ہے اور افراد زیادہ اور افضلیت کا کوئی واضح معیار بھی نہیں ہے۔ جب ایسی صورت ہو تو ادبی مراکز اور دبستانوں سے دور مقیم اثر جیسے تخلیق کارو ں کے لیے تنقید کی 'تنگ تنگ' میں جگہ کہاں سے نکل پائے گی کہ آج کی تنقید تو اسی تنگی اور تنگنائے سے عبارت ہے۔

مقیم اثر اچھے شاعر ہیں، منفرد بھی ہیں اور مختلف بھی مگر اپنی انفرادیت کا احساس دلانے کے لیے ان کے پاس وسائل نہیں ہیں اسی لیے تمام تر فکری اور فنی جدتوں کے باوجود شاعری کے جدید منظرنامے میں نہ تو ان کا نام شامل ہے اور نہ ہی وہ معاصر غزلیہ شاعری پر لکھی گئی تحریروں کے حوالے میں ہیں۔

مقیم اثر کئی شعری مجموعوں کے خالق ہیں اور ہر مجموعے میں تقریباً پچیس اشعار ایسے ضرور ہیں جن میں شمہ برابر نہ یکسانیت کا شائبہ ہے اور نہ ہی ان میں تکرار کی فضا ہے۔ اثر نے اپنے افکار و اسالیب کی زمینیں خود ہی وضع کی ہیں اور نئے موضوعات کی جستجو کا سفر جاری رکھا ہے۔ اپنے انفرادی آہنگ کے لیے الگ راہ بھی تلاش کی ہے اور آہنگ کی نئی راہیں بھی ان کے شعروں میں کم بصیرت افراد کو بھی نظر آ سکتی ہیں تو پھر تنقید کی آنکھیں کیوں ان روشنیوں کو دیکھ نہیں پاتی ہیں۔ یہ بڑا اہم سوال ہے جس کا جواب شاید عہد حاضر کے نقادوں کے پاس نہیں ہے۔

معاصر تنقید کے شعری باب میں جگہ پانے کے لیے کیا یہ اشعار کافی نہیں ہیں جو کہ ان کے اجتہادی اور اختراعی ذہن سے وجود میں آئے ہیں:

ایک روٹی، اسے میں کیسے اکیلا کھاؤں
میرے حصے میں کسی اور کا حصہ لکھ دے
غربت میں کوئی بات مری محترم نہ تھی
دولت ملی تو لفظوں کی قیمت بدل گئی
اشکوں کا بوجھ ان سے اٹھایا نہ جائے گا
ہمدردیاں جتانے سمندر تو آئے ہیں
آنکھیں اگر ہیں سیر کرو طول و عرض کی
ہم نے بھی پانیوں میں جزیرے اگائے ہیں
جمنا مری جانب بھی کبھی ایک نظر کر
میں ذات کے دریا میں نیا تاج محل ہوں
جگنوؤں کا ملال کیا ہوگا
جس نے سورج کو مرتے دیکھا ہے
ہوا کے ہاتھ پہ جس نے دیا جلایا ہے
اسے بھی اہل زمیں نے بہت ستایا ہے

ان اشعار میں تحیرات کی جو فضا، تفکرات کا تنوع اور فنتاسی کا جو جمال ہے آج کی اسی فیصد شاعری اس سے محروم ہے۔

احساس اور اظہار کی سطح پر اتنی نئی جولانیاں اور تابانیاں کتنوں کی شاعری کو نصیب ہے، شمار تو کیجیے کہ یہ کام بھی کم مشکل نہیں ہے۔

یہ شاعری تو ایک ایسے آئینہ خانے میں لے جاتی ہے جہاں ہر تصویر، تمثیل اور ترکیب نئی نظر آتی ہے۔ انبوہ میں نیا پن کا یہی احساس مقیم اثر کو انفراد عطا کرتا ہے۔ یہ وہ تمغہ ہے جسے حاصل کرنے کے لیے تخلیق کاروں کو مدتوں ریاضتیں کرنی پڑتی ہیں۔ خیال میں ندرت پیدا کرنے کے لیے تجربوں کے کتنے صحراؤں کی خاک چھاننی پڑتی ہے۔ بہت آبلہ پائی کے بعد احساس کا کوئی نیا جزیرہ ذہن میں جنم لیتا ہے اور تخیل کا نیا منطقہ وجود میں آتا ہے۔ تب فنتاسی کی ایک نئی کیفیت تخلیق کا حصہ بنتی ہے:

تری نگاہ کے جادو کی سحرکاری ہے
میں لکڑیوں کو جلاتا ہوں ٹھنڈے پانی سے

شب کے قیدی ہیں گزر نیند پہ ہے
کوئی سورج ادھر آتا ہی نہیں

وجدان اور آگہی کی روشنیوں سے معمور مقیم اثر کے اشعار قاری کو تحیرات کے نئے آفاق سے آشنا کرتے ہیں۔ مقیم اثر کی تخلیق کے باطنی وجود میں تجربات کی قندیلیں روشن ہیں اور وہ بھی ایسے تجربے جو مراقباتی کیفیت میں ہی کیے جاسکتے ہیں۔

تخلیق کار کے ذہنی وجود میں جب تک تخیلات کا تصادم، تناؤ، کشمکش نہ ہو، خیال کوئی نئی راہ تلاش نہیں کرسکتا۔ مقیم اثر کے یہاں تازہ برگ و بار اس لیے ہیں کہ پرانی فکریات اور لفظیات سے مزاحمت کا عمل بھی جاری ہے اور نئی نامیات سے نمو کا عمل بھی:

نئے معنی کی چوٹی پر بسے گا
یہ لفظوں کو بدلتا قافلہ ہے

آگہی اور وجدان کی متوازی لہروں کے ساتھ یہ تخلیق ایک ایسے سمندر سے جا ملی ہے جہاں تحیرات کی موجیں ہی موجیں ہیں۔ انہی موجوں سے مقیم کے تخلیقی رشتے کی وجہ سے تخیل میں توانائی اور تحرک ہے اور نئی بینائی بھی:

اک نئی بینائی سے آراستہ ہوجائیں گے
جذب کرنا سیکھ لیں آہٹ کو رستوں کے دماغ

قاری کی سائیکی اور شعور سے مقیم اثر کی شاعری بہت گہرا رشتہ قائم کرلیتی ہے کہ ان کی شاعری میں زندگی کے وہ مناظر اور مظاہر ہیں جو سماجی اکائی کے ہر فرد کے شب و روز کا حصہ اور قصہ ہیں۔ زندگی کو نئے زاویے سے ترتیب دینے کے ساتھ ساتھ اس کے تضادات کی تفہیم کا عمل بھی اس شاعری میں روشن ہے۔

زندگی کی حقیقتوں کا عرفان آسان نہیں ہے۔ اتنے تضادات اور پیچیدگیاں ہیں کہ انسانی ذہن کے لیے ان کا سلجھانا مشکل ہے۔ انہی تضادات کی تطبیق کی صورتیں مقیم اثر کے ہاں ملتی ہیں۔ انھوں نے زندگی کو شبنمی شبستانوں میں نہیں بلکہ تجربوں کے شعلوں میں جل کر دیکھا ہے اور دیکھنے کے لیے دوسروں کی نہیں، اپنی آنکھیں استعمال کی ہیں۔ ان کے اندر بے پناہ تحرک اور اضطراب ہے اور اسی وجہ سے زندگی اپنی تمام تر بلند اور پست سطحوں کے ساتھ ان پر منکشف ہوئی ہے۔ مقیم اثر کی زندگی کا تصور ہی الگ ہے، اس میں موت بھی شامل ہے کہ یہ بھی زندگی کا ایک آہنگ، لہجہ اور اسلوب ہے۔ زندگی کی معنویت موت سے ہی مشروط ہے:

خون اگر زندہ ہے رگوں میں رستے میں گلزار بہت
مرنا سیکھو پیدا ہوں گے جینے کے آثار بہت

دھند میں آگ لگانا سیکھو
بادل سے ٹکرانا سیکھو
پتھر میں رستہ بنتا ہے
لہروں سے لہرانا سیکھو

زندگی اور ذات کی جستجو سے عبارت ان کی شاعری میں عجب نکتہ آفرینیاں ہیں۔ کچھ شعروں میں تو زندگی کے رمز سے بہت ہی خوب صورت روشناسی ہے:

یہ آسماں بھی ہے مری نظر میں اک نقطہ
حدود ذات سے آگے نئے سفر تک آ
شہر تو آباد اپنے رنگ و بو میں ہوگئے
آج بھی لیکن ہے ویراں آدمی چاروں طرف

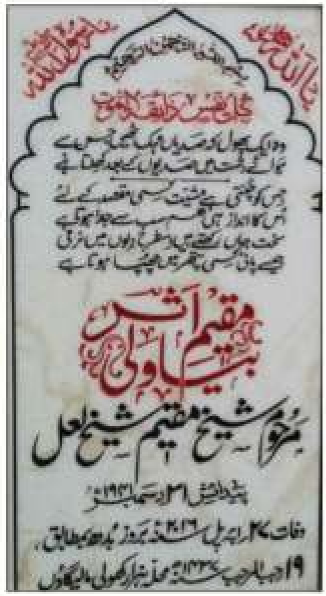

مقیم اثر اپنی ذات کے خول میں محصور نہیں ہیں۔ انھیں دنیا کی تیز رفتار تبدیلیوں سے بھی آگہی ہے اور گلوبلائزیشن سے پیدا شدہ تہذیبی اور سماجی بحران سے بھی۔ اس بحرانی کیفیت میں ان کے لیے سب سے بڑا مسئلہ تحفظ انسانیت اور بقائے آدمیت کا ہے:

ہم بھی حامی ہیں تغیر کیش دنیا کے مگر
اتنا چاہیں گے زمیں پر آدمی باقی رہے

مقیم اثر کی فکر میں تیقن اور شعلگی ہے اور لفظوں میں نور اور حرارت:

شب کی اوقات کیا کہ پاس آئے
میرا رشتہ ہے آفتابوں سے
سجدے میں سر جھکائیں گے پتھر بھی راہ کے
پانی کبھی کرے تو مری آگ سے وضو

مقیم اثر کی تخلیقی فکر میں تمازت اور بغاوت ہے، جسارت اور حرارت ہے مگر ساتھ میں لطافت بھی ہے کہ انھوں نے غزل کی نغمگی کو مجروح نہیں ہونے دیا:

نغمہ ہوں کوئی چیخ نہیں میں
کومل ہوں سر بھی کومل دے

ان اشعار میں کتنی کوملتا ہے:

زمین درد پہ سجدوں کی بارشیں ہوں گی
بسے ہوئے ہیں جبینوں میں بندگی کے چاند
ہم اپنے دل کی اداسی اسی میں دھولیں گے
پلک پلک ہیں ترے ہجر کی نمی کے چاند

ان کے لہجے میں ہجر کی یہی نمی ہے جو گزرتے وقت اور حالت کے ساتھ شعلے میں تبدیل ہوتی جاتی ہے کہ تخلیق کار کبھی ایک کیفیت میں قید نہیں ہوتا۔

مقیم اثر کی شاعری ان کی ادراکی قوت، تخیل کی گہرائی کی گواہ ہے۔ مقیم اثر کے یہاں تجرباتی امکانات کی ایک وسیع تر کائنات مخفی ہے۔ تنقید کو اسی کائنات کی جستجو کرنی ہے کہ اسی سے دونوں کی وسعتیں وابستہ ہیں۔ تخلیق اور تنقید کو نقطۂ انجماد سے نکلنے کے لیے امکانات کی تلاش ناگزیر ہوگئی ہے اور مقیم اثر کی شاعری میں امکانات کی لہریں موجود ہیں کیونکہ ان کا ہر اگلا قدم نئے پانی میں ہوتا ہے۔ نیا طور، نئی طرز مقیم اثر کی تخلیقی سرشت میں شامل ہے۔ دیباچہ کے اس اقتباس سے انکار شاید کفر کہلائے کہ:

''نئے خواب، نئی آنکھیں، نئی دھوپ، نئے سائے، نئے نشیب، نئے فراز، نئے پیچ و خم، نئی راہیں، نئی منزلیں، نیا اضطراب، نیا سکون، نئے قیاس و گمان، نئے واہمے، نیا یقین، نیا ایقان، نیا عرفان، نئے پرندے، نئی اڑانیں، نیا افق، نئے خورشید و قمر، مجملہ غیاب و شہود کی نئی زمینوں پر کھنچے گئے خطوط پر اپنے افکار و خیالات کے روشن نقوش ثبت کرنے والا عبقری شاعر ایک عرصہ بعد زمانوں کی سمجھ میں آتا ہے۔''

مقیم اثر ایک جینیس ہیں، ان کی تخلیقی نبوغت کے نشانات ان کے شعروں میں تلاش کیے جاسکتے ہیں اور ناقدین کو تلاش کا عمل جاری بھی رکھنا چاہیے مگر کیا مقیم اثر کی شاعری کو تشریحی یا تعبیری تنقید کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اچھی تخلیق، تنقید کی محتاج نہیں ہوتی۔ مقیم اثر کی شاعری کو بھی مشاطۂ تنقید کی حاجت نہیں ہے کہ:

''تنقید سے غالب پیدا نہیں ہوتے، غالب سے تنقید پیدا ہوتی ہے۔'' (مقیم اثر)

■

Haqqani Al-Qasmi
Mob.:9891726444
E-mail.: haqqanialqasmi@gmail.com

اشتیاق سعید

مجھے زندگی تو کہاں لے کے آئی

(تاجدار تاج کی وفات پر)

بات 1990 کی ہے۔ اُن دنوں میں اشتیاق زخمی ہوا کرتا تھا۔ پانچ سات افسانے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے تھے۔ ایک ڈرامہ 'انقلاب مردہ باد' غالباً 1986 میں لکھا تھا جس کے دو اسٹیج شو بھی ہو چکے تھے۔ اس لحاظ سے ڈراموں میں اداکاری کے شوقین محلّے کے کئی لڑکے میرے رابطے میں آگئے تھے اور اکثر شام کو میری دوکان پر اکٹھا ہو جایا کرتے تھے۔ انھیں میں ایک راشد عظیم بھی تھا جو ڈراموں کے ساتھ ساتھ ادب سے بھی گہرا شغف رکھتا تھا۔ ایک روز وہ آیا تو اُس کے ہاتھ میں اُردو کی کوئی کتاب تھی، میں نے وہ کتاب اُس کے ہاتھ سے جھپٹ لی اور دیکھنے لگا۔ کتاب کا نام 'زبر' تھا۔ جو تاجدار تاج کا شعری مجموعہ تھا۔ سرورق پر تاجدار کی تصویر دیکھ کر بے ساختہ میری زبان سے نکلا ''اچھا تو یہ صاحب تاجدار تاج ہیں!'' راشد میری جانب معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''تم انھیں جانتے ہو؟'' میں بدستور سرورق پر نظریں جمائے تصویر کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ''اب تک تو نہیں جانتا تھا لیکن اب جان گیا ہوں'' پھر کتاب کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے گویا ہوا۔ ''انھیں میں اکثر یہاں سے آتے جاتے دیکھتا ہوں، اور دیکھ کر پریشان ہوتا رہا ہوں کہ آخر یہ شخص ہے کون؟ شباہت میں اس قدر جاذبیت، آنکھوں میں ایک انجانا سا سُرور، چال میں تمکنت جو انھیں دوسرے ہزاروں لوگوں میں ممتاز کرتی ہے۔ ساتھ ہی میرا ذہن مجھے یہ ضرور باور کراتا تھا کہ یہ محض کوئی شخص نہیں بلکہ شخصیت ہیں۔ ہاں! میرے تصور نے انھیں کبھی شاعر کے روپ میں نہیں دیکھا برخلاف اس کے اکثر فلمی اسٹرگلر کے طور پر ہی دیکھا ہے۔ راشد میری باتیں سُن کر ہنسنے لگا پھر یوں ہی ہنستے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''جانتے ہو یہ کون ہیں؟'' ۔ میں نے کہا۔ ''نہیں، جانتا تو نہیں ہوں، البتہ اب انھیں جاننے کی خواہش میرے اندرون میں انگڑائی لینے لگی ہے۔ راشد پھر ہنسنے لگا ساتھ ہی میری طرف ''زبر'' بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ مجموعہ پڑھو، اسے پڑھ کر کچھ نہیں تو چالیس فیصد انھیں جان جاؤ گے''۔ میں نے کہا ''محض چالیس نہیں، اسّی فیصد جاننا چاہتا ہوں، اور اس کے لیے مجھے ان سے ملنا ہوگا، وہ بھی ایک دو مرتبہ نہیں، ہزاروں مرتبہ! بولو ملوا سکو گے؟''

''ملنا چاہتے ہو تو چلو ابھی، اسی وقت ملوا دوں، لیکن دو چار ملاقاتیں کافی ہیں، تم ہزاروں مرتبہ کیوں ملنا چاہتے ہو؟'' راشد کا لہجہ استعجابیہ ہو گیا تھا۔

وہ اس لیے کہ شاید ابتدائی سیکڑوں ملاقاتیں میرے اور اُن کے درمیان حائل اجنبیت کے حصار زائل کرنے ہی میں صرف ہو جائیں۔ ممکن ہے اس کے بعد کی سیکڑوں ملاقاتوں میں سے کوئی ایک مخصوص ملاقات میری خواہشات کی بے چارگی پر ترس کھا کر اُن کے بطون میں جھانکنے کا موقع عنایت کردے۔ اتنا ہی نہیں مجھے تو اُن کے مزاج سے اپنی طبیعت کو ہم آہنگ کرنا ہے، اُن کے فکر و شعور کی گہرائی و گیرائی میں اُترنا ہے اور اُن کے وجدان کے سمندر میں غوطے بھی لگانا ہے، تاکہ علم کا دُرِ نایاب نہ سہی کم از کم بے آب موتی ہی سہی میرے ہاتھ تو لگے۔ میری باتیں سُن کر راشد حسبِ عادت مسکرایا۔ ''یار تم تو تاجدار تاج صاحب کے بہت بڑے شیدائی معلوم ہوتے ہو''۔

''تاجدار تاج کا نہیں، شیدائی تو میں علم و ادب کا ہوں۔ اس لحاظ سے جو لوگ بھی علم و ادب سے وابستہ ہیں اور اپنی علمیت سے ادب کو فیض پہنچا رہے ہیں، میں اُن سبھی سے ملاقات کا متمنی رہتا ہوں''۔

''ایسی بات ہے تو ایک مشاعرہ کراؤ، میرا وعدہ ہے میں انھیں کسی طرح راضی کر کے لے آؤں گا''۔

''محض ملاقات کی خاطر مشاعرہ! چہ معنی؟'' میرے لہجہ میں جھنجلاہٹ در آئی تھی اور بھنویں تن گئی تھیں۔

بہر کیف! بات آئی گئی ہوگئی۔ حالانکہ راشد سے ملاقاتیں بدستور ہوتی رہیں، لیکن پھر بھی تاجدار تاج صاحب کا ذکر نہیں چھڑا۔

مذکورہ واقعہ کے قریباً چار ماہ بعد ایک روز تاجدار تاج صاحب میری دوکان کے آگے سے گزرتے ہوئے میری جانب دیکھ رہے تھے۔ میں نے فوراً بہ آواز بلند سلام کیا۔ وہ جواب دیتے ہوئے ٹھہر گئے اور میری جانب سوالیہ نگاہوں سے تکنے لگے۔ میں کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا اور قدرے لجاجت سے گویا ہوا۔

''سر، ایک زحمت دینا چاہتا ہوں''۔

وہ اتنا سُنتے ہی میرے قریب آگئے۔ ''کہو، کیا بات ہے؟''۔

میں نے جھک کر دراز سے ''زبر'' نکالی اور اُن کی جانب بڑھاتے ہوئے عاجزانہ لہجے میں کہا۔ ''براہِ مہربانی اس پر دستخط کر دیجیے''۔

کتاب دیکھ کر اُن کے چہرے پر حیرت آمیز مسرّت رقص کرنے لگی تھی، اُسے اُلٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولے تھے۔

''یہ تو مجھ حقیر فقیر کی معمولی سی کتاب ہے، اس پر دستخط کروا کے کیا کروگے؟''۔

''سر، آپ کے دستخط ہوتے ہی یہ معمولی سی کتاب غیر معمولی ہوجائے گی''۔ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

''اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو ٹھیک ہے لاؤ قلم دو''۔

میں نے انھیں فوراً قلم تھما دیا۔ قلم لے کر چند لمحے یوں ہی کچھ سوچتے رہے پھر یکبارگی مجھ سے پوچھ بیٹھے۔

''تم نے یہ بتایا نہیں کہ کتاب تمھیں ملی کہاں سے؟''۔

''میرے ایک دوست نے دی''

''دوست نے کہاں سے حاصل کی؟'' اُن کی متلاشی نگاہیں میرے چہرے پر جمی تھیں جبکہ لب تبسّم ریز تھے۔

''یہ تو میں نہیں جانتا''۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی، حالانکہ میرا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ چنانچہ اُن کی نگاہیں میرے چہرے پر پھسل رہی تھیں۔ چند لمحے توقف کے بعد اُنھوں نے استفسار کیا۔

''تمھارا دوست جس نے تمھیں یہ کتاب دی، وہ شاعر ہے؟''

''جی نہیں! وہ کون ہے، کیا ہے، کہاں رہتا ہے، میں کچھ نہیں جانتا۔ اُس کے اور میرے درمیان شناسائی کا ذریعہ ڈرامہ ہے۔ میں نے ایک ڈرامہ تحریر کیا ہے، اُس میں وہ ایکٹ کرنا چاہتا ہے''۔

''تمھیں نام تو معلوم ہوگا اُس کا؟''

''جی! راشد عظیم!!''

نام سنتے ہی وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگے، میں جھینپ گیا۔ پھر جھینپ مٹانے کی خاطر گویا ہوا۔

''راشد آپ کو جانتا ہے، اُس نے مجھے آپ سے ملوانے کو بھی کہا تھا''

''راشد میاں، میرے خلفِ اکبر ہیں''

''کیا! آپ راشد کے والد ہیں؟''

''جی!''

پھر کیا تھا، راشد سے میری ملاقاتیں کم ہونے لگیں اور تاجدار تاج صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔

تاجدار تاج کا اصل نام محمد اسلام صدیقی تھا۔ 8 جولائی 1939 کو دیوبند (یو۔پی) میں آپ کی ولادت ہوئی۔ شاعری کا رجحان زمانۂ طالب علمی ہی سے تھا۔ انٹر پاس کرنے کے بعد تعلیمی سلسلہ موقوف ہوگیا، دو ایک برس معاش کی خاطر در در بھٹکا کیے لیکن اس شہر نے معیشت کا کوئی ایسا در وانہیں کیا جو ان کی ضروریات کی تکمیل کرتا۔ پھر کیا تھا۔ دِل میں ارمانوں کا ہجوم، آنکھوں میں بے شمار خواب اور ذہن میں فکر کی یورش لیے شہروں کی دلہن کہی جانے والی ممبئی کی پناہ میں آگئے۔ اس دلہن کے نظر فریب حُسن نے ان کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ بناؤ سنگار اور ظاہری چمک دمک کے اس شہر میں لاکھ جتن کے باوجود وہ خود کو ایڈجسٹ نہیں کر سکے، اُس دور میں شہرِ ممبئی کا ادبی حلقہ ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر تھا، لہٰذا وہ دیوبند سے جو شعری ذوق و فکر ساتھ لائے تھے وہ بے اعتبار ٹھہرا۔ چنانچہ اَنا کی ضد نے انھیں اس شہر کو خیر باد کہنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن دو ایک برس بعد ہی انھوں نے اسلام صدیقی کا چولا بدلا، پھر اپنے اُصولوں کی ایک دنیا وضع کی اور خود کو اس کا تاجدار بنایا، اَنا نے تاجپوشی کی۔ یعنی وہ تاجدار تاج بن کر دوبارہ مایا نگری ممبئی میں قدم رنجہ ہوئے۔ اب کی یہاں کی چمک دمک سے آنکھیں مانوس ہو چکی تھیں اور شعری وجدان بھی ترقی پسندی سے ہم آہنگ تھا۔ لہٰذا رفتہ رفتہ ان کے نام کا پرچم بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔ اس اثنا میں وہ ممبئی میونسپل کارپوریشن کے شعبۂ تعلیم سے وابستہ ہو چکے تھے۔ غرضیکہ معاشی حالات نسبتاً بہتر تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے تاجدار تاج کی شعری کائنات روزناموں، رسائل و جرائد کی زینت بننے لگی اور ان کے نام کی گونج مشاعروں میں سنائی پڑنے لگی تو ان کے حوصلوں میں پر لگ گئے اور اُڑان فلمی دنیا کے آسمانوں کی جانب ہونے لگی۔ حالانکہ یہ آسمان چیلوں اور کوؤں سے پوری طرح ڈھکا ہوا تھا۔ ایسے میں یہاں اپنے لیے جگہ بنا لینا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔ کہاوت ہے کہ ''ہمّتِ مرداں مددِ خدا'' تاجدار تاج نے اس کہاوت پر عمل کرتے ہوئے ہمّت کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور مسلسل اس آسمان پر ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے۔ نتیجتاً محنت رنگ لائی اور ان کی ملاقات ایک نئے موسیقار جوڑی رتن دیپ اور ہیم راج سے ہوئی۔ وہ فلم 'رُت رنگیلی' اور 'پیاسی ندی' کے لیے موسیقی کمپوز کر رہے تھے۔ دونوں فلموں میں ایک ایک گیت تاجدار تاج کا بھی شامل کرلیا۔ رُت رنگیلی 1971 اور پیاسی ندی 1973 میں ریلیز ہوئی تھی لیکن دونوں ہی فلمیں باکس آفس پر ناکام ثابت ہوئیں۔ اس کے بعد انھوں نے فلم 'راکھ اور چنگاری' کے لیے موسیقی کمپوز کی جس میں سارے گیت تاجدار تاج نے لکھے تھے۔ یہ فلم 1979 میں ریلیز ہوئی جس کے دو نغمے کافی مقبول ہوئے:

یہ انجان راہیں یہ منزل پرائی
مجھے زندگی تُو کہاں لے کے آئی

اس نغمے کو محمد رفیع نے آواز دی تھی۔ جبکہ دوسرا نغمہ ''گورا

دیکھتے ہی دیکھتے تاجدار تاج کی شعری کائنات روزناموں، رسائل و جرائد کی زینت بننے لگی اور ان کے نام کی گونج مشاعروں میں سنائی پڑنے لگی تو ان کے حوصلوں میں پر لگ گئے اور اُڑان فلمی دنیا کے آسمانوں کی جانب ہونے لگی۔ حالانکہ یہ آسمان چیلوں اور کوؤں سے پوری طرح ڈھکا ہوا تھا۔ ایسے میں یہاں اپنے لیے جگہ بنا لینا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔ کہاوت ہے کہ ''ہمّت مرداں مدد خدا'' تاجدار تاج نے اس کہاوت پر عمل کرتے ہوئے ہمّت کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور مسلسل اس آسمان پر ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے۔ نتیجتاً محنت رنگ لائی اور ان کی ملاقات ایک نئے موسیقار جوڑی رتن دیپ اور ہیم راج سے ہوئی۔

مکھڑا لینا کالے'' کو آشا بھوسلے نے سر سے سجایا تھا۔ پھر کیا تھا پے در پے کئی فلمیں قطار اندر قطار ہاتھ باندھے تاجدار تاج کے ارد گرد طواف کرنے لگیں۔ جن میں بالخصوص 'رئیس زادہ' اور 'رام بھروسے' موسیقار رویندر جین، 'شیطان مجرم'، 'انوکھا انسان' اور 'انسان اور انسان'، 'شہزادی ممتاز' موسیقار رتن دیپ اور ہیم راج 'بہار آنے تک' موسیقار راجیش روشن قابل ذکر ہیں۔ اس کے بعد آخری فلم 'مقابلہ'' 2001 میں لکھی جس میں ان کا لکھا ایک گیت جسے انورادھا پوڈوال نے گایا تھا 'کھنکے یہ کنگنا سن مورے سجنا' کافی مقبول ہوا تھا۔ علاوہ ازیں فلم 'انسان اور انسان' میں تحریر کردہ مقبول نغمے درج ذیل ہیں۔

(1) لٹ اُلجھی ہے سلجھادے مورے بالما،گلوکارہ: گیتادت

(2) رام کرے پھر ہو ہمارا ملنوا،گلوکار: محمد رفیع

(3) کیسے کیسے گیانی یہ سچ کہہ گئے،گلوکار: منا ڈے

(4) ماتھے پہ ڈال کے جھومر گال کے،گلوکارہ: چندرانی مکھرجی

(5) اے مصور میرے محبوب کی تصویر بنا،گلوکار: محمد رفیع

ان نغموں کے علاوہ بھی پچاسوں نغمے ریکارڈ کیے گئے لیکن افسوس! کچھ فلمیں ریکارڈنگ تک ہی محدود رہیں، کچھ چار چھ ریل تک پہنچتے پہنچتے دم توڑ گئیں۔ ان فلموں میں کئی یادگار نغمے بھی ریکارڈ ہوئے جو ابھی میگنیٹک ٹیپ میں قید ہیں۔ اسی قبیل کا درج ذیل نغمہ مجھے یاد آرہا ہے:

ٹوٹ گیا دل جانے بھی دو اس میں غم کی بات ہے کیا
رستے کا ایک پتھر سمجھو، پتھر کی اوقات ہے کیا
(گلوکار: مکیش)

ان کے علاوہ معروف غزل سنگر خوشبو خانم نے اپنے البم 'خوشبو کی خوشبو سے' میں تاجدار تاج کا ایک گیت شامل کیا ہے، جس کے بول ہیں 'چھت کے اوپر کاگا بولے'

تاجدار تاج انتہائی بذلہ سنج اور ظریف شخصیت کے مالک تھے ، ان کی آنکھوں میں ایک لطیف سی شرارت اور لبوں پر ہمہ وقت مسکراہٹ کا بسیرا رہتا. شاید ھی کوئی ایسا ہو جس نے کبھی اُن کی آنکھوں میں غصّے کی چنگاری دیکھی ہو البتہ وہ انانیت کے زیر اثر ضرور تھے .یہی سبب تھا جو وہ ہمیشہ کم آمیز رہے۔

تاجدار تاج انتہائی بذلہ سنج اور ظریف شخصیت کے مالک تھے، ان کی آنکھوں میں ایک لطیف سی شرارت اور لبوں پر ہمہ وقت مسکراہٹ کا بسیرا رہتا۔ شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے کبھی اُن کی آنکھوں میں غصّے کی چنگاری دیکھی ہو البتہ وہ انانیت کے زیر اثر ضرور تھے۔ یہی سبب تھا جو وہ ہمیشہ کم آمیز رہے۔ یہی وطیرہ اپنی تخلیقات کے ساتھ بھی روا رکھا۔ مجال ہے انھوں نے کبھی کسی اخبار یا رسالے کو اپنی تخلیق بھجوائی ہو۔ ہاں! کسی مدیر نے خود ہی اُن سے فرمائش کی تو بہ خوشی عنایت کر دیتے۔ اس کے پس پُشت اُن کی منطق یہ تھی کہ اگر انھوں نے کوئی تخلیق کسی رسالے

کو بھجوائی اور خدانخواستہ مدیر نے اُن کی تخلیق ناقابل اشاعت کہہ کر لوٹا دی تو یہ اُن کے لیے صدمۂ جانکاہ سے کم نہ ہوگا۔

تاجدار تاج کا اوّلین شعری مجموعہ 'زہر' 1990 میں شائع ہوا اور ادبی دنیا میں مقبول عام ہوا۔ اس مجموعے پر مہاراشٹر راجیہ اُردو ساہتیہ اکادمی نے انعام سے بھی نوازا تھا۔ دوسرا شعری مجموعہ 'آوارہ پتھر' 2004 میں شائع ہوا۔ جو بہ یک وقت ہندی اور اُردو رسم الخط میں تھا۔ شاید اسی سبب اسے وہ پذیرائی نہیں مل سکی جو ملنی چاہیے تھی۔ تیسرا مجموعہ 'برفیلی زمین کا سورج' مئی 2016 میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے کی رسم اجرا ممبئی اور دیوبند میں بڑے ہی دھوم دھام سے منعقد کی گئی تھی۔ جن میں ادبی دنیا کی مقتدر شخصیات نے شرکت کی تھی اور اس مجموعے کو اعتبار بخشا تھا۔ تاجدار تاج اپنے سابقہ دونوں مجموعوں کی بہ

تاجدار تاج کا اوّلین شعری مجموعہ 'زہر' 1990 میں شائع ہوا اور ادبی دنیا میں مقبول عام ہوا.اس مجموعے پر مہاراشٹر راجیہ اُردو ساہتیہ اکادمی نے انعام سے بھی نوازا تھا. دوسرا شعری مجموعہ 'آوارہ پتھر' 2004 میں شائع ہوا. جو بہ یک وقت ہندی اور اُردو رسم الخط میں تھا. شاید اسی سبب اسے وہ پذیرائی نہیں مل سکی جو ملنی چاہیے تھی۔

نسبت حالیہ مجموعے سے زیادہ پُر اُمید تھے۔ اس کے خاطر خواہ نتائج بھی برآمد ہو رہے تھے۔ ابھی وہ اس مجموعے کی کامیابی کے سحر میں کھوئے ہوئے ہی تھے کہ اچانک علیل ہوگئے۔ 'مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی' کے مصداق اُن کی حالت دن بہ دن بد سے بدتر ہوتی گئی۔ آخرش 25 اگست 2016 بروز جمعرات عصر اور مغرب کے درمیان تاجدار تاج صاحب کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

تاجدار تاج نے نصف صدی سے زائد عرصہ ممبئی کی سیاحی میں گزارا، لیکن اپنے وطن مالوف دیوبند سے کبھی غافل نہیں رہے۔ وہ سال بہ سال دیوبند ضرور جاتے اور اپنے احباب نیز رشتہ داروں سے ملتے۔ اسی طرح ممبئی کے کُرلا علاقے میں لگ بھگ پینتیس برس رہائش پذیر رہے، ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ملاڈ کالونی میں رہائش اختیار کرلی۔ لیکن کرلا کو وہ کبھی فراموش نہیں کر سکے۔ موت کے وقت ان کی رہائش جوگیشوری کے امرت نگر میں تھی۔ اسی سبب اُن کی آخری آرام گاہ جوگیشوری کے اوشیوارہ قبرستان میں ہے۔ یہ حقیقت ہے اور مجبوری بھی کہ اب وہ اپنی اس آرام گاہ سے چاہ کر بھی کہیں اور ہجرت نہیں کر سکتے۔ اُن کی اس مجبوری پر مجھے فلم 'راکھ اور چنگاری' میں لکھے اُن کے نغمے کے یہ بول بے ساختہ یاد آتے ہیں:

یہ انجان راہیں یہ منزل پرائی
مجھے زندگی تو کہاں لے کے آئی

■

Ishtiyaque Saeed B-01, Mira Paradise, Geeta Nagar, Phase-2, Mira Road, Thane - 401107
Mob.:09224799971

زبیر رضوی

کچھ یادیں

عبدالحی

زبیر رضوی سے میری بہت پرانی ملاقات نہیں تھی۔ یہی کوئی دس بارہ برس قبل میں ان سے پہلی دفعہ ملا تھا۔ ذہن جدید کے حوالے سے کچھ معلومات حاصل کرنی تھی اس وقت میرا قیام جے این یو میں تھا۔ میں نے زبیر صاحب کو ملاقات کے لیے فون کیا۔ انھوں نے جو وقت دیا میں اس مقررہ وقت پر ان کی رہائش گاہ ذاکر نگر نہیں پہنچ سکا، اس لیے میں نے اپنے ایک قریبی ساتھی سے کہا کہ آپ میرے لیے برائے مہربانی زبیر رضوی صاحب سے ملاقات کرلیں اور کچھ چیزیں وہ دیں گے انھیں حفاظت سے رکھ لیں۔ وہ صاحب جواب ایک معتبر اخبار میں سب ایڈیٹر ہیں، مقررہ وقت پر زبیر صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے اور ان سے کافی باتیں کی اور زبیر صاحب نے اپنے رسالے کے تعلق سے کئی اہم باتیں بتائیں۔ باتوں باتوں میں زبیر صاحب کو پتہ چل گیا کہ یہ وہ صاحب نہیں ہیں۔ اب تو زبیر صاحب کا غصہ ساتویں آسمان پر۔ وہ اکھڑ گئے اور اسی وقت فون کیا اور بہت سخت لہجے میں کہا کہ نواب صاحب آپ نے تو حد ہی کردی۔ یہ کیسی ریسرچ ہے۔ آپ کو خود آنا چاہیے تھا۔ خیر کسی طرح میں نے ان سے معافی مانگی اور معذرت کرلی۔ وہ بھی مان گئے اور ان کی اعلیٰ ظرفی دیکھیے کہ اس کے بعد بھی انھوں نے ذہن جدید کا پچاسواں شمارہ اور ساتھ ہی ذہن جدید کے کئی اہم شمارے دیے اور بہت سارا مواد فوٹو کاپی کی شکل میں مجھے بھجوایا۔ یہ سب ہونے کے کئی برسوں بعد میں ایک دن قومی اردو کونسل کے اپنے دفتر میں بیٹھا تھا اور میری کتاب ادبی صحافت پریس میں جانے والی تھی کہ وہ آدھمکے۔ کیوں کہ وہ اچانک ہی وارد ہوتے تھے اور مجھ سے کافی دیر تک اپنی ملازمت کے، اپنے مشاعروں کے اور دیگر قصے سناتے رہتے تھے۔ دوران گفتگو مجھ سے معلوم کیا کہ آج کل رسائل کی ذمے داریوں کے علاوہ کیا لکھنا پڑھنا ہورہا ہے، میں نے اپنی کتاب کا مسودہ ان کے سامنے رکھا۔ انھوں نے مسودہ دیکھا اور ذہن جدید والا حصہ دیکھنے کے بعد بولے کہ اچھا تو وہ نواب تم ہی ہو۔ ان کا پریقین لہجے میں یہ کہنا کہ وہ نواب ریسرچ اسکالر تم ہی ہو۔ میں چاہ کر بھی کچھ نہیں کہہ سکا۔ انھوں نے پرانی باتوں کو یاد کرتے ہوئے موجودہ ریسرچ کے حوالے سے پرمغز لکچر دیا اور کہا کہ چلو تم نے تو کسی کو بھیجا بھی تھا اور آج اپنا مسودہ بھی سامنے رکھا ورنہ کئی لوگ تو بس ادھر ادھر سے چیزیں اکٹھا کرتے ہیں اور بغیر حوالے کے شائع کردیتے ہیں۔

زبیر صاحب کے حوالے سے ایک اور قصہ یاد آتا ہے۔ میں فکر و تحقیق کا نئی نظم نمبر ترتیب دے رہا تھا، میں نے جن قلمکاروں کی فہرست بنائی تھی اس میں زبیر رضوی کا نام بھی شامل تھا۔ میں نے انھیں فون کیا کہ فکر و تحقیق کے لیے آپ کا ایک مضمون چاہیے، میرے موضوع بتانے پر وہ جیسے خوشی سے اچھل پڑے کہ یہ ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ ان کا پہلا جملہ یہ تھا کہ چلو کسی کو تو نظم کا خیال آیا ورنہ لوگ تو شاعری میں غزل سے آگے ہی نہیں بڑھتے۔ انھوں نے کئی نام بھی بتائے جن سے اس موضوع پر لکھوایا جاسکتا تھا، ساتھ ہی نئی نظم کی تاریخ اور ارتقا پر تقریباً بیس پچیس منٹ تک فون پر مجھے بتاتے رہے اور میں ان کی علمی گفتگو سے سیراب ہوتا رہا اور پھر اس گفتگو کا یہ فائدہ ہوا کہ میں نے بعد میں جنھیں بھی فون کیا پہلے انھیں نئی نظم پر پانچ منٹ تک بتایا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمیں اچھے مضامین ملے۔ لیکن مجھے یہاں یہ بتانے میں کوئی عار نہیں کہ مجھے نئی نظم پر اور اسی طرح کئی موقعوں پر زبیر رضوی صاحب کی سرپرستی حاصل رہی اور ان کی گفتگو اور زندہ جاوید انسائکلو پیڈک اسٹائل نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا اور میں نے بھی کسی اور سے بات چیت میں ان سے حاصل شدہ معلومات کا خوب خوب استعمال کیا۔

قومی اردو کونسل میں 'عصری عالمی ادب کے ستون' اور 'ترقی پسند اور ان کے معاصر پینٹرز' کا مسودہ جمع کرنے سے قبل ان کا فون آیا کہ کونسل نے میرا مسودہ منظور کرلیا ہے اور مجھے جلدی ہی جمع کرنا ہے لیکن اس کی سیٹنگ ونسل کے املا نامے کے مطابق کرانی ہے اس لیے کسی ماہر کمپوزر سے میرا رابطہ کراؤ۔ ہمارے ایک ساتھی کو کمپوزنگ کا اچھا تجربہ تھا انھوں نے کتاب کی سیٹنگ وغیرہ کرنے کی حامی تو بھری لیکن اس شرط پر کہ ان کا نام نہ بتایا جائے۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے آپ کام کریں۔ جیسے ہی کام ختم ہوا اور مسودہ جمع ہوا، زبیر صاحب میرے دفتر میں حاضر تھے اپنی چیک بک لے کر کہ بھائی وہ کمپوزر کا کتنا پیسہ ہوا، بتاؤ، اور ساتھ ہی چیک کاٹ کر فوراً میرے حوالے کیا۔ اسی موقع پر کہنے لگے کہ اس Saturday کو تم اور شاہد میرے گھر آؤ۔ میں نے حامی بھرلی اور پھر شاہد اختر صاحب کے ساتھ ان کے دولت کدے پر پہنچ گیا۔ وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اپنی بیگم سے تعارف کرایا۔ دوران گفتگو ڈرائی فروٹ، پھل بسکٹ اور بعد میں چائے سے تواضع کی۔ ساتھ ہی اپنی جوانی کے قصے، اور یہ ہے میرا ہندوستان نظم کی مقبولیت سے جڑی یادیں ہم سے شیئر کیں۔ انھوں نے ذہن جدید کے کئی شمارے عنایت کیے اور اپنی مختلف موضوعات پر لکھی کتابیں بھی پیش کیں۔ ان کتابوں کو دیکھتا ہوں تو کلیجہ منھ کو آتا ہے کہ وہ ایسے اچانک کیسے چلے گئے۔ کم سے کم لوگ ان سے کچھ کہتے کچھ سناتے، کچھ سنتے لیکن ایسے بھی کیا جانا کہ چلتے پھرتے چل دیے اور گئے بھی تو علی الاعلان یہ کہتے ہوئے کہ میں سسکیاں لے کر رونے کا قائل نہیں ہوں، درد جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو آنکھیں نم کرلیتا ہوں۔ جاتے جاتے ان کی آنکھیں تو نم ہوئی ہی تھیں لیکن ان کے جانے کے بعد نہ جانے کتنی آنکھیں نم ہیں کہ اب اردو میں کوئی دوسرا زبیر رضوی نہیں آنے والا۔ ان کا تاریخی جملہ کہ بس آنکھیں نم کرلیتا ہوں، انھوں نے اردو کے موجودہ حالات پر کہا، وہ اردو کی حالت زار پر بہت دکھی تھے اور افسردہ تھے، اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ زبیر رضوی نے اردو کے عشق میں اپنی جان گنوائی۔ کیا ضرورت تھی اس عمر میں انھیں سیمنار

میں جانے کی اور اتنی دیر تک تقریر کرنے کی، لیکن موضوع ایسا تھا کہ ان کا شامل ہونا ناگزیر تھا اور وہ جب بھی مائک سنبھالتے ہیں تو اردو والے جانتے ہیں کہ کتنی علمی اور بصیرت افروز گفتگو کرتے ہیں۔ اردو اکادمی کے سمینار سے ایک دو ہفتے قبل ہی ان سے قومی اردو کونسل کی عالمی کانفرنس میں ملاقات ہوئی تھی۔ جہاں انھوں نے کھلے عام یہ کہا تھا کہ سمینار اور کانفرنسوں سے اردو کا کچھ بھلا نہیں ہونے والا۔ ہم اردو والے بے حس ہو چکے ہیں۔ ہم خود نہیں جانتے کہ ہمارے آس پاس کتنے اردو والے ہیں اور دوسرے لوگ اردو سے کس قدر پیار کرتے ہیں، ہم نے کبھی دوسروں کو گلے لگانے کی کوشش نہیں کی اور ہم بس اپنے دائرے میں محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ اگر ہم اردو کو بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں گھروں سے باہر نکل کر عملی دنیا میں قدم رکھنا ہوگا، اور سرکاروں پر، اداروں پر زور ڈالنا ہوگا، ساتھ ہی اپنے گھروں میں اپنے بچوں کو اردو کے قریب لانا ہوگا۔ کتنے لوگ نیشنل اسکول آف ڈراما میں جاتے ہیں، کتنے اردو والے سنگیت ناٹک اکادمی میں جاتے ہیں، کبھی اردو والے وہاں جائیں اور دیکھیں کہ اردو کے کیسے عاشق موجود ہیں۔ ان کی یہ تقریر سامعین بہت خاموشی سے سن رہے تھے اور اپنے دلوں میں جھانکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی تقریر کے بعد سب نے ان کی تعریف کی اور دوسرے دن کے اخبارات میں یہی سرخی بنی تھی۔

زبیر رضوی نے جب اردو کا رسالہ شائع کرنے کا ارادہ کیا تو ان کی سوچ یہ تھی کہ رسالہ دوسرے رسالوں سے بالکل منفرد ہو۔ اردو کا ایک ایسا رسالہ نکالنا جو اردو میں ادبیات کے علاوہ فنون لطیفہ کو کور کرے زبیر رضوی کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ 'بڑی زبان کا زندہ رسالہ' یہ ذہن جدید کے ہر شمارے کا سرنامہ تھا۔ اردو کا یہ واحد رسالہ ہے جو سنگیت ناٹک اکادمی کے مالی تعاون سے بھی شائع ہوا ہے۔ ذرا بتائیے کہ کون ہے دوسرا اردو والا جو ایسے اداروں سے مالی مدد حاصل کر سکے۔ زبیر رضوی صاحب جیسی ہمہ جہت شخصیت اردو میں کوئی اور نہیں ہے۔ وہ زندگی بھر حقیقت پسند رہے۔ حق بات کہنے سے کبھی نہیں ڈرے۔ انھوں نے اردو کے بڑے بڑے سورماؤں کے خلاف اپنے رسالے میں کھل کر لکھا لیکن کبھی ڈرے نہیں اور نہ ہی کسی دروازے پر اپنے رسالے کے لیے دستک دی بلکہ گئے تو اس دعویٰ کے ساتھ کہ یہ ان کا حق ہے کیوں کہ وہ اردو کا رسالہ نکال رہے ہیں۔ ان کا یقین اور اعتماد اتنا مضبوط اور کامل تھا کہ وہ بس اپنے زور بازو پر بھروسہ کرتے تھے اور اللہ کا کرم یہ رہا کہ اردو کی ایسی کسمپرسی کی حالت میں بھی اکیلے اپنے دم پر ذہن جدید کو پچیس برسوں تک نکالتے رہے۔ کچھ دنوں قبل ہی انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ ذہن جدید کے پچیس برس پورے ہونے پر ایک بڑا پروگرام کرنے کی سوچ رہا ہوں۔ اس میں تم کو ذہن جدید کی خدمات پر مقالہ پڑھنا ہے۔ لیکن قدرت کو یہ منظور نہیں تھا اور وہ ہم سب کو چھوڑ کر راہی عدم ہو گئے۔

زبیر رضوی جدید لب و لہجے کے اہم شاعر تھے۔ انھوں نے ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں رجحانات سے استفادہ کیا تھا۔ وہ ایک ایسی شخصیت تھے جنھیں شاعر، صحافی، ناقد، ڈراما نگار، براڈ کاسٹر اور ماہر فنون لطیفہ ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ ان کا حافظہ اور مطالعہ بہت اچھا تھا۔ جب بھی میں ان سے ملتا میری معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا۔ اردو شعر و ادب، رقص و موسیقی، فلم، ٹی وی، صحافت، تھیٹر، اور مصوری جیسے موضوعات پر گھنٹوں وہ بات کر سکتے تھے۔ میرے خیال میں اردو ادب میں ایسی کوئی دوسری شخصیت نہیں جسے فنون لطیفہ کی اتنی اچھی فہم ہو۔ روایتی اردو والوں کے برعکس وہ ہمیشہ اردو کے تعلق سے مثبت انداز فکر رکھتے تھے، 1990 سے لے کر اب تک اپنے رسالے ذہن جدید کو کامیابی سے شائع کرتے رہے، یہ اپنی طرز کا منفرد رسالہ ہے، اس میں جیسے موضوعات پر تحریریں شائع ہوئیں ویسی کسی دوسرے رسالے میں نہیں۔ ان کی نظمیں علی بن متقی رویا، صادقہ، کتوں کا نوحہ وغیرہ بہت مقبول رہی ہیں۔ دیوندر اسر کے بعد زبیر رضوی میرے لیے دوسری محبوب شخصیت تھے۔ ان کا جانا اردو ادب اور خود میرے لیے بہت بڑا نقصان ہے۔ وہ جدید دور کے بہت مقبول شاعر ہیں۔ ان کے شعری مجموعے لہر لہر ندیا گہری، خشت دیوار، مسافت شب، دامن، پرانی بات ہے، دھوپ کا سائباں، انگلیاں نگار اپنی، پورے قد کا آئینہ، سبزہ ساحل، سنگ صدا ہیں۔ ان کے بہت سے اشعار زبان زد خاص و عام ہیں۔

بطور خراج عقیدت ان کے کچھ اشعار:

ہماری گردش پا راستوں کے کام آئی
کہیں پہ صبح ہوئی اور کہیں پہ شام آئی

میں جو بچھڑوں تو بچھڑ جانے کا غم مت کرنا
دل کو افسردہ کبھی آنکھوں کو نم مت کرنا

ہجر کے چاند نے اک بار کہا تھا زبیر
دامن دل پہ کوئی نام رقم مت کرنا

یہ گھر آباد تھا کتنا یہاں کہرام تھا کتنا
مکینوں کا گلی کوچوں میں اس کے نام تھا کتنا

وہ جب بھی یاد آتا ہے تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں
زبیر خوش نوا مقبول خاص و عام تھا کتنا

کوئی چہرہ نہ صدا کوئی نہ پیکر ہوگا
وہ جو بچھڑے گا تو بدلا ہوا منظر ہوگا

اپنے سب خواب نہ یوں آنکھ میں لے کر نکلو
دھوپ ہوگی تو کسی ہاتھ میں پتھر ہوگا

ان اشعار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زبیر رضوی کا تخلیقی آہنگ اوروں سے کتنا منفرد اور مختلف تھا۔

زبیر رضوی ایک نظر میں

اصل نام: سید زبیر احمد رضوی، **قلمی نام:** زبیر رضوی، **تاریخ پیدائش:** 1935، **آبائی وطن:** امروہہ، **سکونت:** دہلی (1952 میں)، **تاریخ وفات:** 20 فروری 2016 (81 سال کی عمر میں)، **اہلیہ:** جمشید جہاں، **والد محترم:** سید محمد رضوی (پیشے سے مدرس تھے)، **والدہ:** محترمہ فہمیدہ خاں خاتون، **دادا:** مولانا احمد حسن محدث امروہوی ایک مشہور عالم دین اور بانی دارالعلوم دیوبند مولانا قاسم نانوتویؒ کے شاگرد تھے۔

تعلیم: ابتدا میں پانچویں اور چھٹی جماعت تک کی تعلیم حیدرآباد کے مشہور فوقانیہ مدرسہ سلطان بازار اور کاچی گوڑا میں ہوئی، دوسری مرتبہ حیدرآباد سے ہائر سیکنڈری تک کی تعلیم حاصل کی۔ دہلی یونیورسٹی سے ایم اے کی تعلیم حاصل کی۔

شعری مجموعے: لہر لہر ندیا گہری (1965)، خشت دیوار (1970)، مسافت شب (1977) (انتخاب)، دامن (1984)، پرانی بات ہے (1988)، دھوپ کا سائباں (1992)، انگلیاں نگار اپنی (1998)، پورے قد کا آئینہ (2005)، سبزہ ساحل (2008)، سنگ صدا (2014) (انتخاب)،

نثری کتابیں: اردو فنون اور ادب (تنقید) 2005، غالب اور فنون لطیفہ (تنقید) 2005، نئی نظم تجزیہ اور انتخاب (مرتبہ) 2007، تماشہ میرے آگے، غالب پر ڈرامے (مرتبہ)، 2007، آزادی کے بعد اردو اسٹیج ڈرامے (انتخاب، مرتبہ) 2008، یک بابی اردو ڈرامے (انتخاب، مرتبہ) 2008، کالی رات (فسادات کے افسانے) (ایک انتخاب، مرتبہ)، 2008، عصری ہندوستانی تھیٹر (2012)، ہندوستانی سنیما: سو برسوں کا سفر (2015)، ترقی پسند اور ان کے معاصر پینٹر (2015)، عصری عالمی ادب کے ستون (2015)

خودنوشت: گردش پا (2001)

ترجمہ: قلی قطب شاہ (نریندر لوتھر، ترجمہ: زبیر رضوی)، وادی سندھ کی تہذیب (سر مارٹیمولر، ترجمہ: زبیر رضوی)

ترتیب: محمد ریحان، نزد عظیم میڈیکل، کمیلہ روڈ، سہارنپور

■

Abudl Hai
Email.: ahaijnu@gmail.com

نگارخانۂ شاعری کا ایک گوہرآبدار

نظمی سکندرآبادی

منور حسن کمال

استاذ شاعر نظمی سکندرآبادی نے 21 اکتوبر 2016 کو دنیائے آب و گل کو الوداع کہہ دیا۔ انھوں نے ادب اور غزل کی روایت کو برقرار رکھنے کے لیے کامیاب کوششیں کیں۔ ان کے تمام شعری ذخیرے میں ایک احساس اور اعتبار کی جو فضا پائی جاتی ہے، وہ انھیں ان کے ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے۔ انھوں نے تقریباً 87 برس عمر پائی۔ وہ گزشتہ دو برس سے علیل تھے۔

نظمی سکندرآبادی ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو اپنے ادبی مطالعے کے ذریعے پروان چڑھایا۔ وہ اپنے علمی اور ادبی ذوق پر ہمیشہ نازاں رہے۔ وہ جب دہلی میں کسب معاش کے سلسلے میں وارد ہوئے تو دہلی آزادی کے بعد اگرچہ اجڑی اجڑی سی تھی اور تلاشِ معاش کرنے والوں کے لیے بڑے صبرآزما حالات تھے، لیکن نظمی سکندرآبادی کو اپنے مالکوں سے بہترین حسن سلوک کا تحفہ ملا۔ انھوں نے اپنے محسنوں کا بغیر کسی تکلف کے ذکر کیا اور ان کی مہربانیوں کے خوب خوب تذکرے کیے۔ ایسا وہی لوگ کرتے ہیں جو خود بھی اپنی پرورش و پرداخت سے ہی انسانی سلوک اور جذبۂ ایثار و محبت سے سرشار ہوتے ہیں۔ اپنی ذمے داریوں کو سمجھتے ہیں اور انھیں اپنی فکری اور عملی زندگی میں برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔

نظمی سکندرآبادی کا نام سمیع الدین (1930-2016) تھا۔ وہ فتح پور سیکری، آگرہ میں پیدا ہوئے، لیکن بچپن میں ہی والدین کے انتقال کے بعد ان کی پرورش و پرداخت ننھیال میں ہوئی۔ ان کے نانا ولی الدین ولی فتح پوری بھی شاعر تھے۔ ان کے ماموں نظام الدین نظام فتح پوری بھی قادرالکلام شاعر تھے، جہاں سے انھیں شاعری کا شوق وراثت میں ملا۔ لیکن یہ شوق دہلی آگرہ میں پروان چڑھا۔ وہ یہاں اردو بازار میں انجمن تعمیر اردو کی ہفتہ واری نشستوں میں باقاعدہ شرکت کرنے لگے اور یہاں ڈاکٹر قمر رئیس، گوپی چند نارنگ، جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، پروفیسر عنوان چشتی، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر کامل قریشی، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، رفعت سروش، سلام مچھلی شہری اور مخمور سعیدی وغیرہ کی صحبتوں سے شعری عرفان و فیض حاصل کیا۔ نظمی سکندرآبادی کی شاعری دل کے تقاضوں کا پیرہن ہے۔ اسی لیے حسن و عشق سے وابستہ معاملات کی نقش گری، بیتابی اور اداسی کی کیفیات کو اس طرح ظاہر کرتی ہے کہ وہ رجائیت پسندانہ نقطۂ نظر نہ ہو کر ایک توانا احساس بن کر سامنے آتا ہے۔ وہ شاعری میں قدیم روایات کے پاسدار ہیں، اسی لیے ان کے بعض دوست ان کو کلاسیکی ادب کا نمائندہ قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں عشق و محبت کے ساتھ ساتھ ان خارجی عوامل اور عصری واقعات و حادثات کو بھی جگہ

دی ہے، جو خالص موضوعاتی شاعری کا پیش خیمہ قرار دیے جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ روایت سے بغاوت نہیں بلکہ آبروئے غزل کی آبیاری ہے، جس کے لیے خلوص اور ریاضت کی جتنی ضرورت ہے اتنی ان واردات قلبی کو شعری لباس عطا کرنے میں بھی نہیں ہوتی:

کبھی تو اترے کوئی چاند گھر کے آنگن میں
کبھی تو قدر کے قابل غریب خانہ لگے

—

رہ گئے بن کر اسی کا آئینہ
جب کہیں صورت کوئی اچھی لگی

—

تمام عمر رہا کوئی بدگماں مجھ سے
تمام عمر کوئی مجھ کو آزماتا رہا

وہ سچے اور کھرے جذبوں کے شاعر ہیں۔ اگر کہیں انھوں نے مٹتی ہوئی اقدار پر ماتم کیا ہے تو کہیں ان اقدار کی آبیاری کے لیے مستقبل کے درخشاں خواب بھی بُنے ہیں۔ جذبات کی تیزی میں بہہ کر انھوں نے فکری توازن نہیں کھویا ہے۔ انھوں نے جو محسوس کیا اور جو ان کے مشاہدے میں آیا، اسے انھوں نے شعری جامہ پہنا دیا۔ اسی لیے ان کے اشعار میں جہاں ایک کسک معلوم ہوتی ہے وہیں احساس کی پاکیزگی بھی قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے:

میں گاؤں پہنچ کر بھی تھا محتاج تعارف
بستی میں کوئی شخص پرانا ہی نہیں تھا

—

غم تو یہ ہے کہ اس نے بٹھایا نہیں قریب
محفل سے اٹھ گئے تو پکارا نہیں ہمیں

ڈاکٹر تنویر احمد نے لکھا ہے: "نظمی ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے شاعری کو اپنا پیشہ نہیں پردۂ سخن بنایا اور اسی لیے ان کے یہاں ایک فن کار کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے لیے شعر کہے ہیں اور زندگی سے معاملہ کرنے میں انھیں جہاں جہاں اپنی کلاہ کج کرنی پڑی وہیں جیسے شعر ان کی ذہنی واردات کا آئینہ بن گیا ہے۔" مثلاً:

رفتار زمانہ نہیں، تنقید کے قابل
دنیا میں سبھی ساتھ زمانے کے نہیں ہیں

—

ڈھونڈوگے تو ہم ایسے صحیفوں میں ملیں گے
پڑھنے کے جو گھر میں سجانے کے نہیں ہیں

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ نظمی سکندرآبادی نے صرف

نظمی سکندرآبادی نے خالص تغزل کے اشعار پیش کرنے کے ساتھ ساتھ پیکر تراشی کے ایسے خدوخال کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے، جن کو اساتذۂ فن برتتے آئے ہیں۔ انھوں نے اپنی تخلیقی قوت سے کام لینے کی کوشش کی ہے۔ بعض جگہ مرکبات سے ایسی روشنی انعکاس ہو رہی ہے جو فصیل شب کی نارسیدہ تیرگی کو دور کرنے کی جانب گامزن نظر آتی ہے۔

ماضی کے دیاروں اور اُن کے آثار پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ موجودہ عہد کی جھلکیوں، موجودہ ماحول کی سانسوں اور موجودہ سماج کی سرگرمیوں پر بھی ان کی نظر رہی ہے۔ انھوں نے ان کے درد و کرب کو سمجھا ہے اور احساس کی لَو سے اسے روشنی اور تابناک بنانے کی سعی کی ہے۔ مزاج اور کردار کے حوالے سے بھی انھوں نے ان ادبی موشگافیوں کی نشان دہی کی ہے، جو درد و کرب اور احساس والم کی رو میں بہہ نہیں جاتے، بلکہ ان کے تدارک اور سدباب کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ درج ذیل اشعار میرے موقف کی تائید کریں گے:

پڑوسی نام سے واقف نہ شغل وشوق سے اپنے
عجب انداز سے ہم لوگ اپنے گھر میں رہتے ہیں

—

اپنی پہچان بھی کھو بیٹھے ہیں رفتہ رفتہ
جب بھی ساتھ زمانے کے چلے ہیں ہم لوگ

—

عسرت تو اندھیرے کو بسا لیتی ہے گھر میں
دولت کے بنا گھر میں اُجالا نہیں ہوتا

نظمی سکندرآبادی نے اپنی شاعری میں موضوع اور اسلوب سے زیادہ سروکار رکھا ہے۔ ان کے یہاں اگرچہ اجتہادی رویوں کا فقدان نظر آتا ہے، لیکن اشعار میں تاثیر کی اہمیت دامن دل کو اپنی جانب کھینچ ہی لیتی ہے۔ احساس کی ندرت ان کے اشعار کو ایک جداگانہ اسلوب عطا کرتی ہے، لیکن ڈرامائی عناصر کی تلاش بے سود نہ سہی کمیاب ضرور ہے۔ ان کی زیادہ تر توجہ شعری حسن اور فکری تسلسل پر مرکوز رہی ہے اور انھوں نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ وہ روایات شکنی کے منحرف قرار نہ دیے جائیں اور اشعار میں تازگی اور توانائی کا احساس باقی رہے۔ مثلاً ان کے یہ اشعار توجہ طلب ہیں:

واقعہ یہ ہے وہی خون کا پیاسا نکلا
جس کو سمجھا تھا کبھی اپنا مسیحا میں نے

—

اس درجہ سمجھتا ہے کسی شخص نے خود کو
محسوس یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں نہیں ہے

—

بہاریں جن سے عبارت تھیں باغ ہستی میں
وہ لوگ مجھ سے مری زندگی نے چھین لیے

نظمی سکندرآبادی نے خالص تغزل کے اشعار پیش کرنے کے ساتھ ساتھ پیکر تراشی کے ایسے خدوخال کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے، جن کو اساتذۂ فن برتتے آئے ہیں۔ انھوں نے اپنی تخلیقی قوت سے کام لینے کی کوشش کی ہے۔ بعض جگہ مرکبات سے ایسی روشنی انعکاس ہو رہی ہے جو فصیل شب کی نارسیدہ تیرگی کو دور کرنے کی جانب گامزن نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں جذبات و تجربات کے ایسے مرقع بھی نظر آئے جو اپنے اندر تشبیہات، استعارات اور تشکیلات کے کسی قدر نادر نمونے پیش کرتے ہیں:

اظہار تمنا پہ ادھر کان لگے ہیں
یاں حرف تمنا ہے کہ لب پر نہیں آتا

—

مزہ عہد محبت دے گیا ہے
اڑے چہرے کو رنگت دے گیا ہے

ان کے تین مجموعۂ کلام 'کربِ احساس'، 'حصارِ فکر' اور 'فروغِ نظر' منظر عام پر آچکے ہیں۔ غالب کلچرل سوسائٹی بنگلور سے غالب ایوارڈ، حلقۂ تشنگانِ ادب دہلی، انجمن تعمیر اردو دہلی بھی انھیں ایوارڈ پیش کر چکی ہے۔ اردو اکادمی دہلی نے بھی انھیں 'ایوارڈ برائے شاعری' سے سرفراز کیا ہے۔ انھوں نے غزلوں کے ساتھ منظومات، قطعات اور رباعیات سے بھی اردو ادب کو مالا مال کیا ہے۔ نگارخانۂ شاعری میں ان کے آثار و نقوش تادیر قائم رہیں گے، اس لیے کہ ان کی خدمات بیش از بیش نہ سہی بہرحال قابل قدر ضرور ہیں۔

■

Dr. Munawwar Hasan Kamal Baitur Razia, G-5/A, Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar
New Delhi - 110025

اسلم محمود کتابوں کا عاشق

ٹی آر رینا

اسلم محمود کا انتقال اس سال یکم مئی 2016 کو لکھنؤ کے ایک اسپتال میں ہوا۔ بارہ برس قبل انھیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور پچھلے سال انھیں پیس میکر لگایا گیا تھا۔ 30 مارچ 2016 کو پھر دوسرا اٹیک ہوا۔ انھیں اسپتال میں بھرتی کیا گیا۔ دو تین مرتبہ ان کے قویٰ اور جسمانی اجزا جواب دے چکے، دھیرے دھیرے گردے و پھیپھڑے جواب دے گئے، خود سے اٹھ نہیں سکتے تھے۔ آخر وہ شام آئی اور چار بجے اِن کی روح قفسِ عنصری سے بارگاہِ الٰہی کی طرف پرواز کرگئی۔ اس وقت ان کی عمر 75 برس کی تھی۔ دوسرے دن 2 مئی کو لکھنؤ کے نشاط گنج، پیپرمل قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ ان کے والدِ محترم بھی جنوری 2001 کے آخر میں اسی سرزمین لکھنؤ میں پیوندِ خاک ہوئے تھے۔

ان کے لواحقین میں ان کی بیگم، بیٹا، بہو اور ان کے بچے شامل ہیں۔ بیٹا اس وقت دہلی میں کسی بڑی فرم میں کام کرتا ہے۔ اسلم محمود صاحب ریلوے انتظامیہ کے اعلیٰ عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد مکمل طور پر لکھنؤ میں قیام پذیر ہوگئے۔

مہر الٰہی ندیم صاحب نے ایک رات اس منحوس خبر کی اطلاع فون پر دی۔ دل کو ایک دھچکا سا لگا اور ذہن بری طرح متاثر ہوا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ گذشتہ برس 31 جولائی 2015 کی نصف شب کے بعد بیگم صاحبہ مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہوکر سفرِ آخرت اختیار کرچکی تھیں اور میں ذہنی طور پر پہلے سے ہی بہت پریشان تھا۔

میرے مراسم مرحوم کے ساتھ 2006 سے چلے آرہے تھے۔ 26 فروری 2006 کو برصغیر ہند و پاک کے معروف محقق و مدون رشید حسن خاں صاحب کا انتقال ہوچکا تھا۔ میرے ذہن میں کسی غیبی طاقت نے یہ بات ڈال دی کہ مجھے مرحوم خاں صاحب کے خطوط، جو انھوں نے برصغیر کے مشاہیر ادب کے نام تحریر کیے ہیں انھیں جمع کرکے مرتب کرنا چاہیے۔ اس کارِ خیر کے لیے راقم نے ایک اشتہار ہفت روزہ 'ہماری زبان' دہلی کے لیے بھیج دیا۔ وہ ماہ مارچ کے ایک شمارے میں شائع ہوگیا۔ سب سے پہلے ڈاکٹر ممتاز احمد خاں (ریڈر شعبۂ اردو، مظفر پور یونیورسٹی، بہار) اور یعقوب میراں مجتہدی صاحب (مرتب: لغتِ مجتہدی انگریزی اردو، تین جلدوں میں) حیدر آباد نے بہ ذریعہ خط رابطہ قائم کیا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا اور اسی سال اسلم محمود صاحب سے بھی بہ ذریعہ فون اور خط سے رابطہ قائم ہوا۔

انھوں نے اپنے نام کے ستاون (57) خطوط کے عکس روانہ کیے، جو میری مرتب کردہ 'رشید حسن خاں کے خطوط' کی پہلی جلد کے صفحہ 184 تا 240 پہ محیط ہیں۔ اپنے خطوط کے عکس تو انھوں نے روانہ کیے ہی، اس کے علاوہ انھوں نے ہندستان، پاکستان، شکاگو اور نیویارک کے حضرات کے پتے اور ٹیلی فون نمبر بھی روانہ کیے، ساتھ ہی وہاں کے حضرات سے اس سلسلے میں خود بھی بات کی اور انھیں خطوط کے عکس بھیجنے کے لیے آمادہ کیا۔

شاعری کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ مجموعوں کے علاوہ انھوں نے چند بیاضیں بھی جمع کر رکھی تھیں، جن میں دوسری قسم کا کلام شامل تھا۔ دو تین بیاضیں میں نے بہ چشم خود دیکھیں۔ وہ انھیں کمپوز کروا کر چھاپنا چاہتے تھے، مگر ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ انھیں چھاپے گا کون؟

انھوں نے مجھے 'دیوانِ چرکین' کا ایک قدیم طبع شدہ نسخہ دکھایا جو تقریباً ڈیڑھ سو برس سے زیادہ پرانا تھا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ایک گورکھپوری نوجوان اسے مرتب کرکے شائع کرچکا ہے۔ پھر وہ نیا شائع شدہ نسخہ بھی دکھایا۔ میں نے ایک جلد کی خواہش ظاہر کی۔ کہنے لگے ایک ہی جلد میرے پاس ہے۔ آپ تک ضرور پہنچے گی۔ ایسا ہی ہوا وہاں سے آنے کے بعد ایک دن ڈاکیہ ایک پیکٹ دے گیا، کھولا تو اُس میں 'دیوانِ چرکن' تھا۔ چرکین کا پورا نام شیخ باقر علی چرکین رودولوی ثم لکھنوی درج ہے۔ مرتب کا نام ابرار الحق شاطر گورکھپوری ہے۔ سالِ اشاعت 2007۔ مطبع: گوتم آفسٹ پریس، قاضی کمپاؤنڈ، اسمٰعیل پور، گورکھپور ہے۔

اس نئے شائع شدہ 'دیوانِ چرکین' کے صفحات میں مرتب کی اُس تحریر کو دیکھا جاسکتا ہے جس میں اسلم صاحب کے فراہم کردہ نسخے، دوسری کتابوں اور ان کے ذاتی کتب خانے سے استفادے کا یوں ذکر کیا ہے:

''میرے ایک قریبی دوست نے میری توجہ کتابوں کے ایک دل دادہ جناب اسلم محمود (جو ریلوے انتظامیہ سے حال ہی میں سبک دوش ہونے کے بعد اندرا نگر لکھنؤ میں رہائش پذیر ہیں) کے ایک انوکھے مضمون کی جانب مبذول کرائی۔ یہ مضمون ماہنامہ 'نیا دور' لکھنؤ کے اودھ نمبر (حصہ دوم) کے اکتوبر، نومبر 1994 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اسلم محمود صاحب کے مضمون 'اودھ اور اطراف کی چند انوکھی اردو مطبوعات' کا میں نے مطالعہ کیا جس میں چرکین کے قدیم مطبوعہ دیوان کا مختصر مگر معتبر ذکر تھا۔

موصوف نے اپنے مضمون میں سولہ نایاب و نادر اردو کتابوں کا ذکر کیا تھا جس میں ایک 'دیوانِ چرکین' کا نسخہ بھی شامل تھا جو 1273ھ/ 57-1856 کا طبع شدہ تھا۔ یہ بھی علم ہوا کہ ساری کتابیں اسلم محمود صاحب کے ذاتی ذخیرۂ کتب کی زینت ہیں اور انھیں ان کی رضامندی سے دیکھا بھی جاسکتا ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے ایک عزیز مقیم لکھنؤ کے ذریعے اسلم محمود صاحب کا ٹیلی فون نمبر حاصل کرکے انھیں اپنے ارادے سے مطلع کیا۔ موصوف میرے مقصد کو جان کر بہت خوش ہوئے اور فوراً مجھے ہر طرح کا تعاون دینے کے لیے راضی ہوگئے۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے مجھے یہ بھی تنبیہ کی کہ اردو والے جب یہ سنیں گے کہ آپ چرکین جیسے 'بے آبرو' شاعر پر کام کرنا چاہتے ہیں تو زیادہ تر لوگ آپ کی ہمت پست کریں گے مگر بہتر ہوگا کہ ایسے لوگوں کو نظر انداز کردیا جائے۔ میں نے ان کے گراں قدر مشوروں کو ذہن نشین کرلیا۔ چند ہفتوں بعد اسلم محمود صاحب سے چرکین اور کلامِ چرکین پر مفید مواد حاصل ہوا جس کی وجہ سے میرا کام پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا۔ (ص 21)...... مزید کرم فرماتے ہوئے اسلم محمود صاحب نے ملک کی بہت سی لائبریریوں کے پتے اس ہدایت کے ساتھ عنایت کیے کہ میں اُن سے خود رابطہ قائم کرکے چرکین کے دیوان کے مختلف ایڈیشن حاصل کروں...

ہاں اسلم محمود صاحب برابر ٹیلی فون اور خطوط کے ذریعے میری رہنمائی فرماتے رہے اور مناسب ہدایات سے بھی نوازتے رہے۔ نیز میرے کام کی پیش رفت کے بارے میں بھی اکثر و بیشتر دریافت کرتے رہے۔'' (ص 22-21)

اسلم محمود نے اپنے ذخیرۂ کتب سے 'دیوانِ چرکین' (مطبوعہ) کا وہ نسخہ شاطر کو مہیا کروایا جس کے مرتب سید مقصود عالم مقصود رضوی پہانوی تھے۔ یہ وہی نسخہ (1273ھ/ 57-1856) ہے جس کا ذکر اوپر کے اقتباس میں آیا ہے۔ شاطر کی تحقیق کے مطابق شاید یہی نسخہ اول ہے، ملاحظہ فرمائیں درج ذیل اقتباس:

''چرکین کے استاد بھائی مقصود تھے کیونکہ دونوں نواب عاشور علی خان بہادر کے شاگرد تھے۔ مقصود نے اپنے استاد بھائی ہونے کا حق یوں ادا کیا کہ چرکین کا کلام اکٹھا کرکے شائع کروایا۔ جس قدر چرکین کے دواوین مجھے اب تک دستیاب ہوئے ہیں اُن میں سب سے زیادہ کلام اسی مطبوعہ دیوان میں ہے۔ اس سے پہلے کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوسکا جتنے بھی بعد کے قلمی یا مطبوعہ نسخے حاصل ہوئے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب کے سب اسی مطبوعہ دیوان پر مبنی ہیں۔ قیاس ہے کہ یہ دیوان چرکین کا پہلا ایڈیشن ہے۔ یہ بھی گمان ہے کہ مقصود ایسا ذہین استاد بھائی اگر چرکین کو نہ ملتا تو شاید چرکین کا جو کچھ کلام آج ہم تک پہنچا ہے وہ تلف ہوگیا ہوتا یا گم نامی کے غار میں پڑا ہوتا۔

متذکرہ دیوانِ چرکین حوض اور حاشیے میں بیالیس صفحات پر چھپا ہے جس کی کتابت چیت رام نے کی ہے۔ نسخے پر نہ تو ناشر کا اور نہ مطبع کا نام ہے ہاں مقامِ اشاعت لکھنؤ ضرور درج ہے۔'' (ص 23)

شاطر مزید لکھتے ہیں:

''اس کا ایک نسخہ خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ اور دوسری کاپی اسلم محمود صاحب کے ذخیرۂ کتب، لکھنؤ میں ہے۔ اس میں پرانے املے کا استعمال کیا ہے۔'' (ص 23)

اسلم محمود صاحب کی ہی عنایت سے شاطر صاحب کو ایک اور 'دیوانِ چرکین مطبوعہ' جو ان کے دوست نیر مسعود صاحب کے کتب خانہ لکھنؤ میں موجود ہے دیکھنا نصیب ہوا۔ اس کے سرورق پر صرف دیوان چرکین چھپا ہے۔ اس میں مرتب کا نام، ناشر اور مقام اشاعت درج نہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے شاطر کو ایک اور قلمی نسخے کا عکس مہیا کیا جو انھوں نے مسلم بن عقیل صاحب رودولی، ضلع بارہ بنکی سے 20 مئی 2004 کو لکھنؤ میں حاصل کیا تھا۔ عقیل صاحب اپنے کو چرکین کے خاندان سے بتاتے ہیں۔

شاطر نے اسلم محمود صاحب کے کتب خانے میں موجود ایسے نسخے کا ذکر کیا ہے جس کے بغیر 'دیوانِ چرکین' مکمل نہیں ہوسکتا تھا۔ شاطر صاحب کی تحریر ملاحظہ فرمائیں:

''اسلم محمود صاحب کے ذخیرۂ کتب میں سید امیر علی نیاز کا 'دیوانِ نیاز' بھی موجود ہے جو مطبع محمدی، دہلی سے 1286ھ یعنی 1869 میں شائع ہوا تھا۔ اس کے آخری پانچ صفحات پر 'چرکین نامہ' شائع ہوا ہے۔ اس میں پندرہ ہزلیں ہیں۔ یوں تو تیرہ ہزلیں وہی ہیں جو 1273ھ کے مطبوعہ نسخے میں بھی موجود ہیں لیکن دو ہزلیں ایسی ہیں جو کسی اور نسخے میں موجود نہیں ہیں۔ یہ دونوں زائد ہزلیں موجودہ متن میں شامل کرلی گئی ہیں۔'' (ص 26)

ان اقتباسات کو پیش کرنے کا ہمارا مقصد یہ ہے کہ جس شاعر کو فحش نگار اور بے آبرو کہہ کر نظر انداز کردیا گیا تھا۔ اس کے کلام کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخوں کو اسلم محمود صاحب نے اپنے کتب خانے میں محفوظ کر رکھا تھا۔ اگر انھوں نے ایسا نہ کیا ہوتا تو 'دیوان چرکین' موجودہ دور میں مرتب ہوکر کبھی منظرِ عام پر نہ آتا۔

باتوں باتوں میں اسلم محمود صاحب نے بتایا کہ ان بیاضوں میں ایک دو رشید حسن خاں صاحب مرحوم کی مع منتشر کلام بھیجی ہوئی ہیں۔

اسلم محمود کے رشید حسن خاں مرحوم سے تعلقات کب سے تھے میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ شاید میں نے ان سے پوچھا یا نہیں، یاد نہیں۔ ہاں مرحوم خاں صاحب کے ستاون خطوط میں پہلا اور آخری خط اسلم محمود کے نام 17 اکتوبر 1992، ٹی سی 8، گائر ہال، دہلی یونیورسٹی دہلی 110007 اور 15 اگست 2004 شاہ جہاں پور کا تحریر کردہ ہے۔

خاں صاحب اپنے پہلے مکتوب میں اسلم محمود صاحب کے کتب خانے کا ان الفاظ میں ذکر کرتے ہیں:

''آپ کے ذخیرے کی فہرست عنوانات دیکھ کر آنکھوں کی روشنی بڑھ سی گئی۔ آفریں ہے آپ کی ہمت پر اور مرحبا کہتا ہوں آپ کی خوش ذوقی اور تنوع پسندی پر۔ اب جب بھی اُدھر کا پھیرا ہوا، اس ذخیرے کو ضرور اپنی آنکھوں سے دیکھوں گا۔ ہاں 'مطائبات' کا ذخیرہ بھی آپ کے پاس ہے اور بہت، اس سے متعلق کئی بار سن چکا ہوں۔ اسے بہ طور خاص دیکھوں گا۔ کلکتے سے ایک انتخابی مجموعہ گلدستۂ نشاط شائع ہوا تھا، نستعلیق ٹائپ میں، اس کے آخر میں ایک مختصر سا حصہ 'ہزلیات' کا بھی ہے، کیا وہ آپ کی نظر سے گزرا ہے؟ میرے پاس اس حصے کی نقل ہے۔ شان الحق حقی صاحب سے آپ خوب واقف ہوں گے، وہ دوسرے انداز کی شاعری بھی کرتے ہیں اور بعض اوقات مزے کے شعر کہہ جاتے ہیں۔ کیا ان کا کچھ کلام آپ کے پاس [ہے]۔ مجھے انھوں نے ایک چھوٹی سی نوٹ بک اپنے ہاتھ سے لکھ کر دی تھی جو ایسے ہی کلام پر مشتمل ہے۔ اگر آپ کے پاس ان کی شاعری کا یہ نمونہ نہ ہو تو میں اُسے بھیج دوں، اس طرح محفوظ بھی ہوجائے گا۔'' (رشید حسن خاں کے خطوط، ص 184)

اسی بات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے اسلم صاحب کو لکھتے ہیں:

''مطلوبہ چیزیں بھیج رہا ہوں۔ گلدستۂ نشاط کی نقل ایک صاحب سے تیار کرائی تھی، تعارفی نوٹ مختصر سا میں نے لکھا تھا، ہزلیات کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسے اور میر حسن کے واسوختوں کو میں نے محفوظ کرلیا تھا۔ وہ پورا حصہ بھیج رہا ہوں۔ اسے واپس کرنے کی ضرورت نہیں۔

حقی صاحب کی بیاض بھی ملفوف ہے، اسے البتہ

واپس کر دیجیے گا۔'' (ص 185)

دو سطر اوپر میر حسن کا ذکر آیا ہے جس سے راقم کی بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ ہر دور کے اچھے اچھے شعرا نے ایسا کلام کہا ہے۔ اسلم صاحب نے حقی صاحب کی بیاض کی نقل اتارنے کے بعد اسے واپس بھیج دیا۔ 14 فروری 1993 کو پیکٹ رشید حسن خاں صاحب کو ملتا ہے۔ 15 فروری 1993 کو وہ پھر اسلم محمود کو لکھتے ہیں:

''کل پارسل مل گیا، شکر گزار ہوں۔ میری نظر میں اس زمانے میں اعلیٰ درجے کے فحش نگار محشر عنایتی مرحوم تھے، رام پور کے۔ میری رائے میں تو بعض اعتبارات سے وہ رفیع احمد خاں مرحوم سے بھی آگے تھے۔ میں نے ان کا کلام مختلف لوگوں سے سنا ہے، مگر ایسے کسی شخص کو نہیں جانتا جس کے پاس وہ ذخیرہ ہو۔ آپ رام پور میں کسی معتبر شخص سے دریافت کیجیے۔

ایک صاحب نے، جن کا نام اب یاد نہیں، مجھے ایک بار اُن کی ایک غزل سنائی تھی، 'مرصع' تھی۔ ایک شعر تو ایسا تھا کہ پورے فارسی ادب میں اُس کا جواب نہیں ملے گا، قدِ محبوب کی ایسی تشبیہ کہیں دیکھی ہی نہیں۔ وہ شعر مجھے یاد ہے:

شاعر ثنائے قامتِ دلدار کے لیے

....

اور اس کا مقطع تو ایسا استادانہ ہے کہ کسی بھی بڑے استاد کو اس پر رشک آسکتا ہے۔ قافیہ ہے: نظر، منظر۔ اس میں 'محشر' کا قافیہ سامنے کا ہے، شاعر نہیں کہے گا تو کوئی دوسرا کہہ دے گا۔ مگر شاعر کیسے کہے، ردیف مانع ہے، مگر مرحوم نے کہا ہے اور اس طرح، مقولۂ غیر بنا کر:

....

....

(ص 186)

مسئلہ یہاں فحش کلام کا نہیں، دیکھنا یہ ہے کہ کہنے والا کیسی استادانہ مہارت رکھتا ہے۔ بحر و وزن، قافیہ و ردیف کے علاوہ عروضی پابندیوں کا لازمی دھیان رکھا جاتا ہے۔ غزلیہ شاعری کے سبھی لوازمات ایسے شعرا حضرات کے کلام میں ہمیں نظر آتے ہیں۔

موجودہ دور کی اردو دنیا اسلم محمود صاحب سے پوری طرح متعارف نہیں تھی، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ریلوے کے محکمے میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ انھوں نے شاید کسی ادبی سمینار یا اجتماع میں حصہ نہیں لیا، نہ ہی کسی نے ان کے ذخیرۂ کتب پر کبھی کوئی مضمون شائع کیا ہو۔ ہاں انفرادی طور پر کتابیں جمع کرنے کا ان کا شوق (جیسا کہ اس سے قبل ذکر آچکا ہے) جنون کی حد تک تھا۔ ان کے شوق کے ایک اور پہلو سے متعلق جو جان کاری میں آپ حضرات کو دینے جا رہا ہوں، اسے سن کر آپ انھیں داد و تحسین دیے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ ان کے ذخیرۂ کتب میں صرف 'خطاطی' پر دو سو پچاس کتابیں موجود ہیں، جو انھوں نے برصغیر ہند و پاک، ایران، عرب اور بیرونی ممالک سے حاصل کی تھیں۔ برصغیر ہند و پاک کے تحقیقی کام کرنے والے جن حضرات کو ان کے کتب خانے کا علم ہوا، انھوں نے ان سے رابطہ قائم کیا اور انھوں نے ہر طرح سے ان کی مدد کی۔

ایک اصول کی انھوں نے زندگی بھر سختی سے پابندی کی۔ ایک بار جو کتاب ان کے ذخیرے میں شامل ہوگئی وہ اسے نہ تو اپنے سے جدا کرتے تھے اور نہ ہی کسی کو مستعار دیتے تھے۔ وہ اس کا عکس بنوا دیتے یا وہ شخص ان کے کتب خانے میں آکر اس سے استفادہ کر سکتا تھا۔ ہاں، البتہ رشید حسن خاں صاحب اس سے مستثنیٰ تھے، ان کا بھی یہ اصول تھا کہ جس سے کوئی کتاب منگواتے، کام مکمل ہونے کے فوراً بعد بہ حفاظت کتاب لوٹا دیتے تھے۔

اسلم محمود کی فرمائش پر رشید حسن خاں صاحب نے زٹل نامہ، جعفر زٹلی اور مصطلحاتِ ٹھگی علی اکبر الٰہ آبادی جیسی کتابیں مرتب کیں۔ اسلم صاحب نے ان نسخوں کے عکس ہی مہیا نہیں کرائے بلکہ ان سے متعلق بہت سا مواد بھی بہم پہنچایا۔ خاں صاحب کے اصرار پر انھوں نے مصطلحات ٹھگی کی ببلوگرافی مرتب کی جو پانچ صفحات پر مشتمل ہے، جن میں چار صفحات انگریزی کتب اور آرٹیکل اور ایک صفحہ اردو اور فارسی کتب سے متعلق ہے۔ کتاب کے آخر میں یہ صفحہ 245 تا 249 پر محیط ہے۔

پروفیسر نیر مسعود بھی اسلم صاحب سے قبل 'امراؤ جان ادا' مرتب کرنے کی فرمائش کر چکے تھے۔ اسلم صاحب نے اس کے چند نسخے بھی بہم پہنچائے تھے، مگر تلاش کے باوجود خاں صاحب کو اس کی اشاعتِ اول کا نسخہ نہیں مل سکا اور وہ اسے اس کے بغیر مرتب کرنا نہیں چاہتے تھے، لہٰذا یہ کام دھرا کا دھرا رہ گیا۔

مثنوی گلزارِ نسیم، انشائے غالب، مثنویاتِ نواب، مرزا شوق لکھنوی (فریب عشق، بہار عشق، زہر عشق)، مثنوی سحرالبیان، کلاسیکی ادب کی فرہنگ اور گنجینۂ معنی کا طلسم جیسی اہم کتابیں رشید حسن خاں صاحب نے مرتب کیں، ان سب میں کسی نہ کسی حد تک اسلم صاحب کے مواد اور مشوروں کا دخل رہا ہے۔

22 تا 27 نومبر 2013 کو میں پرنسپل ڈاکٹر جوگ راج (اردو ریسرچ اینڈ ٹریننگ سنٹر سولن، ہماچل پردیش اور لکھنؤ یوپی) کی دعوت پر لکھنؤ پہنچا۔ وہاں اردو مرکز میں چھ دنوں کے لیے اردو زبان سے متعلق ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اس میں پروفیسر غضنفر (جامعہ اردو دہلی) جو پہلے یہاں پرنسپل رہ چکے ہیں وہ بھی مع بیگم شامل ہوئے۔ پروفیسر کول جو یہاں جوگ راج صاحب سے پہلے پرنسپل تھے (اب دہلی میں قیام پذیر ہیں) وہ بھی حاضر ہوئے۔ یوپی اردو اکادمی کے ماز اختر اور محسن خاں، ڈاکٹر ملکہ خورشید، ڈاکٹر منصور حسن خاں، ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی (جوش ملیح آبادی کے بہن کے نواسے)، عمران انوروی، پاٹھک صاحب کے علاوہ شہر کے نامور شعرا اور افسانہ نویس، لکھنؤ ہی میں ایک تبلیغ اسلام نام کا ادارہ ہے اس کے سربراہ بھی شامل ہوئے۔

دوسرے دن 24 نومبر 2013 کو محفلِ افسانہ منعقد ہوئی۔

شام کے وقت میں ڈاکٹر دینکر کے ساتھ بائیک پر اسلم محمود صاحب کے گھر اندرا نگر A-885 پہنچا۔ بل بجائی وہ باہر گیٹ پر آئے۔ مجھے اچانک وہاں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ مجھے گلے لگایا اور اندر لے آئے ڈرائنگ روم میں۔ حال چال پوچھا، آنے کی وجہ پوچھی۔ تھوڑی دیر کے بعد چائے آگئی، ہم سب نے اکٹھا چائے پی۔ بیٹے اور بہو سے ملوایا۔ سب کے ساتھ تصویریں کھینچی گئیں۔ قریب ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہم واپس ہوئے کیوں کہ ڈاکٹر دینکر مجھے اردو مرکز چھوڑ کر گھر جانے والا تھا۔ یہ ہماری دوسری اور آخری ملاقات تھی۔

بہت سے مضامین میں نومبر 2014 سے پہلے جمع کر چکا تھا۔ بیگم کی اس جہاں سے رخصتی کے بعد میں خاموش سا ہوگیا، گھر میں صرف ایک بچی ہے، چار کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ چھ ماہ کے بعد ایک دن سبھی بیٹیاں جمع ہوئیں اور کہا: پاپا ایسا کب تک چلے گا، آپ اپنی توجہ لکھنے پڑھنے کی طرف مبذول کریں، خاموشی آپ کے لیے خطرناک ہے۔

کتابوں کا عاشق ہی نہیں مجنوں (اسلم محمود) اپنی لیلیٰ (لائبریری) کو ابدی زندگی بخش کر کیم مئی 2016 کو اس جہانِ فانی (کے شہر لکھنؤ) سے رخصت ہو کر 2 مئی 2016 سے لکھنؤ کے نشاط گنج، پیر پل کے شہر خاموشاں میں ابدی نیند سو رہا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون!

■

Dr. T.R. Raina, F-237, Lawer Hari Singh Nagar
Rehari Colony, Jammu - 180005 (J&K)
Mob.:09419828542
E-mail.: trrainaraina@yahoo.com

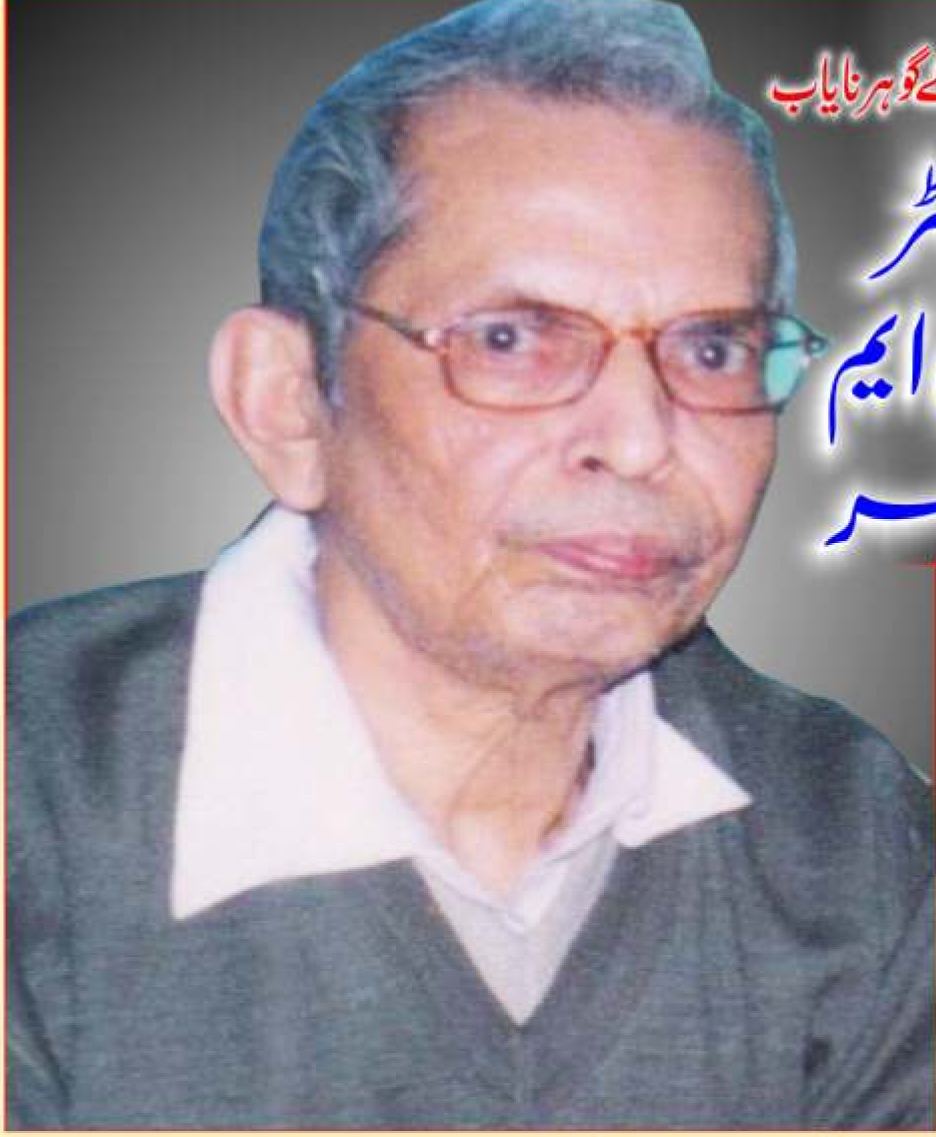

میدان رپورتاژ نگاری کے گوہر نایاب

عبدالقادر شمس

ڈاکٹر ایس ایم گوہر

ڈاکٹر ایس ایم زیڈ گوہر کچھ ہی عرصہ قبل طویل علالت کے بعد اس دارفانی سے جہان جاودانی کو کوچ کر گئے لیکن علم وتحقیق کے اس گوہر نایاب نے رپورتاژ نگاری کے فن اوراس کے ارتقا پر ایسی بیش بہا علمی خدمت انجام دی ہے جسے ہرگز فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ راقم الحروف نے ڈاکٹر ایس ایم گوہر کو نہ قریب سے دیکھا اور نہ ان کے فکروفن سے راست کسب فیض نصیب ہوا تاہم جو کچھ سنا ہے اس کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنے فن کے امام تھے۔

ڈاکٹر ایس ایم گوہر اردوزبان وادب کے ان قلمکاروں میں سے تھے، انگریزی ادب پر جن کی گہری نگاہ تھی، چنانچہ موصوف نے نہ صرف انگریزی ادب سے راست کسب فیض کیا بلکہ ان کی تحریروں میں انگریزی ادب وفلسفے کا عکس پایا جاتا ہے، یہی نہیں انھوں نے انگریزی گرامر پر کتاب بھی تصنیف کی ہے۔ ڈاکٹر ایس ایم گوہر کی نگاہ شعری افق پر بھی تھی اور وہ ایک منجھے ہوئے نثر نگار بھی تھے، ان کی علم وتحقیق کی روشنی کئی جہات کو پھیلی ہوئی تھی لیکن رپورتاژ کے فن کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے انھوں نے جس وقت نظری اور ژرف بینی کا ثبوت دیا ہے وہ انھیں اس میدان میں نمایاں کردیتا ہے۔

ڈاکٹر ایس ایم گوھر اردوزبان وادب کے ان قلمکاروں میں سے تھے, انگریزی ادب پر جن کی گھری نگاہ تھی, چنانچہ موصو ف نے نہ صرف انگریزی ادب سے راست کسب فیض کیابلکہ ان کی تحریروں میں انگریزی ادب وفلسفے کاعکس پایاجاتاھے, یھی نھیں انھوں نے انگریزی گرامر پر کتاب بھی تصنیف کی ھے۔ڈاکٹر ایس ایم گوھر کی نگاہ شعری افق پر بھی تھی اوروہ ایک منجھے ھوئے نثرنگار بھی تھے,ان کی علم وتحقیق کی روشنی کئی جھات کو پھیلی ھوئی تھی لیکن رپورتاژکے فن کامطالعہ پیش کرتے ھوئے انھوں‌نے جس دقت نظری اور ژرف بینی کاثبوت دیاھے وہ انھیں ا س میدان میں نمایاں کردیتاھے۔

انھوں نے جب رپورتاژ نگاری کے فنی رموز پر کام کرنا شروع کیا تو اس فن اور متعلقہ ادب کے جملہ علمی اثاثے کو کھنگال ڈالا، اس کے بعد ان کا تاثر ہے کہ اس صنف کی خدمت ہرگز نہیں ہوئی ہے۔ وہ اپنی کتاب 'اردو میں رپورتاژ نگاری فن اور ارتقا' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ ''میرے تحقیقی عمل کے آغاز میں ہی عبدالعزیز صاحب کی کتاب 'اردو میں رپورتاژ نگاری' شائع ہوئی، اس کے مطالعے سے یہ انکشاف ہوا کہ انھوں نے بھی رپورتاژ پر اپنے سرسری تعارفی مضمون کے ساتھ محض چند معروف وغیر معروف رپورتاژوں کو یکجا کر کے کتابی شکل دے دی ہے۔ اس مجموعے میں شامل رپورتاژ تاریخی اہمیت تو رکھتے ہیں فنی طور پر ان کی کوئی امتیازی حیثیت میرے نزدیک نہیں ہے۔''

دراصل کسی بھی موضوع کی گہرائی تک جانے والے ایس ایم گوہر نے رپورتاژ نگاری کے فن اور اس کے گہرپاروں کی تلاش میں پوری گہرائی تک مطالعہ کیا تھا جس کے بعد ان کا تاثر تھا کہ اس صنف پر کام کی شدید ضرورت ہے، چنانچہ راقم الحروف موصوف کی اس باب میں جو کوششیں ہیں انھیں دیکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس میدان کے ایسے مرد ہیں جن کی علمی گیرائی بے کراں ہے، واقعی ان کا شمار اس میدان میں ایک اتھارٹی کی حیثیت سے کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس فن کا بصیرت افروز تعارف کس طرح پیش کرتے ہیں اس کا اندازہ ان کے اس اقتباس سے ہوسکتا ہے۔

''چونکہ رپورتاژ کی صنف افسانوی بصیرت اور تاریخی شعور رکھتی ہے، اس لیے فطری طور پر اس کے

اسلوب کی کشش انگیزی اور معنویت بڑھ جاتی ہے۔ اگرچہ یہاں واقعات کا استنادی پہلو نمایاں رہتا ہے اور حقائق کی پیش کش ہی کو اہمیت حاصل ہوتی ہے، اس کے باوجود اسلوب تحریر خشک اور بے کیف نہیں ہوتا۔ کیونکہ رپورتاژ نگار کی ذاتی اور داخلی کیفیتیں اس کے حسن واثر کو بڑھا دیتی ہیں۔ وہ چشم دید واقعات کا محض منشی اور محرر نہیں ہوتا بلکہ اپنی تخلیقی قوت اور فنی بصیرت سے انہیں ایسی روشنی بخشتا ہے جو ان واقعوں کی تابنا کی وتوانائی کو زیادہ توجہ طلب اور دیرپا بنا دیتی ہے۔ اس کے پیش نظر تاریخ ہوتی ہے، تاریخ سے وابستہ غیر معمولی واقعات وسانحات بھی ہوتے ہیں اور ان واقعوں کے پس منظر میں موجزن جذبہ واحساس بھی۔ وہ ان تمام عناصر کو ایسے امتزاجی رنگ میں پیش کرتا ہے کہ رپورتاژ کی اسلوبی قوت پائدار اور ادبی قدروں کی مظہر بن جاتی ہے۔ اس فنی نوعیت کے رپورتاژ اردو میں کم لکھے گئے ہیں۔"

ڈاکٹر ایس ایم گوہر نے ہندوپاک کے رپورتاژ نگاروں اور اس فن کے نقادوں کی زیادہ تر تحریروں کا مطالعہ کیا ہے، قرۃ العین حیدر، قمر رئیس اور گوپی چند نارنگ جیسی اردو ادب کی نابغہ روزگار شخصیتوں سے تحریری مکالمہ ومذاکرہ کیا جس کے نتیجے میں وہ کہتے ہیں کہ اس فن کو کہیں صحافت بنا دیا گیا ہے تو کہیں ادب پارہ، جب کہ رپورتاژ نگاری ادب وصحافت سے ماورا ایسا فن ہے جس کے اندر صحافت کی چاشنی بھی ہے اور ادب کی گہرائی بھی، یہ ایسا فن ہے جو ادب وصحافت کے در وبست سے نکل کر اپنے اندر ایک نئی چمک دمک لے کر سامنے آتا ہے جو قارئین کو اپنے گرد جمع کر لیتی ہے۔

ڈاکٹر ایس ایم گوہر اردو زبان وادب کے معروف قلم کار ہیں، وہ نثری ادب کے افق کا طواف کرتے ہوئے اس مقام تک جا پہنچتے ہیں جہاں ہر کس وناکس کی رسائی نہیں ہو پاتی، وہ معنویت اور مقصدیت کے قائل ہیں چنانچہ ان کی تحریروں میں کہیں سے سطحیت کی بو نہیں آتی، وہ لفظیات ومترادفات پر قدرت رکھتے ہیں لیکن ایسی زبان لکھتے ہیں جو کسی کو غیر ضروری طور پر مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کرتی، صاف ستھری اور علم وادب کے شفاف سمندر میں نہائی ہوئی تحریریں ان کی فکری بلندی کی کہانی سناتی ہیں۔

بلاشبہ ڈاکٹر ایس ایم گوہر اپنے عہد کے ممتاز ناقد، بلند قامت انشاء پرداز اور رپورتاژ نگاری کے میدان میں امتیازی خصوصیت کے حامل تھے، مجھے حیرانی ہے کہ علم وادب کے اس کوہ گراں کو وہ شہرت کیوں نہیں ملی جس کے

سوانحی کوائف

نام: سید محمد زبیر گوہر

قلمی نام: سرتاج گوہر

تعلیم: ایم اے، پی ایچ ڈی

مادر علمی: سی ایم کالج دربھنگہ، بہار یونیورسٹی مظفر پور

عملی زندگی: ملازمت منسٹری آف فائنانس ممبئی

تصنیف: اردو میں رپورتاژ نگاری فن اور ارتقا

غیر مطبوعہ تالیف: مثلث (افسانوی مجموعہ)، انگریزی گرامر کی دو کتابیں

تالیفی منصوبے: 'روحی' (ناول جسے مکمل کرنا چاہتے تھے)

پیدائش: 15 جنوری 1939

وفات: 24 مارچ 2016 مظفر پور

وطن: بشارت کو نج، دھرم پور، سمستی پور

وہ مستحق تھے، اندازہ ہوا کہ شہرت بھی انھیں کو میسر ہوتی ہے جن کے پیچھے شاگردوں کا ہجوم ہوتا ہے یا میڈیائی وسائل کارفرما ہوتے ہیں، ورنہ بہت سے رجال کار حاشیائی بستیوں میں گمنامی کی زندگی گذار کر چلے گئے اور ان کی علمی فتوحات کا اعتراف نہ کیا جاسکا۔ ریاست بہار کے مظفر پور شہر کے محلہ کمرہ میں زندگی بسر کرنے والے ڈاکٹر ایس ایم گوہر کو نہ اہل بہار نے کبھی لائق اعتنا سمجھا اور نہ وہاں کے ان باکمال فرزندوں نے جو ملک بھر کے دائرہ ادبستان میں چھائے ہوئے ہیں۔ کچھ دنوں سے مشہور نقاد وافسانہ نگار مشتاق احمد نوری کی قیادت میں بہار اردو اکیڈمی نے گمنام ادیبوں وفنکاروں کو ڈھونڈنے کی سعی بلیغ ضرور کی ہے لیکن نہ جانے کیوں ان کی بھی نگاہ ڈاکٹر ایس ایم گوہر تک نہیں پہنچ پائی۔

ڈاکٹر ایس ایم گوہر تقریباً ایک دہائی سے زائد عرصے تک ممبئی میں رہے اور وہاں فائنانس منسٹری میں ملازمت کے دوران بھی اپنی علمی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ان کا قلمی نام سرتاج گوہر تھا، وہ ممبئی کے کئی اخبارات میں 'آنکھیں جو دیکھتی ہیں' کے نام سے کالم لکھتے رہے اور اپنے کالم میں واقعات سے نتائج اخذ کرتے جو نصیحت بن کر قارئین کے ذہن ودماغ کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ ان کا کالم بے حد پسند کیا جاتا تھا، انھوں نے اسی دوران بہت سے افسانے بھی تحریر کیے، 'آرٹسٹ اور 'مثلث' ان کے مقبول افسانوں میں شمار کیے جاسکتے ہیں جبکہ 'وہ اور یہ' اور 'چور' جیسے افسانوں نے تو کافی دھوم مچایا۔ انھوں نے ممبئی میں علم وادب کے شیدائیوں کا اپنا ایک حلقہ بنا رکھا تھا جن کے مابین وہ کسی بھی موضوع پر سیر حاصل گفتگو کرتے اور لوگوں سے رائے بھی لیتے تھے۔

ڈاکٹر گوہر کو مطالعہ کا بے حد شوق تھا، چنانچہ ان کے سرہانے ہمیشہ کتابیں ہوا کرتی تھیں، اس سے بھی زیادہ ان کا شوق نئی نسل کو تعلیم سے آراستہ کرنا تھا، اس کے لیے وہ بہتر استاذ ثابت ہوئے۔ بہار کے سمستی پور میں قیام کے دوران انھوں نے سیکڑوں بچوں کو علم وخرد سے آراستہ کیا اور طلبہ کی ایک بڑی تعداد کو انھوں نے درسیات کے ماسوا کتابوں کے مطالعہ کا ذوق عطا کیا۔ انھیں طلبہ سے کافی ہمدردی تھی شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے شاگردوں کی بڑی تعداد جو بڑے عہدوں پر فائز ہے، انھیں ہمیشہ یاد کرتی رہی۔ ڈاکٹر گوہر کے تحقیقی وتصنیفی منصوبوں کی ایک طویل فہرست تھی لیکن زندگی کے ایک طویل عرصے تک وہ فالج کی وجہ سے صاحب فراش رہے اور کچھ کام ادھورے

ایس ایم گوھر اپنے عھدکے ممتاز ناقد, بلندقامت انشاء پرداز اور رپورتاژنگاری کے میدان میں امتیازی خصوصیت کے حامل تھے. مجھے حیرانی ھے کہ علم وادب کے اس کوہ گراں کو وہ شھرت کیوں نھیں ملی جس کے وہ مستحق تھے. اندازہ ھواکہ شھرت بھی انھیں کو میسر ھوتی ھے جن کے پیچھے شاگردوں کاھجوم ھوتاھے یامیڈیائی وسائل کارفرماھوتے ھیں. ورنہ بھت سے رجال کار حاشیائی بستیوں میں گمنامی کی زندگی گذارکرچلے گئے اور ان کی علمی فتوحات کا اعتراف نہ کیاجاسکا.

رہے تو کچھ شروع ہی نہ ہو سکے اور 24 مارچ 2016 کو اپنے رب حقیقی سے جا ملے۔ ان کی ادبی وراثت کے امین خاور حسین روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' سے وابستہ ہیں اور ان کا شمار نئی نسل کے معروف صحافیوں میں ہوتا ہے۔ ان کے کئی افسانچے ملک کے موقر رسائل و اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔

■

Dr. Abdul Qadir Shams H.No.: 19/1, Top Floor, O-Block, Batla House, Jamia Nagar, New Delhi - 110025

ترکی میں پہلی بین الاقوامی اردو ادب کانگریس بیاد احمد ندیم قاسمی

انتالیہ/ترکی (13 اکتوبر 2016) ترکی کے دارالسلطنت انقرہ میں واقع انقرہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے زیر اہتمام یونیورسٹی کے انتالیہ مرکز کے ہوٹل Orsem میں معروف شاعر و افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کی صد سالہ یوم پیدائش کے موقعے پر پہلی بین الاقوامی اردو ادب کانگریس کا افتتاح کرتے ہوئے مہمانِ خصوصی محترمہ ناہید قاسمی (احمد ندیم قاسمی کی بڑی صاحب زادی) نے کہا ''مجھے وہ آج بے حد و حساب یاد آ رہے ہیں وہ ایک بڑے شاعر، افسانہ نگار، کالم نویس اور اعلیٰ پائے کے مدیر تو تھے ہی لیکن ایک بہترین انسان اور شفیق و بہترین باپ بھی تھے۔'' محترمہ ناہید قاسمی نے اس موقعے پر اپنے والد احمد ندیم قاسمی کے بعض ذاتی واقعات سنائے اور ان کی ادبی نگارشات پر کھل کر گفتگو کی۔

پہلی بین الاقوامی اردو ادب کانگریس کی روح رواں صدر شعبہ اردو انقرہ یونیورسٹی پروفیسر آسماں بیلن آزگن نے استقبالیہ خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ تقریباً نو مہینے کی محنت رنگ لائی اور آج یہ یادگار تاریخ ساز کانفرنس منعقد ہوئی۔ گذشتہ 15 جولائی کو ترکی کے سیاسی حالات کی تبدیلی نے ہمیں خوف زدہ کر دیا تھا۔ ہم لوگوں نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری۔ ہم اپنی سرکار کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ہمیں کانفرنس کے انعقاد میں بھرپور تعاون دیا۔ میں ہندوستان، پاکستان، جرمنی، جاپان اور ترکی کی مختلف یونیورسٹیز سے آئے مندوبین کا خیر مقدم کرتی ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ ہمارے کئی اسکالرس حالات خراب ہونے کے سبب نہیں آ پائے۔

اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ترکی جیسے ملک میں اردو ادب کانفرنس کا انعقاد اردو کی بین الاقوامیت کا ثبوت ہے۔ یہ کانفرنس بین الاقوامی سطح پر اردو کی مقبولیت اور تشہیر و تبلیغ کے نئے در وا کرے گی۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم نے مزید کہا کہ کسی ادیب کو اس کی وسیع النظری بقائے دوام عطا کرتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی اپنی انسان دوستی اور وسیع النظری کی بنا پر انتقال کے بعد بھی زندہ ہیں۔ بڑا ادیب کسی بھی تحریک سے بڑا ہوتا ہے۔

انھوں نے منتظمین کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ آج جبکہ ہندو پاک میں اردو کے زوال پذیر ہونے کا رونا رویا جا رہا ہے ترکی میں انقرہ یونیورسٹی کے ذریعے منعقدہ یہ کانفرنس ہم اردو والوں کے لیے ایک سبق ہے۔

افتتاحی اجلاس میں احمد ندیم قاسمی پر مبنی ایک دستاویزی فلم 'ندیم کہانی' دکھائی گئی جس میں احمد ندیم قاسمی کے بچپن، جوانی، تعلیم، ملازمت اور ادبی تخلیقات پر مفصل روشنی ڈالی گئی۔ احمد ندیم قاسمی کے تعلق سے معروف ادبا و شعرا اشفاق احمد، علی سردار جعفری، مالک رام، شفیق احمد، شرہت بخاری وغیرہ کے تاثرات بھی دکھائے گئے۔ اس موقع پر پاکستانی سفیر محترم سہیل محمود کا ویڈیو کانفرنسنگ سے خطاب ہوا اور ترکی کا قومی ترانہ بھی ویڈیو کے ذریعے پیش کیا گیا۔

کانفرنس کا پہلا باضابطہ اجلاس معروف ناقد پروفیسر انوار احمد کی صدارت میں شروع ہوا۔ اس سیشن میں جاپان کی اوساکا یونیورسٹی سے پروفیسر مرغوب حسین طاہر نے 'احمد ندیم قاسمی کی غزل' کا بھرپور جائزہ لیا۔ انھوں نے کہا کہ قاسمی کی غزل دل کی آواز ہے جس میں تصوف بھی ہے اور تغزل بھی۔ جو ہمیں نئے جہان عطا کرتی ہے۔

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری صدر شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ انڈیا نے 'احمد ندیم قاسمی کے افسانوی ابعاد' پر مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ احمد ندیم قاسمی نے اپنے افسانوں میں انسان دوستی، جاگیردارانہ ظلم و جبر، مفلوک الحال کسان اور مزدور، مظلوم عورت جیسے موضوعات پر کامیاب افسانے تحریر کیے۔ احمد ندیم قاسمی کے یہاں موضوعات کا تنوع ملتا ہے ڈاکٹر عقیلہ بشیر (پاکستان) نے 'احمد ندیم کے افسانے تانیثی تناظر میں' پیش کرتے ہوئے کہا کہ قاسمی کے افسانے خواتین کے مسائل کا احاطہ کرتے ہیں اور ان کے متعدد خواتین کردار سماج میں اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں۔ پروفیسر قاضی عبدالرحمٰن عابد (ملتان) نے 'احمد ندیم کے خاکے: متوازی ادبی تاریخ' پیش کرتے ہوئے ادبی تاریخ نویسی پر بحث کی خصوصاً بیسویں صدی کی ادبی تاریخ نویسی کے مسائل کا احاطہ کیا۔ انھوں نے جمیل جالبی، انور سدید، وہاب اشرفی وغیرہ کی ادبی تاریخ پر کتب کے حوالے سے بھی گفتگو کی۔ پروفیسر انوار احمد نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے احمد ندیم قاسمی کی شخصیت کے متعدد گوشوں پر روشنی ڈالی۔ خصوصی طور پر انھوں نے قاسمی اور منٹو کے گہرے دوستانہ روابط کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ منٹو نے کئی بار قاسمی کو فلموں کے لیے ممبئی بلوایا مگر قاسمی منع کرتے رہے۔ دراصل وہ اس مزاج کے تھے ہی نہیں۔

دوسرا اجلاس محترمہ پروفیسر روبینہ ترین (ملتان یونیورسٹی) کی صدارت میں ہوا۔ اس اجلاس میں معروف شاعر و ناقد اصغر ندیم سید نے 'احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کے نچلے طبقے کے کردار'، شاہد اقبال کامران نے 'احمد ندیم قاسمی: دل دانش اور دنیا کے درمیان'، جاپان کے پروفیسر سویاما نے یاسر نے 'جدید اردو ادب کے فروغ میں احمد ندیم قاسمی کی خدمات' اور راشدہ قاضی نے احمد ندیم قاسمی کی غزل و نظم پڑھ کر سنائی۔ اس موقعے پر اپنے صدارتی خطاب میں پروفیسر روبینہ ترین نے ترکی میں اردو کانفرنس کے انعقاد کو اردو کے فروغ میں سنگ میل قرار دیا۔

دوسرے دن (14 اکتوبر) کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر عقیلہ بشیر نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر یعقوب یاور (صدر شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی) نے 'سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری' پر مقالہ پیش کرتے ہوئے فرمایا '' منٹو اپنے عہد کا ہی نہیں، آج تک کا بڑا افسانہ نگار ہے۔ اس کے افسانے تنوع کی اعلیٰ مثال ہیں۔ اس کے افسانوں کو عالمی سطح کے بڑے افسانہ نگاروں کے مقابل رکھا جا سکتا ہے۔'' پروفیسر ارتضیٰ کریم نے 'احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں انسان دوستی' کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا '' قاسمی کے افسانوں میں انسانی ذات کا افسانہ پورے شد و مد کے ساتھ ملتا ہے۔ ان کے نسوانی کردار پریم چند کے نسوانی کرداروں سے یکسر مختلف ہیں اور سادگی کے ساتھ باغیانہ تیور بھی رکھتے ہیں۔'' محترم نیر حیات قاسمی (احمد ندیم قاسمی کے نواسے) نے 'احمد ندیم قاسمی کے اداریوں کی انفرادیت و اہمیت' میں کہا کہ قاسمی کے اداریے اپنے عہد کی ادبی تاریخ بھی ہیں۔ ڈاکٹر عقیلہ بشیر نے صدارتی

تقریر میں اس اجلاس کو بے حد کامیاب بتایا اور تینوں مقالوں کو بلیغ اور جامع بتایا۔

دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کی۔ اس اجلاس میں فرخ سہیل گوئندی نے 'احمد ندیم قاسمی کا اردو ادب کے ذریعے سماج کی تعمیر میں کردار' مقالہ پیش کرتے ہوئے ان کے افسانوں اور شاعری کے ذریعے سماج کی مثبت تعمیر پر مفصل بحث کی۔ انقرہ یونیورسٹی کے ریسرچ اسسٹنٹ کینن اردمیر اور طلعت الطاف نے بھی اپنے مقالے پیش کیے۔ صدارتی خطبے میں پروفیسر ارتضیٰ کریم نے احمد ندیم قاسمی کے تخلیق کردہ ادب کی اہمیت و معنویت پر اظہار خیال کیا۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ ہمیں اقبالیات اور غالبیات کی طرح احمد ندیم قاسمی کے تخلیق کردہ ادب کے لیے قاسمیات یا ندیمیانہ ادبی رویے استعمال کرنا چاہیے۔ ان کے مشورے کو سامعین نے کافی سراہا۔

تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر یعقوب یاور نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر روبینہ ترین نے 'اردو کی رومانی تحریک کے لیے ترک سرچشمۂ فیض'، دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر انل کمار رائے نے 'عظیم اردو شاعر میر اور اس کی شاعری'، ڈاکٹر رجب درگن نے 'احمد ندیم قاسمی کی شاعری میں حب الوطنی' پر مقالات پیش کیے۔

دوسرے دن کے چوتھے اجلاس کی صدارت محترمہ راشدہ قاضی نے کی۔ اس اجلاس میں ترکی میں مقیم ڈاکٹر سائیں ناتھ نے 'اردو میں خواتین پر تحریر کردہ پہلا ناول مراۃ العروس'، جرمنی سے ڈاکٹر سرور غزالی نے 'خواتین کی اردو ادب میں دین'، ڈاکٹر حمیرا اشفاق نے 'احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں دیہی خواتین کے مسائل' پیش کیا۔ راشدہ قاضی نے انقرہ یونیورسٹی کے اس عالمی کانفرنس کو بے حد کامیاب بتایا۔

تیسرے دن (15 اکتوبر) کے پہلے اجلاس کی صدارت دہلی یونیورسٹی کے شعبہ ہندی کے پروفیسر انل کمار رائے نے کی اور دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر مشتاق احمد قادری نے 'ریاست جموں کشمیر میں ترجمے کی روایت' پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں ترجمے کی روایت کو ریاست جموں کشمیر کے دارالترجمہ نے خاصی تقویت عطا کی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ریاست میں ترجمے کے کام کو دوام عطا کیا۔ ان کے علمی کارناموں کے سبب انہیں سرسید ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ مولانا آزاد یونیورسٹی، حیدرآباد کے ڈاکٹر ابوالکلام نے 'ترجمے کے نئے اصول و ضوابط : ایک جائزہ' پیش کیا۔ جس میں انھوں نے ترجمہ نگاروں کے تعلق سے مغربی دانشوروں کی آرا کا جائزہ لیا۔ مدورائی یونیورسٹی، چنئی کے ڈاکٹر کھنڈوے چندو نے 'اردو شاعری کا ہندی پر اثر، غزل کے خصوصی حوالے سے' میں امیر خسرو سے بیسویں صدی تک کی اردو غزل کا مختصر جائزہ پیش کرتے ہوئے ہندی غزل پر اس کے اثرات پر گفتگو کی۔ پروفیسر انل کمار رائے نے صدارتی خطبے میں کہا ''یہ حسن اتفاق ہے کہ یہ پورا اجلاس ہندوستانی ہوگیا ہے۔ اس اجلاس میں عمدہ پرچے پڑھے گئے۔''

تیسرے دن کے دوسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر رجب درگن نے کی اور ڈاکٹر فرحت جبیں ورک نے 'کرنل مسعود اختر شیخ کے تراجم کا ترک پاک رشتوں پر اثر' میں کرنل مسعود کے ذریعہ ترکی کے 32 ادیبوں کی کہانیوں کے ترجمے کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ حیدرآباد سے تعلق رکھنے والی محترمہ پروفیسر انوپما (شعبہ ہندی، انقرہ یونیورسٹی) نے ترکی اور ہندوستانی زبانوں کا تعلق کے موضوع پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو اور ہندی میں بے شمار الفاظ ترکی کے پائے جاتے ہیں۔ شلوار، چہرہ، کتاب، قلم جیسے بہت سے لفظ ہیں جو ترکی اور ہندوستان میں بولے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر رجب نے دونوں مقالات کو بہتر قرار دیا۔

ترکی کے معروف مقام سیاحت انتالیہ میں انقرہ یونیورسٹی کی جانب سے منعقد پہلی بین الاقوامی اردو کانفرنس کا شاندار طریقے سے اختتام ہوا۔

اختتامی اجلاس میں اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر ارتضیٰ کریم (ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی) نے کہا ''یہ پہلی بین الاقوامی کانفرنس 'مطالعہ ندیمیات' کے نئے در وا کرے گی۔ انقرہ یونیورسٹی کی یہ کوشش ہندو پاک میں بھی اپنے اثرات قائم کرے گی۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اس موقعے پر اعلان کیا کہ احمد ندیم قاسمی پر پڑھے گئے مقالات کو قومی کونسل احمد ندیم قاسمی نمبر کی شکل میں اپنے سہ ماہی مجلہ فکر و تحقیق میں شائع کرے گی۔

اختتامی اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے محترمہ ناہید قاسمی نے کہا کہ مجھے بے انتہا خوشی کا احساس ہو رہا ہے کہ میں اپنے والد کے صد سالہ یوم پیدائش پر منعقدہ پہلی عالمی کانفرنس میں بہ نفس نفیس موجود رہی۔ کانفرنس میں احمد ندیم قاسمی کی تفہیم کے نئے نئے پہلو سامنے آئے ہیں۔

کانفرنس کی روح رواں انقرہ یونیورسٹی کی صدر شعبہ اردو محترمہ پروفیسر آسمان بیلن آزگن نے بے حد جذباتی لہجے میں شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ معروف نقاد پروفیسر انوار احمد نے اس موقعے پر کہا کہ ہم سب انقرہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے شکر گزار ہیں جس کے سبب ایک اتنا بڑا ادبی جشن منعقد ہو پایا۔ محترم اصغر ندیم سید، پروفیسر انل کمار رائے اور پروفیسر شاہد اقبال کامران نے بھی اس موقع پر اظہار خیال کیا۔

کانفرنس کے دوران شاندار Dance and Songs، احمد ندیم قاسمی کا 100 واں یوم پیدائش (بڑا سا کیک کاٹا گیا، پاکستانی قوالیاں اور ہندوستانی گانے سنوائے گئے)، سمندری ساحل پر شب میں مخصوص پارٹی، وغیرہ کا بھی انعقاد ہوا۔ رقص و موسیقی کے پروگراموں میں صدر شعبۂ اردو، دیگر اساتذہ اور انقرہ یونیورسٹی کے طلبہ اور طالبات نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور مست ہو کر ترکی رقص کیا۔

کانفرنس کا اختتام 15 اکتوبر کو لنچ سے پہلے ہو گیا تھا۔ لنچ کے بعد آس پاس کے سیاحتی مقامات کی سیر کرائی گئی۔ 16 اکتوبر مولانا رومی کے آستانے پر حاضری دیتا ہوا کچھ مخصوص لوگوں پر مشتمل یہ ادبی کارواں، شام میں انقرہ یونیورسٹی پہنچا۔ آئندہ کے منصوبوں پر غور و فکر، لیکچر اور سیاحت کے بعد سبھی اپنے اپنے ممالک کو واپس ہوئے۔ یہ کانفرنس انقرہ یونیورسٹی، ترکی کی مہمان نوازی کے لیے بھی یاد رہے گی۔

رپورٹ: ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، صدر شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ 20 اکتوبر 2016

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبرنامہ

قومی اردو کونسل میں تاریخ ادب اردو، اردو انسائیکلوپیڈیا اور مونوگراف پینل کی میٹنگ

نئی دہلی: تاریخ ادب اردو، اردو انسائیکلوپیڈیا اور مونوگراف جیسے موضوعات کو ایک طے شدہ مدت میں مکمل کر لینا کونسل کی فعالیت کو پیش کرتا ہے، گرچہ پروجیکٹ میرے آنے سے قبل کے ہیں، تاہم اس میں ہمارے پینل کے ممبران اور کونسل کے ارکان کی تگ و دو شامل ہے جس سے ہمیں اپنے اہداف کو پانے میں کامیابی ملی ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر محمد انصار اللہ کی تاریخ ادب اردو جلد (14-9) شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں وہیں 20 مونوگراف اردو قارئین کے لیے کونسل میں دستیاب ہیں اس کے علاوہ 10 ایسے مونوگراف مختلف مراحل میں ہیں جسے جلد از جلد حتمی صورت دے دی جائے گی۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے صدر دفتر میں منعقد تاریخ ادب اردو، اردو انسائیکلوپیڈیا اور مونوگراف پینل کی میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ کونسل کی مطبوعہ جامع اردو انسائیکلوپیڈیا کی 1-6 جلدیں اردو وکی پیڈیا پر اپلوڈ کر دی گئی ہیں جب کہ 16-7 کی کمپوزنگ جاری ہے اور ساتھ ہی اردو انسائیکلوپیڈیا بھی (جلد 3-1) اردو وکی پیڈیا پر اپلوڈ کر دی گئی ہیں۔ اور یہ سارے اقدام معروف نقاد پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کی رہنمائی میں ممکن ہو پائے ہیں۔ اس کے لیے تمام ممبران اور پینل کے سربراہ کا شکر گزار ہوں۔ اس پینل کی صدارت پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے کی۔ انھوں نے سب سے پہلے تاریخ اردو ادب کا تفصیلی جائزہ لیا اور اس اہداف کو مقررہ وقت پر حاصل کیے جانے پر پروفیسر ارتضیٰ کریم کو مبارک باد دی۔ واضح رہے کہ اس سے قبل میٹنگ میں اردو ادب کی صوبائی تاریخ کا مرتب کرنا بھی شامل تھا۔ اس تعلق سے اب تک 35 پروپوزل دستیاب ہوئے ہیں تاہم پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی اور تمام ممبران نے اسے یہ کہتے ہوئے التوا میں رکھنے کی بات کہی ہے کہ سب سے پہلے علاقائی ادب کی تشریح اور اس کی گائڈلائن مرتب کر لی جائے جس کے لیے تین رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی ہے۔ کمیٹی کی رپورٹ کی روشنی میں ان تمام پروپوزل کا جائزہ لیا جائے گا۔ اس موقع پر انھوں نے تمام ممبران کی حمایت سے مونوگراف کی تین نئی تجاویز کو منظوری دی۔ اسمٰعیل میرٹھی، ابن صفی اور کلیم عاجز۔ اس موقع پر پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے بھی کئی اہم تجاویز پینل کے سامنے رکھیں جن پر غور و خوض کیا گیا۔

اردو انسائیکلوپیڈیا اور مونوگراف پینل کی میٹنگ

اس میٹنگ میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر عبید الرحمٰن ہاشمی، پروفیسر شہباز نبی، ڈاکٹر قاسم فریدی، جناب ڈاکٹر حبیب نثار، محترمہ منوری بیگم، ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک)، جناب فیروز عالم (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر)، ڈاکٹر شاہد اختر نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 30 اکتوبر 2016

قومی یکجہتی کو فروغ دینے والی کتابوں کی اشاعت وقت کی اہم ضرورت

نئی دھلی: یہ پینل اس معنی میں منفرد اور اہمیت کا حامل ہے کہ اس کے تحت ہندوستانی مذاہب اور ثقافت کے تعلق سے کونسل ایسی کتابوں کے تراجم کو منظر عام پر لانا چاہتی ہے جس سے قومی یکجہتی، تہذیبی ہم آہنگی، بھائی چارگی اور رواداری کی فضا نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں قائم ہو سکے۔ موجودہ حالات میں ایسی کتابوں کی اہمیت وافادیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ اس میٹنگ میں کئی اہم فیصلے لیے گئے جس

مذہب اور ثقافت پینل کی میٹنگ

میں انگریزی کی دو اہم کتابوں کے تراجم کے لیے تجویز رکھی گئی۔ پہلی کتاب Winning the peace-Aquest، دوسری کتاب: Healing Memories Civilization in Dialogue ان دونوں کتابوں کی تدوین پروفیسر زینت شوکت علی نے کی ہے۔ یہ باتیں قومی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ مذہب اور ثقافت پینل کی میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ پہلی کتاب تین درجن مقالات پر مشتمل ہے جن میں زیادہ تر گفتگو ماحولیاتی تناسب، انسانی بہبود اور فروغ وسائل پر مبنی ہے۔ یہ کتاب وقت کی ضرورت کے اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے، جب کہ دوسری کتاب میں ایسے مقالات ہیں جن کا منظر عام پر آنا قومی یکجہتی کے لیے مفید ہے۔ اس پینل کی صدارت پروفیسر سید عین الحسن نے کی۔ انھوں نے کہا کہ یہ خاص نوع کا پینل ہے جس میں مذہب اور ثقافت کو ساتھ لے کر چلنے کی بڑی گنجائش ہے۔ اس سمت کونسل جو خدمات انجام دے رہی ہے اس کے دائرہ کار کو اور آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ واضح ہو کہ اس دفعہ اچھوتے اور نادر موضوعات سامنے آئے ہیں، جس کے تراجم سے اردو قارئین کو فائدہ ہوگا۔

اس موقع پر معروف سماجی کارکن سوامی اگنی ویش نے کئی اہم تجاویز پینل کے سامنے رکھیں۔ انھوں نے دیانند سرسوتی کی دو اہم کتاب Light of Truth اور دوسری Introduction to the translation of the Vedas کو اردو میں شائع کرنے کو وقت کی اہم ضرورت بتلایا۔ انھوں نے اپنی کتاب Applied spirituality کو بھی اردو میں ترجمہ کرنے کی بات کہی جسے تمام ممبران نے منظوری دی۔ سوامی جی نے مزید کہا کہ آگے آنے والا زمانہ E-Book کا ہے، لہٰذا کونسل جو بھی کتابیں شائع کرتی ہے اسے E-Book کی صورت میں محفوظ رکھا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جا سکے۔

اس موقع پر پروفیسر غلام یحییٰ انجم کی دو اہم کتاب قرآن کریم کے ہندوستانی تراجم وتفاسیر اور عرفان تصوف کو حتمی شکل دے دی گئی ہے، جو بہت جلد منظر عام پر آئے گی۔ ثقافت کے تعلق سے اہم مسودہ 'اورنگ آباد کی مذہبی وثقافتی تاریخ' کو بھی طے مدت میں منظر عام پر آنے کی بات کہی گئی ہے۔ میٹنگ میں پروفیسر سید عین الحسن، پروفیسر ناشر نقوی، پروفیسر زینت شوکت علی، معروف سماجی کارکن سوامی اگنی ویش، ڈاکٹر فہیم احمد صدیقی، پروفیسر غلام یحییٰ انجم، محترمہ فریدہ خانم کے علاوہ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر جناب فیروز عالم، محترمہ آبگینہ عارف اور ڈاکٹر شاہد اختر نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 25 اکتوبر 2016

اقلیتوں کو روزگار سے جوڑنے کے لیے کمپیوٹر مراکز قائم کیے گئے ہیں: پروفیسر ارتضیٰ کریم

گوھاٹی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ملک کی 28 ریاستوں کے 221 ضلعوں میں 455 کمپیوٹر اپلی کیشنز بزنس اکاؤنٹنگ ملٹی لنگول ڈی ٹی پی کے مراکز چلا رہی ہے۔ یہ مراکز خصوصاً اقلیتوں کو روزگار سے جوڑنے کے لیے قائم کیے گئے ہیں۔ جدید ٹکنالوجی کے اس دور میں ان مراکز کے اساتذہ کو قومی اردو کونسل وقتاً فوقتاً تربیت مہیا کراتی رہتی ہے تاکہ ان مراکز کے اساتذہ بھی نئی ٹکنالوجی کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر آگے بڑھ سکیں۔ یہ باتیں قومی کونسل کے ڈائریکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے تربیتی پروگرام کے افتتاحی اجلاس کے موقعے پر کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ کونسل جلد ہی ان مراکز میں تعلیم حاصل کر رہے طلبا وطالبات کے لیے وظیفہ شروع کرنے جا رہی ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ کونسل صرف سینٹر کھول سکتی ہے لیکن اس کو کامیابی کے ساتھ چلانے کی ذمے داری

گوہاٹی میں چار روزہ تربیتی پروگرام

آپ لوگوں کے کاندھوں پر ہے۔ واضح رہے کہ یہ تربیتی پروگرام 4 تا 7 اکتوبر 2016 ہوٹل ڈائنسٹی گوہاٹی میں منعقد کیا گیا جس میں بہار، شمال مشرق، مغربی بنگال اور کشن گنج، کٹیہار، پورنیہ، ارریہ اور سوپول فی الوقت چل رہے 61 سینٹرز کے اساتذہ کو مدعو کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے پونے، سری نگر، گوہاٹی، لکھنؤ اور رانچی میں ایسے تربیتی پروگرام منعقد کیے جا چکے ہیں۔ اس موقعے پر این آئی ای ایل آئی ٹی چنڈی گڑھ کے جوائنٹ ڈائریکٹر جناب راجیش کمار کپیلا نے تمام اساتذہ کو اپنی نیک خواہشات سے نوازا۔

افتتاحی پروگرام کے بعد تربیتی پروگرام کا آغاز ہوا جس میں این آئی ای ایل ای ٹی کی طرف سے جناب سرون سنگھ، جناب چمن چاندھلا اور جناب راکیش بھارتی نے اپنی مہارت اور تجربے کو بروئے کار لا کر اساتذہ کو تربیت فراہم کی۔

آخر میں قومی اردو کونسل کے ریسرچ آفیسر اور تربیتی پروگرام کے کنوینر جناب انتخاب احمد نے تمام اساتذہ کا شکریہ ادا کیا اور اس تربیتی پروگرام کو کامیاب بنانے میں قومی کونسل کے ارکان محمد احمد خان، محمد قاسم، انیس احمد، کپل اور جتیندر کمار نے بھرپور تعاون کیا۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 8 اکتوبر 2016

عام اردو قارئین تک کتابوں کی رسائی ضروری

اردو ادب پینل کی میٹنگ

نئی دہلی: ایسی نادر و نایاب پرانی کتابیں جو فی الوقت کچھ خاص لائبریریوں اور ذاتی کتب خانوں کی زینت بنی ہوئی ہیں وہاں تک عام اردو قارئین کی رسائی ممکن نہیں ہے ایسی کتابوں کو کونسل اپنی اشاعتی اسکیم میں ترجیحی طور پر شامل کرنا چاہتی ہے تاکہ محبانِ اردو اس سے استفادہ کرسکیں۔ یہ باتیں کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ اردو ادب پینل کی میٹنگ میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ کونسل کا ایک نکاتی پروگرام اردو کا فروغ ہے اور اس سمت میں تیز رفتاری سے کام ہو رہا ہے۔ ہمیں نہ صرف تمام پینل کے ممبران سے مدد مل رہی ہے بلکہ موجودہ حکومت ہند کی خاص عنایت بھی حاصل ہے۔

اس پینل کی صدارت پروفیسر اعجاز علی ارشد (شیخ الجامعہ مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی) نے کی۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے پاس جو مسودے اور پروپوزل آتے ہیں اسے حتمی صورت دینے میں تمام ممبران پوری شفافیت کے ساتھ فیصلہ لیتے ہیں تاکہ کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہونے پائے۔ اس موقعے پر بہار اردو اکادمی کے سکریٹری جناب مشتاق احمد نوری نے کہا کہ یہاں علاقائیت اور عصبیت سے بالاتر ہوکر فیصلے لیے جاتے ہیں تاکہ ملک کے کسی خطے کے ساتھ سوتیلے پن کا اظہار نہ ہونے پائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر پینل میں جو ممبران ہوتے ہیں وہ ملک کے طول و عرض سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس موقعے پر پروفیسر قمر جہاں، پروفیسر سلیمہ بی کولور اور محترمہ مہ جبیں غزال نے بھی اپنی قیمتی آرا سے نوازا۔

میٹنگ میں پروفیسر اعجاز علی ارشد، پروفیسر قمر جہاں، ڈاکٹر نریش، پروفیسر رئیس انور، جناب مشتاق احمد نوری، محترمہ سلیمہ بی کولور، محترمہ مہ جبیں غزال کے علاوہ قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، محترمہ آبگینہ عارف اور ڈاکٹر شاہد اختر نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 3 نومبر 2016

ادبی شخصیات کے انتقال پر قومی اردو کونسل میں تعزیتی نشستیں

عبدالرؤف خان

نئی دہلی: مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈمی کے کارگزار صدر، اردو کے سچے عاشق اور شیدائی عبدالرؤف خان کے انتقال پر اظہار تعزیت کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ عبدالرؤف خان نے اردو کے فروغ اور حقوق کے لیے جو جدو جہد کی ہے اسے اردو دنیا کبھی فراموش نہیں کرے گی وہ ہمیشہ اردو کے فروغ کے لیے سرگرم اور کوشاں رہتے تھے۔ انھیں اردو سے اتنا عشق تھا کہ انھوں نے بھساول میں اپنی ذاتی زمین پر اردو اسکول اور جونیئر کالج قائم کیے۔ اردو کی فلاح و بہبود کے لیے جو کچھ بھی ہوسکتا تھا وہ انھوں نے کر کے دکھایا، پروفیسر ارتضیٰ کریم نے مزید کہا کہ ان کے دور صدارت میں مہاراشٹر اردو اکادمی بہت ہی فعال اور سرگرم رہی۔ مختلف ادبی اور ثقافتی تقریبات کے ذریعے انھوں نے اردو اکیڈمی میں ایک نئی جان ڈال دی تھی۔ اسی لیے انھیں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈمی کے سب سے فعال کارگزار صدر کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 30 اکتوبر 2016

ظہیر غازی پوری

نئی دہلی: کہنہ مشق ادیب اور معروف شاعر ظہیر غازی پوری کے انتقال پر اپنے گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ظہیر غازی پوری معاصر شعری منظرنامے کا ایک معتبر نام تھے۔ ان کی وفات سے اردو زبان و ادب کا بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔ وہ شاداب ذہن و فکر کے حامل تھے۔ تخلیقی آگہی کے ساتھ ان کے اندر غیر معمولی تنقیدی بصیرت بھی تھی۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے ان کے تنقیدی کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ انھوں نے تخلیقی اور تنقیدی میدان میں جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ تثلیث فن، الفاظ کا سفر، آشوب نوا، سبز موسم کی صدا، لفظوں کا پرند، دعوت صد نشتر وغیرہ ان کے شعری مجموعے ہیں جن سے ان کی تخلیقی قوت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ 'اردو دوہے' پر ظہیر غازی پوری کا جو تحقیقی اور تنقیدی کام ہے وہ اس صنف سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے مطالعۂ اقبال کے بعض اہم پہلو کے ذریعے بھی اقبالیات شناسی میں اضافہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ جھارکھنڈ اور بہار کے اہل قلم پر ان کی کتاب قابل ستائش ہے۔ ان تمام تنقیدی کتابوں سے ان کی تنقیدی بصیرت، ژرف نگاہی، استدلالی انداز کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

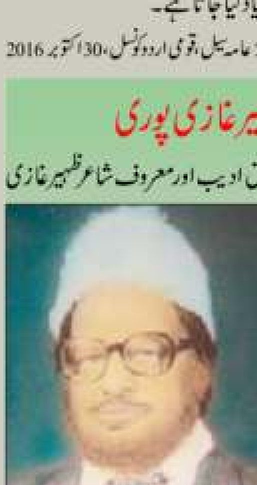

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 4 نومبر 2016

کشن گنج میں کتاب میلہ

ارریہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند نے سیمانچل میں قومی کتاب میلہ لگانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اگلے برس فروری میں کشن گنج میں پہلی بار کتاب میلہ لگنے جارہا ہے، اس کی تیاری اور سروے کے لیے سیمانچل کے

کشن گنج، ارریہ، پورنیہ اور کٹیہار کے دورے پر آگئے این سی پی یو ایل کے ریسرچ افسر شاہنواز خرم نے ماہرین تعلیم کی ایک میٹنگ میں کہا کہ نئی نسل نئی تکنالوجی کی چکاچوند میں کتابوں سے دور ہوتی جارہی ہے، جبکہ کتاب انسان کی ساتھی اور رہنما ہوتی ہے، بسااوقات ایک کتاب انسان کی زندگی بدل دیتی ہے۔ اس اہمیت کو سامنے رکھتے ہوئے قومی کونسل نے کتاب میلہ لگانے کا فیصلہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو کتاب سے قریب کرنے کے لیے قومی کونسل ہر سال ملک کے بڑے شہروں میں کتاب میلہ لگاتی ہے۔ ایک ہفتہ تک چلنے والے اس میلہ کے سلسلے میں انتظامیہ نے فیصلہ کیا ہے کہ اس دفعہ سیمانچل کے کشن گنج میں یہ کتاب میلہ لگے۔ اس موقع پر ڈاکٹر توقیر عالم راہی، ریسرچ اسسٹنٹ این سی پی یو ایل نے کہا کہ سیمانچل میں کشمیر کے بعد سب سے زیادہ مسلمانوں کی بڑی آبادی ہے، یہاں اردو پڑھنے لکھنے اور بولنے والے سب سے زیادہ ہیں۔ اردو کے فروغ کو مہم کے طور پر انجام دینے کے لیے یہ کتاب میلہ سنگ میل ثابت ہوگا۔ سروے کے دوران این سی پی یو ایل کا وفد مقامی ایم پی محمد تسلیم الدین سے بھی ملا، انھوں نے اس کے انعقاد کے سلسلے میں ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ یہ وفد دیگر سیاسی وسماجی رہنماؤں سے بھی ملا اور کتاب میلے کی تیاری کے سلسلے میں تبادلۂ خیال کیا۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 نومبر 2016

اردو زبان کے فروغ میں این سی پی یو ایل کا نمایاں کردار

نئی دھلی: آزادی وطن کے بعد اردو زبان کو جس نازک صورت حال سے گزرنا پڑا اس پر اہل اردو کی جانب سے حکومتوں کو تو خوب مورد الزام ٹھہرایا گیا مگر خود اردو والوں نے اس کی بقا کے لیے کوئی خاص جدوجہد نہیں کی یہ الفاظ کل ہند ملی ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کے جنرل سکریٹری مختار صدیقی نے پریس کو جاری اپنے ایک بیان میں کہے، انھوں نے کہا کہ یوں تو اردو زبان کے فروغ کے لیے ملک کی مختلف ریاستوں میں اردو اکادمیاں قائم ہیں اور انھوں نے اردو زبان کے فروغ میں کتنا کام کیا ہے یہ تمام ذی ہوش محبان اردو بخوبی جانتے ہیں مگر اردو کے تعلق سے بے عملی کے اس ماحول میں ایک خوش گوار حقیقت یہ ہے کہ مرکزی وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے تحت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان پورے ملک میں وہ واحد سرگرم ادارہ ہے جس کی فعالیت کو بہتر بتایا جاسکتا ہے۔ فروغ اردو کے لیے اس کی تمام اسکیمیں بے حد معاون ثابت ہورہی ہیں۔ کونسل کا کمپیوٹر ڈپلومہ کورس اردو عربی فارسی کے ڈپلومہ کورس اردو زبان کا رشتہ روزی روٹی سے جوڑنے والے ہیں جن کی افادیت کو محسوس کرتے ہوئے جنوبی ریاستوں کے لوگوں نے اس کا بھرپور فائدہ حاصل کیا ہے اور تاحال یہ سلسلہ وہاں جاری ہے مگر شمالی ہندوستان کے لوگوں نے بہت کم اس طرف توجہ دی ہے جو حد درجہ افسوس ناک ہے۔ مختار صدیقی نے شمالی ہندوستان کے محبان اردو سے درخواست کی کہ بڑی تعداد میں خاص طور پر اتر پردیش میں اپنے تعلیمی اداروں میں، مدارس میں اور انفرادی طور پر کونسل کی تمام اسکیموں کے مراکز قائم کریں تاکہ صوبے میں ہماری نئی نسل جو مکمل طور پر اردو زبان سے نابلد نظر آتی ہے وہ اپنی اس تہذیبی وراثت اور اپنے تمدن اور ثقافت سے محروم نہ ہوجائے۔ مختار صدیقی نے مزید کہا کہ قومی کونسل کے موجودہ ڈائرکٹر ڈاکٹر ارتضی کریم کے مطابق کونسل بہت جلد اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے والے مزید منصوبوں پر عمل کرنے کا لائحہ عمل تیار کررہی ہے۔ روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 24 اکتوبر 2016

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

بین الاقوامی ریسرچ اسکالر سمینار

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان و غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام منعقدہ سہ روزہ بین الاقوامی

ریسرچ اسکالر سمینار کے افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبے میں ممتاز ناقد و محقق اور ہندوستان میں جدیدیت کے بانی پروفیسر شمس الرحمان فاروقی نے غالب آڈیٹوریم میں کہا کہ آج کی تحقیق یا تحقیق کے نام پر جو کچھ ہورہا ہے اس سے میں مطمئن نہیں ہوں۔ تحقیق کرتے ہوئے یہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اپنے موضوع کے اعتبار سے نئی تعبیرات کا ہم انکشاف کریں۔ ہماری ادبی تاریخ میں بہت سے محققین ہیں جنھوں نے ادبی نتائج کو اپنے معتقدات کے مطابق ہونے کی وجہ سے قبول کرلیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ جو نتائج اور فیصلے پہلے سے موجود ہیں، ان پر آنکھ بند کرکے یقین نہیں کرنا چاہیے۔ کوئی روایت چاہے جتنی مصدق ہو مگر اپنی تحقیق کے بغیر اسے قبول نہیں کرنا چاہیے۔ تحقیق کی موجودہ صورت حال دروں بینی اور خود احتسابی کی دعوت دیتی ہے، جس کا پاس و لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارتی تقریر میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے کہا کہ ریسرچ اسکالرز کی شرح نمو ہندوستانی آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ ہے۔ فارسی زبان و ادب کے ماہر پروفیسر سید طلحہ رضوی برق چشتی داناپوری نے کہا کہ ریسرچ اسکالرز کو بھی معلوم نہیں ہوتا کہ تھیسس میں لکھا ہوا کیا ہے۔ ریسرچ اسکالرز کو چاہیے کہ جو چیزیں آنکھوں سے پوشیدہ ہیں انھیں سامنے لائیں۔ اچھی اردو کے لیے فارسی کا جاننا ضروری ہے۔ اس سہ روزہ بین الاقوامی ریسرچ اسکالرز سمینار میں افتتاحی خطاب کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے کہا کہ یہ سمینار طلبہ وطالبات کے لیے ہی ہے۔ دوسرے

شعبوں کے لوگوں کو مدعو کرنا اچھی پیش رفت ہے۔ آج کے زمانے میں ریسرچ کرنا پہلے کی بہ نسبت زیادہ آسان ہے۔ آج آپ کے پاس گلوبل دنیا تک رسائی بہت آسان ہے۔ نیٹ نے دوریوں کو ختم کر دیا ہے۔ اس موقعے پر اپنے تعارفی کلمات میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے متحرک و فعال ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ادب و تحقیق اور تنقید عبادت کا درجہ رکھتی ہیں۔ ہمارے اساتذہ نے خود کو فنافی الادب کیا تب کہیں انھیں یہ مقام و مرتبہ حاصل ہو سکا۔ یہ راہیں تسلسل چاہتی ہیں۔ ریسرچ اسکالرز کو باندھ کر نہیں رکھنا چاہیے انھیں یہ آزادی دینی چاہیے کہ وہ جس سے چاہیں استفادہ کریں۔ انھوں نے پرجوش طریقے پر ریسرچ اسکالرز کا اس سمینار میں خیر مقدم اور استقبال کیا اور کہا کہ قومی کونسل نے ریسرچ اسکالرز کو گود لے لیا ہے۔ تاکہ وہ بہتر سے بہتر کام کر سکیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے استقبالیہ تقریر کرتے ہوئے تمام مہمانوں اور ریسرچ اسکالرز کا خیر مقدم کیا اور اعلیٰ تعلیم کی طرف کم ہوتے رجحان کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے افتتاحی اجلاس کی نظامت کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ وقت میں ریسرچ اسکالرز کی تمام سمیناروں میں سب سے زیادہ ضرورت ہے اس لیے کہ ہم نے اگر ریسرچ اسکالرز کی حوصلہ افزائی نہیں کی تو ہم اردو و فارسی زبان و ادب کے ساتھ انصاف نہیں کر سکیں گے۔

اس سہ روزہ سمینار میں پروفیسر انور پاشا، پروفیسر شریف حسین قاسمی، ڈاکٹر اطہر فاروقی، ڈاکٹر شعیب رضا خان وارثی، پروفیسر خالد محمود، پروفیسر مظہر مہدی، پروفیسر ابن کنول، پروفیسر معین الدین جینابڑے، صفدر امام قادری، پروفیسر عبدالقادر جعفری، پروفیسر عراق رضا زیدی، پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر احمد محفوظ، پروفیسر علیم اشرف، پروفیسر چندر شیکھر، پروفیسر خواجہ اکرام الدین، پروفیسر فاروق بخشی اور فاروق ارگلی نے ریسرچ اسکالروں کے مقالات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس سمینار میں ہندوستان کے تقریباً چالیس یونیورسٹیز کے ریسرچ اسکالروں نے شرکت کی اور تقریباً 60 مقالات پیش کیے گئے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 تا 3 نومبر 2016

اردو اور تعلیم سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی

صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم نے میزائل مین کو گلہائے عقیدت پیش کیے

نئی دهلی: صدر جمہوریہ پرنب مکھرجی نے راشٹرپتی بھون میں اپنے پیش روائے پی جے عبدالکلام کو ان کے یوم پیدائش پر گلہائے عقیدت پیش کیے۔ پرنب مکھرجی نے ڈاکٹر کلام کی تصویر پر پھولوں کے ہار چڑھائے اور انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔ وزیر اعظم نریندر مودی نے بھی ڈاکٹر کلام کو یاد کرتے ہوئے ٹویٹ کر کے کہا کہ ہمارے سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کو ان کے یوم پیدائش پر خراج عقیدت پیش کرتا ہوں، جو ہر ہندوستانی کے تصور میں بستے ہیں۔ راشٹرپتی بھون کا عملہ، افسران اور ڈاکٹر کلام کے اہل خانہ نے بھی مرحوم رہنما کو گلہائے عقیدت پیش کیے۔ دریں اثنا مغربی بنگال کی وزیر اعلیٰ ممتا بنرجی نے سابق صدر جمہوریہ اے پی جے عبدالکلام کے 85 ویں یوم پیدائش پر خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ہندوستان کے سابق صدر جمہوریہ (2002-2007) ابوالفاخر زین العابدین عبدالکلام 15 اکتوبر 1931 کو تمل ناڈو کے رامیشورم میں پیدا ہوئے تھے۔ میزائل مین کے نام سے مشہور عبدالکلام تمام طبقات بالخصوص بچوں میں بہت ہی زیادہ مقبول تھے۔ ممتا بنرجی نے ٹویٹ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہم کلام جی کی کمی بہت ہی زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ خیال رہے کہ بھارت رتن ڈاکٹر کلام کا 27 جولائی 2015 کو شیلانگ کے کالج میں لکچر دیتے ہوئے دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 16 اکتوبر 2016

اعزاز و اکرام

باب ڈیلن

اسٹاک هوم: باب ڈیلن کو گیتوں کی عظیم امریکی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے شعری اظہار کی تخلیق کے لیے 2016 کے نوبل ادب انعام کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ یہ اطلاع سویڈش اکادمی نے دی۔ یہ اس سال کا آخری نوبل انعام تھا۔ واضح رہے کہ ڈائنامائٹ کے موجد الفریڈ نوبل کی وصیت کے مطابق 1901 سے یہ انعام ہر سال سائنس، ادب اور امن کے شعبے میں گراں قدر خدمات کے لیے دیا جاتا رہا ہے۔ گلوکار اور نغمہ نگار باب ڈیلن کو اپنے اثر انگیز نغمات کی وجہ سے جو 1960 کی دہائی سے اب تک بے حد مقبول رہے ہیں ایک نسل کی آواز سمجھا جاتا ہے۔ ان کے بیشتر نغموں میں بغاوت، حریت اور احتجاج کی روح موجزن ہے۔ تقریباً 9 لاکھ 30 ہزار ڈالر پر مشتمل انعام دینے والی اکادمی نے اپنے بیان میں کہا کہ ڈیلن ایک 'آئکن' کا درجہ رکھتے ہیں اور ہم عصر موسیقی پر ان کا گہرا اثر ہے اور وہ اس وقت غالباً عظیم ترین شاعر ہیں۔ نوبل اکادمی کی مستقل سکریٹری سارا ڈینس نے ایک اخباری کانفرنس میں بتایا کہ ڈیلن کو نوبل انعام دینے کا فیصلہ تقریباً اتفاق رائے سے ہوا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 14 اکتوبر 2016

وفیات

غفران احمد خان

نئی دہلی: قومی اردو کونسل سے ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے وابستہ ڈاکٹر غفران احمد خان کا 24 اکتوبر کو طویل

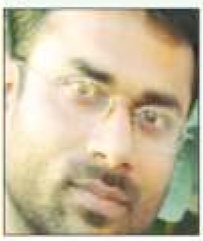

علالت کے بعد دہلی کے ایمس میں انتقال ہو گیا۔ تجہیز و تکفین کے لیے ان کے جسد خاکی کو آبائی وطن دربھنگہ بہار لے جایا گیا۔ غفران بہت ہی مخلص، دردمند اور اپنے کام کے تئیں ذمے دار تھے۔ وہ قومی اردو کونسل کی حیدرآباد شاخ میں اپنی خدمات انجام دے رہے تھے۔ انھوں نے جواہر لعل نہرو یونیورسٹی سے ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کی تھیں اور ان کا شمار اردو کے اچھے اسکالروں میں ہوتا تھا۔

غفران دربھنگہ بہار کے گاؤں اہل وارہ کے رہنے والے تھے۔ ان کی پیدائش 7 فروری 1978 میں ہوئی تھی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی۔ انھوں نے مدرسہ بورڈ سے فوقانیہ کا امتحان بھی پاس کیا تھا اور بہار سے انٹرمیڈیٹ اور گریجویشن کی تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد دہلی کا رخ کیا اور یہیں کی مشہور یونیورسٹی جواہر لعل نہرو سے اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کی۔ ان کے انتقال پر ان کے احباب اور متعلقین بہت غمزدہ ہیں۔ والدین کے علاوہ ان کے دو بھائی اور چار بہنیں بھی ہیں۔ قومی اردو کونسل ان کے اہل خانہ کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ (ادارہ)

نگہداشت بیداری ہفتہ کی تقریب کا منظر

URDU DUNIYA Monthly, December-2016, Vol.18, Issue:12
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2014-16
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/11/2016**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے زیر اہتمام
کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی، بھیونڈی کے اشتراک سے

۲۰ رواں کل ہند اردو کتاب میلہ

بھیونڈی
۱۷ تا ۲۵ دسمبر ۲۰۱۶ء

روزانہ صبح ۱۱ بجے سے رات ۹ بجے، رئیس ہائی اسکول میدان، بھیونڈی، ضلع تھانے، مہاراشٹر

''کتابیں ماضی کا اثاثہ، حال کا سرمایہ اور مستقبل کی اساس ہیں''

اس نعرے کے ساتھ نئی صدی کی شروعات یعنی ۲۰۰۰ء سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے دلّی کے لال قلعہ سے کل ہند اردو کتاب میلے کا آغاز کیا۔ ملک کے ہر بڑے شہر میں اس کا انعقاد ہوتا رہا۔ اور امسال یہ سیل رواں اپنے سفر کا بیسواں پڑاؤ مکمل کرنے جا رہا ہے۔ عروس البلاد ممبئی سے متصل صنعتی شہر، بھیونڈی میں بیسواں کل ہند اردو کتاب میلہ سن دو ہزار سولہ، دسمبر کی ۱۷ ار سے ۲۵ رتاریخوں کے درمیان منعقد کیا جا رہا ہے۔ ملک کے نامور ناشرین، ہزاروں موضاعات پر لاکھوں کتابوں کے ساتھ اس میلے میں شریک ہو رہے ہیں۔ یہ کتاب میلہ ہر عمر اور ہر شعبہ حیات سے متعلق قارئین کے ذوق کی تسکین کے لیے کتابوں کا خزانہ لے کر حاضر ہو رہا ہے۔

کتابوں کی خرید و فروخت کے ساتھ اس میلے کا اہم حصہ اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے روزانہ منعقد ہونے والے تہذیبی و ثقافتی پروگرام ہیں۔ مذاکروں، مقابلوں اور رنگارنگ ثقافتی شاموں کی تفصیلات پیش خدمت ہیں۔

20th Bhiwandi Urdu Kitab Mela 2016
(17th to 25th December)
By **National Council for Promotion of Urdu Language**
Department of Higher Education,
Ministry of Human Resource Development,
Government of INDIA.
In Association with
Kokan Muslim Education Society
Bhiwandi.

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025